# مکالماتِ ابوالکلام

# مکالمات ابوالکلام

ناشر۔ مکتبۂ احباب لاہور
طابع ۔ انشا پریس ۔ لاہور
قیمت ۳/۸/۰

# مکالماتِ ابوالکلام

ابوالکلام آزادؔ

مکتبہ احباب لاہور

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

2/5/25

# فہرست

(۱)

"مقالات ابوالکلام کے سلسلے میں الہلال کا سب سے پہلا مضمون"

چگونہ مے بمیاں آورم دریں مجلس
کہ بادہ حوصلہ سوز است و جملہ بد مستند

سنہ ۱۹۰۶ء کی موسم سرما کی آخری راتیں تھیں جب امرتسر میں میری چشم بیداری نے ایک خواب دیکھا انسان کے ارادوں اور منصوبوں کو جب تک ذہن و تخیل میں ہیں۔ عالم بیداری کا ایک خواب ہی سمجھنا چاہیے ——— کامل چھ برس اس کی تعبیر کی عشق

آمیز جستجو میں صرف ہو گئے۔ امیدوں کی خلش اور ولولوں کی شورش نے ہمیشہ مضطرب رکھا اور یاس و قنوط کا ہجوم بارہا حوصلہ و عزم پر غالب آ گیا لیکن الحمداللہ کہ ارادہ کا استحکام توفیق الٰہی کا اعتماد ہر حال میں طمانیت بخش تھا یہاں تک کہ آج اس خواب عزیز کی تعبیر عالم وجود میں پیش نظر ہے۔

اگرچہ ایک ہفتہ وار اخبار کی اشاعت اُردو پریس کی موجودہ حالت کے لحاظ سے اس قدر ارزاں اور سہل کام ہے جس کے لئے چھ ہفتہ کا انتظار بھی شاید ضرورت سے زاید فرصت ہو لیکن ابتدا ہی سے جو اعلیٰ پیمانہ ہمارے پیش نظر تھا، طبیعت نے گوارا نہیں کیا کہ مشکلات سے شکست کھا کر اُسے بھلا دیا جائے تاہم اگر پریس کی مشکلات کے علاوہ دیگر موانع پیش نہ آتے تو غالباً پچھلے سال سے اخبار جاری ہو جاتا لیکن مشیت الٰہی ہمارے مصالح کا ہم سے بہتر فیصلہ کرتی ہے اور معرفتِ الٰہی کا ایک بڑا سبق اِنسانی عزائم کی شکست ہے۔ یہ پورے چھ سال کا زمانہ جن واقعات و حوادث کے ساتھ گزرا اس کی تفصیل ایک داستان طویل ہے جس کا دُہرانا شاید بے نتیجہ نہ ہو، لیکن بے لطف تو ضرور ہے۔ اس الم کدۂ حیات میں ہر لمحہ جو گزرتا ہے نہیں معلوم کتنی زندگیوں کے آلام و مصائب کی داستانیں اس میں ختم ہوتی ہیں اور کتنی شروع ہوتی ہیں۔ کارخانۂ عالم کی محنت پسندی کا یہی قانون ہے اور انسانی شکایتوں کی اُسے پروا نہیں پھر ان لاتعداد لاکھوں زندگیوں سے صرف ایک بے اثر زندگی کی ناکامیوں کی کہانی سننے والوں کے لئے کیا دلچسپ ہو سکتی ہے؟

زندگی کے مصائب اور مشکلات کا سلسلہ ہمیشہ غیر منقطع رہا ناگہانی حوادث کے پیہم حملوں نے کبھی دم لینے کی مہلت نہ دی علائق کی زنجیریں جو پیشتر ہی کچھ کم وزنی

نہ تھیں شاید دل کی وارفتگی کو بڑھتا دیکھ کر اور زیادہ بھاری کر دی گئیں۔ جن افکار و تردّدات کا تصوّر بھی طبیعت پر شاق تھا زمانہ کے حکم سے برسوں ان میں کانٹے پڑے صحت و تندرستی جس کے بغیر حیاتِ جاوید کو بھی کوئی قبول نہ کرے وہ روزِ

اوّل ہی سے ایک لبِ مرگ اور سریع انقضا زندگی کے ساتھ دی گئی تھی — پھر ان سب سے زیادہ اُمید و انتظار کے دو متضاد عنصروں کی آمیزش تھی۔ جن میں سے ہر ایک کا تقاضہ دوسرے کا مخالف تھا۔ انسان کی ساری مصیبتیں اس کی اُمید پرستی کا نتیجہ ہیں۔ اور فی الحقیقت یاس میں کامیابی سے بڑھ کر سکون ہے۔ مشکل یہ تھی۔ کہ اُمید کی روشنی بجھنے کی جگہ دھیمی کر دی جاتی تھی اور یاس و بیم کے دامن کو ہوا دینے کی اجازت نہ تھی۔ منزلِ مقصود گو ہمیشہ دُور رہا مگر نظروں سے کبھی غائب نہ ہوئی اور قافلہ گو نظر نہیں آیا مگر صدائے جرس نے ہمیشہ اس کے وجود پر شہادت دی۔

اگرچہ وہ تمام موانع جن کا تعلق خود میری زندگی سے تھا، اب بھی بدستور قائم ہیں اور شاید مشیتِ الٰہی یہی ہے کہ آخر تک قائم رہیں لیکن الحمد اللہ کہ کام کی مشکلات ایک حد تک ختم ہو چکی ہیں اور اگر راہ کانٹوں سے خالی نہیں تو پاؤں بھی اب زخموں اور آبلوں کے عادی ہو گئے ہیں۔ فرصت و جمعیت کا انتظار کب تک اور عنقا کی جستجو میں صحرا نوردی تابکے؟ برسوں اس تلاشِ محال میں صرف کر دیئے اور ہمیشہ ناکامی کے ہاتھ کامیابی کو پیغام بھیجا ؎

اِیں رسم و راہِ تازہ ز حرمانِ عہدِ ماست
عنقا بروزگار کسے نامہ بر نہ بود

ہمارے وہ احباب جن کو اس ارادے کا علم تھا۔ مگر ہمارے حالات کا علم

نہ تھا، ان گذشتہ سالوں کے اندر اندر طرح طرح کے خیالات وظن سے طعنہ زنی رہی ہے۔ بعضوں نے اس متصل تاخیر کو طبیعت کی بے استقلالی و تلوّن مزاجی کا نتیجہ سمجھا،

بہتوں نے قوتِ ارادی کے ضعف سے اُسے منسوب کیا اور بعض نے تو فیصلہ ہی کر دیا کہ فکر و تصوّر سے زیادہ اس ارادے کی قسمت میں اور کچھ نہیں ہے ——— لیکن

گر دیر بر آیم ز گرداب میندیش
کاندر طلبِ گوہر نایاب میندیش

اس وقت بھی جب کہ یہ سطور لکھ رہا ہوں وہ عالمِ اسرار اور واقعہ تخیلاتی مستوٗب دیکھ رہا ہے۔ کہ طرح طرح کی جان فرسا پریشانیوں کا محاصرہ میرے گرد و پیش ہے۔ اور ایک لمحہ کے لئے بھی جمعیتِ خاطر میسّر نہیں لیکن جو شے شاید ملنے والی نہیں اس کے انتظار میں کب تک زندگی کو معطل رکھا جائے؟ انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ وہ خود بخود ایک بے وجہ توقع قائم کر کے پھر ناکامی کی شکایت میں عمر بسر کر دیتا ہے۔ حالانکہ یہ کیوں ضروری سمجھ لیا گیا ہے کہ زندگی کو سکون و طمانیت کے ساتھ کٹنا چاہیئے اور اس کے لئے کیا امر مانع ہے۔ کہ آلام و مصائب ہی ہمیشہ پیش نہ آئیں! تیرنے والے دریا میں رہ کر دریا کے پار چلے جاتے ہیں۔ مگر دریا سے ڈرنے والوں کو کشتی کے اندر بھی چین نصیب نہیں ہوتا۔ مصائبِ حیات زندگی کے ساتھ ہیں اور ساتھ ہی ختم بھی ہوں گے۔ پس کام کرنے والوں کو ان پر ماتم کرنے کی جگہ یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ ان کی دائمی رفاقت کو گوارا بنالیں اور دریا سے نکلنے کی سعی بے سود کی جگہ تیرنے کی کوشش کریں۔ ورنہ ساری عمر ہاتھ پاؤں مارنے میں ختم ہو جائے گی اور

کنارے تک رسائی نصیب نہ ہوگی ؎

ہزار رخنہ بدام و مرا نہ سادہ دلی
تمام عمر در اندیشۂ رہائی رفت

البتہ اس خدائے حی و قیوم سے جس کے کان فریادوں کے سننے کے لئے ہر وقت تیار اور نغمۂ "اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ" سے عشق نواز ہر قلب مشتاق ہیں اور جس کی آنکھیں کسی حال میں بے خبر نہیں اور ہر آن "اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ" کی ٹکٹکی لگائے ہوئے ہیں، ——— یہ آخری التجا ہے کہ اگر وہ مجھ میں سچائی اور خلوص کی کوئی سرگرمی دیکھتا ہے، اگر اس کی ملتِ مرحومہ اور اس کے کلمۂ حق کی خدمت کی کوئی سچی تپش میرے دل میں موجود ہے اور اگر واقعی اس کی راہ میں فدویت اور خود فروشی کی ایک آگ ہے، جس میں برسوں سے بغیر دھوئیں کے میں جل رہا ہوں تو اپنے فضل و لطف سے مجھے اتنی مہلت عطا فرمائے کہ اپنے بعض مقاصد کے نتائج اپنے سامنے دیکھ سکوں لیکن اگر یہ میرے تمام کام محض ایک تجارتی کاروبار اور ایک دوکاندارانہ شغل ہیں جس میں قومی خدمت اور ملت پرستی کے نام سے گرم بازاری پیدا کرنا چاہتا ہوں تو قبل اس کے کہ میں اپنی جگہ پہ سنبھل سکوں وہ میری عمر کا خاتمہ کر دے اور میرے تمام کاموں کو ایک دن بلکہ ایک لمحہ کے لئے بھی کامیابی کی لذت چکھنے نہ دے۔

---

میرے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں ہے جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں

اور

میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں ہے جو انکار کی ساری آزمائشوں میں سے نہ گزر چکا ہو

میں نے زہر کے گھونٹ بھی ہر جام سے پیے ہیں۔

اور

تریاق کے نسخے بھی ہر دار الشفا کے آزمائے ہیں۔ میں جب پیاسا تھا تو میری لب تشنگیاں دوسروں کی طرح نہ تھیں۔ اور جب سیراب ہوا

تو

میری سیرابی کا سرچشمہ بھی شاہراہ عام پر نہ تھا

راہے کہ خضر داشت ز سرچشمہ دور بود
لب تشنگی ز راہِ دگر بردہ ایم ما!

ابوالکلام

# ایک شبہہ کا ازالہ

الہلال کے ابتدائی دور میں ایک صاحب نے اپنے خط میں مولانا کی بصیرت افروز مذہبی تحریروں کا اعتراف کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا تھا کہ سیاسی مباحث کو مذہبی رنگ سے الگ رکھا جائے تو بہتر ہے۔ اور یہ بھی دریافت کیا تھا کہ اس وقت ہندوستان میں جو مختلف سیاسی گروہ موجود ہیں - الہلال کس کی تائید کرے گا۔ یہ مضمون اسی خط کا جواب ہے۔

آپ نے جن الفاظ میں میرے مذہبی افکار و تحریرات کی تعریف کی ہے۔ یہ آپ کا بزرگانہ حسنِ ظن ہے۔ لیکن بلا شائبۂ انکسار عرض کر رہا ہوں کہ اس کی اہلیت کسی طرح اپنے اندر نہیں پاتا۔ ممکن ہے کہ مذہبی باتیں تھوڑی بہت مجھے معلوم ہوں لیکن قرآن کریم کے معارف تو اتنے ارزاں نہیں جن کو میں اپنی حرف شناسی دے کر خرید سکوں۔ میں تو آپ کے خط میں اپنی نسبت ایسے الفاظ دیکھ کر بے اختیار کانپ اٹھا ــــــ اگر اس کے حقائق و اسرار کے فہم کے لئے عربی دانی کی ضرورت ہوتی تو میں

عربی کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں۔ اگر مذہبی معلومات کی ضرورت ہوتی تو ان کے حاصل کرنے کی کوشش کرتا اگر کتب تفاسیر کے مطالعہ کی ضرورت ہوتی تو کتابوں کی میرے پاس کمی نہ تھی لیکن اس کے لئے یہ تمام باتیں بے کار ہیں پہلی شرط یہاں اتقا اور تزکیۂ قلب ہے اور ساری مصیبت یہ ہے کہ اسی سے محروم ہوں۔

جو دل زادِ تقویٰ سے محروم اور ہوائے نفسانی و آلائش دنیا پرستی میں گرفتار ہے وہ ایک لمحہ کے لئے بھی قرآن کے حقائق و معارف کا تجلّی گاہ نہیں بن سکتا۔ علم و فضل اس کے بالکل بے کار ہے اور ذہن و دماغ کو یہاں کوئی نہیں پوچھتا ؎

از منطق و حکمت نکشاید درِ محبوب
اینہا ہمہ آرائشِ افسانۂ عشق است

آپ کے خط میں کئی باتیں قابل غور ہیں۔

(۱) پولیٹیکل مباحث مذہبی تعلیم سے الگ ہونے چاہئیں۔

(۲) ہندوستان میں اس وقت جو پولیٹیکل گروہ موجود ہیں۔ ان میں الہلال کس کا ساتھ دیتا ہے۔

امر اول کی نسبت گذارش ہے کہ یہ تو جناب نے اس بنیادی اصل کو چھیڑ دیا جس پر ہم الہلال کی پوری عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہیں آپ کہیں کہ محراب خوش نما نہیں تو ممکن ہے کہ ہم بدل دیں۔ لیکن اگر آپ کی خواہش ہو کہ بنیاد کا پتھر بدل دیا جائے تو معاف فرمایئے اس کی تعمیل سے معذور ہیں۔ انسانی اعمال کی خواہ کوئی شاخ ہو۔ ہم تو اسے مذہب ہی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو صرف قرآن ہے اس کے سوا ہم اور کچھ نہیں جانتے ہماری دنیا کی طرف سے ہماری آنکھیں بند ہیں اور

تمام آوازوں سے کان بہرے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ پولیٹیکل مباحث کو مذہبی رنگ سے الگ کر دیجئے۔ ہم نے تو اپنے پولیٹیکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں۔ ہم اُنہیں مذہب سے کیونکر الگ کر دیں۔ ہمارے عقیدے میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا اور کسی تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو ایک کفر صریح ہے۔

افسوس ہے کہ آپ حضرات نے اسلام کو کبھی بھی اس کی اصلی عظمت میں نہیں دیکھا ورنہ اپنی پولیٹیکل پالیسی کے لئے نہ تو گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنا پڑتا اور نہ ہندوؤں کی اقتدا کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ اس سے سب کچھ سیکھ سکتے۔ جس کی بدولت تمام دنیا کو آپ نے سب کچھ سکھلایا تھا۔

اسلام انسان کے لئے ایک جامع اور اکمل قانون لے کر آیا ہے۔ اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ ایسا نہیں جس کے لئے وہ حکم نہ ہو۔ اسلام اپنی توحید تعلیم میں نہایت غیور ہے اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والے کسی دوسرے دروازے کے سائل بنیں۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی۔ سیاسی ہو یا معاشرتی۔ دینی ہو یا دنیاوی۔ حاکمانہ ہو یا محکومانہ وہ ہر زندگی کے لئے ایک اکمل ترین قانون اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ آخری اور عالمگیر مذہب نہ ہو سکتا۔ وہ خدا کی آواز ہے۔ قرآن نے ہر جگہ اپنے تئیں "امام مبین" "حق الیقین" "نوراً" "کتاب مبین" "بصائر للناس" "ہادی و ہادی الی السبیل" "حاوی کل شئی" اور اسی طرح کے ناموں سے یاد کیا ہے۔

بیشک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور ہر بات کو بیان کرنے والی کتاب آئی ہے۔ اللہ اس کے ذریعہ سلامتی کے راستوں پر ہدایت

کرتا ہے۔ اُس کی جو اس کی رضا چاہتا ہے۔ اور اُس کو ہر طرح کی گمراہی
کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاتا اور صراط مستقیم پر چلاتا ہے (۵: ۱۸)

دنیا میں کون سی کتاب ہے جس نے خود اپنی زبان سے اپنی نسبت ایسے عظیم الشان دعوے کئے ہوں؟ پس اگر آپ کے سامنے پولیٹکل اعمال کی بھی کوئی راہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی سلامتی آپ کو قرآن سے نہ ملے ہماری پولیٹکل گمراہیاں صرف اس لئے ہیں کہ ہم نے قرآن کے دستِ رہنما کو اب تک ہاتھ سپرد نہیں کیا ورنہ تاریکی کی جگہ آج ہمارے چاروں طرف روشنی ہوتی۔

ہم نہیں سمجھتے کہ اگر نزول قرآن کے وقت مشرکانِ مکہ اس سے اعراض و اغماض کرتے تھے تو ان میں اس سے زیادہ کیا سرکشی تھی جتنی آج صدیوں سے تمام مسلمانانِ عالم اور ان کو ہر طبقہ بلا استغناء کر رہا ہے۔ وہ اگر قرآن کی تلاوت کے وقت کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے تھے یا کعبہ کے اندر شور مچاتے اور تالیاں پیٹتے تھے کہ اس کی آواز کسی کے سننے میں نہ آئے تو آج خود مسلمان کانوں کی جگہ دلوں کو بند کئے ہوئے ہیں اور شور مچانے کی جگہ گو خاموش ہیں، مگر ان کے نفس نے انسانی ہنگاموں کا ایسا غل مچا دیا ہے کہ خدا کی آواز کسی کے کانوں میں نہیں پڑتی۔

پس ہم بالاختصار عرض کئے دیتے ہیں کہ الہلال کا مقصد اصلی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ مسلمانوں کو ان کے تمام اعمال و معتقدات میں صرف کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے اور خواہ تعلیمی مسائل ہوں خواہ تمدنی۔ سیاسی ہوں خواہ اور کچھ وہ ہر جگہ مسلمانوں کو صرف مسلمان دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی صدا یہی ہے۔ کہ اس کتاب اللہ کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں دونوں میں مشترک ہے۔

(۲)

یہ اصول ہے جس سے ہم اپنی پولٹیکل پالیسی تیار کر سکتے ہیں اور جس کے لئے ہمیں نہ تو ماڈریٹ ہندوؤں کی پالیسی کی ضرورت ہے نہ اکسٹریمنیٹ کی۔ اگر ہم ایسا کریں تو ایک اعتدال پسند مگر بے خوف جماعت ہوں گے۔ اور ہم سے کسی فریق کو ضرر اور نقصان کا خوف نہ ہوگا۔ ہم بالکل اپنے مذہبی اصول کے مطابق ملک کی ترقی اور آزادی کے لئے سعی کریں گے۔ لیکن ہماری سعی فتنہ و فساد اور شورش و بغاوت سے بالکل پاک ہوگی۔ قرآن نے ہم کو سکھلایا ہے کہ

"امن کے بعد زمین پر فساد نہ پھیلاؤ"

برٹش گورنمنٹ نے یقیناً ہم کو امن دیا ہے اور اس امن میں آزادی کے ساتھ ہم اپنے مذہبی فرائض انجام دیتے ہیں۔ پس اب باغیانہ شر و فساد اور مغویانہ قانون شکنی اصلاح کے بعد زمین کو آلودہ کرنا ہوگا۔ اور یہ یقیناً خدا کا جرم و عصیان ہے۔ اور قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ پس جو لوگ ملک میں فساد پھیلاتے ہوں۔ خواہ وہ جرائم پیشہ جماعتیں ہوں یا ہندو انارکسٹ، ہمارا فرض ہونا چاہیئے کہ ان سے دوری ڈھونڈیں اور بن پڑے تو ان کے دفعیے کے لئے کوشش کریں۔

گورنمنٹ کو بھی یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر ہم مسلمان سچے مسلمان ہو جائیں تو جس قدر اپنے نفس کے لئے مفید ہوں اتنا ہی گورنمنٹ کے لئے نیز اسی قدر اپنے ہمسایوں کے لئے۔ اس کو بھولنا نہیں چاہیئے کہ اگر ہم مسلمان ہوں تو ہمارے ہاتھ میں قرآن ہوگا۔ اور جو ہاتھ قرآن سے رکا ہوا ہو وہ بم کا گولہ نہیں پکڑ سکتا۔ البتہ یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام نے ہم کو آزادی بخشنے اور آزادی حاصل کرنے دونوں کی تعلیم دی

ہے۔ ہم جب حاکم تھے تو ہم نے آزادی دی تھی اور اب ہم محکوم ہیں تو وہی چیز طلب کرتے ہیں۔ ہم خدا کی مرضی اس میں یقین کرتے ہیں کہ قوموں اور ملکوں کو اپنے اوپر آپ حکومت کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ بیشک اگر اسلام کی بتلائی ہوئی پالیٹکس کی راہ ہمارے سامنے ہوگی تو ہم ایک طاقتور گروہ ہوں گے بے خوف ہوں گے اظہارِ حق میں بیباک ہوں گے۔ کیونکہ ہم خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے لیکن اسلام ہی کے بتائے ہوئے اصولوں سے قانون اور حکومت بھی ہماری طرف سے بے خطر ہوگی۔ کیونکہ ہماری راہ صاف اور غیر مشتبہ ہوگی اس لئے ہماری نیت اور ہماری زبان بھی ایک ہوگی۔ ہم جوش میں بھی آئیں گے۔ لیکن ہمارا جوش اور ایجی ٹیشن قانون اور امن کے حدود کے اندر ہوگا۔

یہ الہلال کی پالیسی ہے اور یہی دعوت ہے جس کی طرف ہم مسلمانوں کو بلانا چاہتے ہیں۔ یہ کسی انسانی دماغ کی اختراع نہیں اور نہ کسی انسانی گروہ کا اتباع و تقلید ہے۔ بلکہ اس رب العالمین نے جس نے کتاب و حکمت اور عدل و میزان کے ساتھ اپنے رسولوں کو دنیا میں بھیجا، یہ راہ ہمارے سامنے کھول دی ہے۔ وہ اگر توفیق بخشے تو اس کی دی ہوئی زندگی کو اسی دعوتِ حق میں ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ نہ کسی سے جنگ ہے نہ مناقشہ نہ صلح کی توقع نہ داد کی امید۔ اس راہ کے داعیِ کریمؐ کو جو حکم دیا گیا تھا وہ ہمارے سامنے موجود ہے۔

> اے پیغمبرؐ تو ان کو دعوت دے اور جو حکم دیا گیا ہے اس پر قائم ہو جا۔ ان کی خواہشوں پر نہ چل اور ان سے کہہ دے کہ تمام اُتری ہوئی کتابوں پر میرا ایمان ہے اور مجھ

کو حکم ملا ہے کہ عدل کروں وہی اللہ ہمارا اور تمہارا دونوں
کا پروردگار ہے۔ ہمارا عمل ہمارے لئے اور تمہارا عمل
تمہارے لئے۔ جھگڑنے کی کوئی بات نہیں۔ اللہ ہم
سب کو ایک جا جمع کر دے گا۔ اور سب کو اُسی کی طرف
جانا ہے۔ (۱۴۲۴۲)

اگر مسلم لیگ مسلمانوں کی پولیٹیکل رہنمائی کرنا چاہتی ہے۔ تو اُس کو یہی راہ اختیار
کرنی چاہیئے۔

# الدّاء والدّواء

یعنی جماعت حزب اللہ کے اغراض و مقاصد

زخمہ بر تارِ رگِ جاں می زنم — کس چہ داند تا چہ دستاں می زنم
زخمہ ہر تارم پریشاں می رود — کیں نواہائے پریشاں می زنم
خامہ ہمرازِ دمِ گرمِ من است — آتش از نی در نیستاں می زنم

---

باز شوقم در خروش آوردہ است — باز ہوئے ہمچو مستاں می زنم
دی بہ یغما دادہ ام رخت و متاع — امشب آور در شبستاں می زنم
جوئے شیر از سنگ راندن ابلہی است — بہر گوہر تیشہ بر کاں می زنم
گریہ را در دل نشاطِ دیگر است — خندہ بر لب ہائے خنداں می زنم
بند ہر خواہش ز دل می بگسلم — نقش ہر صورت بعنواں می زنم
دعویٰ امتی ہماں بت بندگیست — کافرم گر لافِ ایماں می زنم

در خراباتم ندید مستی خراب — بادہ پنداری کہ پنہاں می زنم
تو درین غا بینی و من خود ہنوز — جام می در بزم اعیاں می زنم
می ستیزم با قضا از دیر باز — خویش را بر تیغ عریاں می زنم
لعب با شمشیر و خنجر مے کنم — بوسہ بر ساطور و پیکاں می زنم

در جنوں بیکار نتواں زیستن
آتشم تیز است و داماں می زنم

فطرتِ انسانی عجلت پسند واقع ہوئی ہے اس لئے ممکن ہے کہ بعض حضرات کو جو اغراض و مقاصد کی تشریح کے لئے ایک مبارک اضطراب اپنے اندر رکھتے ہیں۔ یہ تمہید ناگوار گزرے کہ سنی سنائی باتوں کے اعادہ سے کیا فایدہ؟ لیکن جہاں انہوں نے اتنے عرصہ تک صبر کیا ہے، چند دن اور انتظار گوارا فرمالیں ہر کام ترتیب طبعی سے انجام پاتا ہے، اغراض و مقاصد سے پہلے ان تمام امور پر نظر ڈال لینا ضروری ہے۔ جن کے بہ یک وقت پیش نظر ہوئے بغیر مقصد اصلی سمجھ میں آ نہیں سکتا۔

یہ بار بار کہا گیا ہے۔ کہ عالم اسلامی کے گزشتہ آخری مصائب نے مسلمانوں میں تنبہ و اعتبار کے جیسے غیر معمولی علائم و آثار پیدا کر دیئے ہیں، ان کا پہلے وجود نہ تھا اس قسم کے آرا و قیاسات ہمیشہ مظنون اور مستقبل کے نتائج کے محتاج ہوتے ہیں اور ان کی صحت و عدم صحت کے دلائل مدتوں اور لمحوں کے واقعات سے متغیر ہو جاتے ہیں۔

وہ مدبر و حکیم جو ایک چھوٹے سے بیج کو ایک عظیم الشان نباتاتی ہستی تک

پہنچاتا ہے، صرف اس کے ہاتھ میں ہے۔ کہ بدامنیوں کو استوار، عبرتوں کو نتیجہ خیز اور متحرک نقشوں کو بھی دقائم اجسام کی صورت میں بدل دے۔

یہ علائم فطریہ اور آثار طبعیہ جو تم کو دنیا میں اپنے باہر نظر آتے ہیں، بعینہٖ تمہارے اندر موجود ہیں۔ تم جو اس عالم صورت و جسم کے ذرّے ذرّے کی پرستش کرتے ہو بھول گئے ہو کہ ایک اقلیم قلب و معنی بھی ہیں اور اس "عالم صغیر" میں جو کچھ ہے اسی "عالمِ کبیر" کا عکس ہے ؎

ہر روحانیاں دادی وے خود را ندیدستی
بخوابِ خود در آ تا قبلۂ روحانیاں بینی

آفتاب طلوع ہوتا ہے اور اپنے سایہ کو اپنے ساتھ متحرک کرتے ہوئے غروب ہو جاتا ہے، چاند نکلتا ہے اور عروج و محاق کی منزلیں طے کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ موسم بدلتے ہیں اور نئی نئی ہوائیں چلتی ہیں۔ سمندروں میں طوفان اُٹھتے ہیں۔ اور آسمان پر بجلیاں چمکتی ہیں جب کہ موسم خشک اور گرم ہوتا ہے۔ تو بارش کی علامتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور جب علامتوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ تو بارش کا نزول ہوتا ہے۔ غرض جو دنیا تمہارے سامنے موجود ہے وہ طلوع و غروب۔ عروج و محاق۔ تسلط و تنزع۔ تضارب و تصادم۔ تجاذل و تسابق۔ تسفل و ترقی۔ تبدل و تجدد اور ایاب و ذہاب کا ایک یکسر مرقع ہے۔ جس کے مناظر متلون اور امثال متحرک ہیں۔

بعینہٖ یہی حال اس دنیا کا بھی ہے۔ جو تمہارے سامنے نہیں ہے۔ مگر تمہارے اندر موجود ہے۔ وہاں بھی طلوع و غروب ہوتا ہے۔ اور جب کہ تاریکی چھا جاتی ہے تو آفتاب دریچۂ ظلمت سے اپنا سر نکالتا ہے وہاں بھی موسم بدلتے ہیں اور ہوائیں تغیر

ہوتی ہیں۔ بہار عیش و حیات کا پیغام لاتی ہے اور خزاں افسردگی و ہلاکت کے ساتھ ظہور کرتی ہے۔ وہاں بھی سمندروں میں طوفان اُٹھتے ہیں اور زمینوں پر تند و تیز ہوائیں چلتی ہیں۔ جب موسم بدل جاتا ہے تو یہاں کے آسمان کی طرح وہاں کا آسمان بھی بدل جاتا ہے اور جب پانی برسنے کے لئے آتا ہے تو پہلے ابر کے محیط ٹکڑوں اور سرد ہواؤں کے مرطوب جھونکوں کو بھیج دیتا ہے۔ قحط اور خشک سالی اس سرزمین کی سب سے بڑی مصیبت سمجھی جاتی ہے لیکن وہاں بھی اس سے بڑھ کر اور کوئی مصیبت نہیں۔ جب آسمان اپنی دریا دلی کا اور زمین اپنی بخشش کا دروازہ بند کر دیتی ہے تو دریا اُتر جاتے ہیں اور سیرحاصل زمین خشک ہو کر چٹیل میدان بن جاتی ہیں۔ پھر بربادی اور موت دنیا پر چھا جاتی ہے اور انسان اپنی غذا سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہی حال وہاں کا بھی ہے۔ البتہ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ یہاں جسم کے لئے موت ہے۔ جس کے بعد بھی زندگی باقی رہتی ہے۔ اور وہاں دل کے لئے ہلاکت ہے جس کی ہلاکت کے بعد زندگی کا کوئی سامان نہیں جسم و جان۔ رنگ و بو۔ لفظ و معنی۔ صورت و حقیقت یہی دو مختلف دنیائیں اور موجود و مشہود کی دو اقلیمیں ہیں۔ جن کو لسانِ الٰہی "عالمِ آفاق و انفس" سے تعبیر کرتا ہے اور یہی وہ عالمِ معنوی ہے جس کے آثار و علائم اور آیات و اسرار پر قرآن کریم توجہ دلاتا ہے۔

پس گو آثار و علائم ہمیشہ مظنون اور مستقبل کا چہرہ ہمیشہ تاریکی میں ملفوف ہوتا ہے تاہم علامتوں کے ظہور میں شک نہیں۔ عالمِ اسلامی آج ایک آخری انقلاب کے کنارے پر ہے اور تبدیلیوں کی وہ تمام علامتیں اس کے چپہ چپہ میں موجود ہیں جو دنیا کے گزشتہ سخت سے سخت انقلاب کی تکمیل سے پہلے ہمیشہ ظاہر ہوا کی ہیں۔ وہ انقلاب آثار

عظیمہ جنہوں نے دنیا اور دنیا کے مناظر کو یکسر پلٹ دیا وہ تغیرات مدہشہ جنہوں نے قوموں اور ملکوں کی تاریخ یک قلم الٹ دی وہ جنہوں نے زمین کے جغرافیے اور اس کی خشکی اور تری کے حدود میں تبدیلیاں کر دیں۔ وہ جنہوں نے انسانی نسلوں کے عمران و تمدن اور ان کے عوائد و خصائل کی عمارتوں کو ڈھاکہ پھر از سرِ نو تعمیر کر دیا اور وہ جو اس لئے ظاہر ہوتے ہیں تاکہ حیات و مماتِ امم کے قانونِ الٰہی کے مطابق زمین اور زمین کے بسنے والوں کو از سر تا پا بدل دیں، ٹھیک ٹھیک ایسے ہی مظاہر و آثار کو اپنے آگے اور پیچھے و یسار رکھتے تھے۔ جیسے کہ آج دنیا کے سامنے ظاہر ہو رہے ہیں۔ یہ دنیا میں ہمیشہ ہو چکا ہے۔ اور ایسا ہونا انقلاب امم و ملل کے ایک دائمی قانون کے ماتحت ہے۔

منجملہ علائم و آثار مخصوصہ کے ایک علامت یہ بھی ہے۔ کہ رفتہ رفتہ ماتم اور آئندہ کی حیرت کی جگہ اب بہت سے دماغ ہیں جو کام بھی کرنا چاہتے ہیں اور محض ماتم و فریاد پر قانع نہیں۔

یہ احساس عام ہے۔ اور عالم اسلامی کے دیگر اکناف و اطراف سے قطع نظر خود ہندوستان میں بھی باوجود استیلاء یاس و قنوط موجود ہے۔ اور اگر صحیح وسائل اختیار کرے تو فی الحقیقت انقلاب حالت کا اُسے پہلا پیچ سمجھنا چاہیئے۔ کل کا فکر آج ہر شخص کے سامنے ہے۔ کل تک مصائب کے ورود کا خوف تھا۔ اس لئے صرف ذہن و دماغ ہی ان کو محسوس کر سکتے تھے مگر آج جب کہ وہ ظاہر ہو چکے ہیں۔ اور بقیہ ظہور سامنے ہے تو ان کے سمجھنے کے لئے دماغ کی نہیں بلکہ دیکھنے کے لئے صرف آنکھوں کی ضرورت ہے اور دماغ کم ہوں مگر آنکھوں کی کمی نہیں۔

کچھ تو مایوس ہیں اور کچھ متلاشی مگر جیسا کہ میں مختصراً اشارہ کر چکا ہوں آج کسی

قدرے تفصیل کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ سفر کا نہیہ ہی مطلوب نہیں بلکہ صحیح راہ سفر کا معلوم کرنا اور پھر اس پہ چلنا دونوں باتیں شرط کار ہیں۔

آج اس بارے میں بلند ترین حد نظر اور فکر و جستجو کا آخری سدرۃ المنتہیٰ جو لوگوں کے سامنے ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کہ حفظ اسلام و مقامات مقدسۂ اسلامیہ کے نام سے ایک وسیع اور عظیم الشان فنڈ جمع کیا جائے اور ہر مسلمان عہد کرے کہ کعبۂ معظمہ کی حفاظت کو وہ ہمیشہ پیش رکھے گا۔

اس میں شک نہیں کہ زمین کی وراثت اور تاج و تخت کی حکومت میں جو کچھ ہمارے پاس باقی رہا تھا وہ ہماری غفلتوں اور نادانیوں کی نذر ہو گیا اور جو باقی ہے ہر آن اور ہر لمحہ وہ خطرے میں ہے۔ اور اب اگر کوئی متاع آخری رہ گئی ہے تو وہ صرف اسلام کا مبداء اولی اور دعوت الہٰی کا وہ اولین سرچشمہ ہے۔ جہاں "فاران" کی چوٹیاں ہیں جس پہ "سعیر" کے بعد خداوند خدا رسینا نے کتاب شریعت اور شمشیر عدل کے ساتھ ظہور کیا جہاں وہ محترم و مقدس "غار" ہے۔ جس کی تاریکی میں "داعی الی اللہ و سراج منیر" کی روشنی سب سے پہلے نمودار ہوئی تھی اور جو دعوت اسلامی اور ملت خلیفہ کے اس اولین داعی کی یادگار ہے جس نے اپنے نفس و جان کی قربانیوں کا اسوۂ حسنہ دکھلا کر حقیقت اسلامی کی پہلی بنیاد رکھی تھی۔

پس ضرور ہے کہ ہر مسلم ہستی اس کی خدمت گزاری کی راہ میں اپنے تئیں قربان کر دینے کا حلف اٹھائے۔

یہ سب کچھ سچ ہے اور اس سے کسی طرح انکار نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ جو ضرورت ہمارے سامنے ہے اور جس لیلیٰ کے فراق میں مجنون صفتان عشق کی یہ کچھ بیقراریاں ہیں کیا

اس کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے؟ جو سوال ان کاموں کے شروع کرنے کا سبب تھا مشکل یہ ہے کہ اختیار کرنے کے بعد بھی وہی سوال سامنے آجاتا ہے۔

گشت راز دگرآں راز کہ افشا مے کرد

مدتوں مجھ کو صرف مشغول آہ وبکا رہنے کا الزام دیا گیا کئی ماہ سے لوگ معترض ہیں کہ صدا اُلھڑ رہی ہے۔ مگر مدعا کا پتہ نہیں اس کے اسباب سے تفصیل بحث کبھی نہ کبھی ہو رہے گی۔ اصل غالباً مضمون کے آخر میں کروں مگر یہاں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ یہ خاموشی بے وجہ نہ تھی یاران راہ نے منزل مقصود کی جستجو کو جتنا آسان سمجھ رکھا ہے۔ شاید اس قدر آسان نہیں ہے۔

بیا کہ مسئلہ عشق ازاں دقیق تر است
کہ حل شود شرفِ از فکرِ باطل ہمہ کس

پھر کہتا ہوں کہ یہ سب شاخیں ضرور ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جڑ کہاں ہے باغ لسانے کی تدبیر یہ نہیں ہے۔ کہ درختوں کی شاخوں پر پچکاری سے پانی دیجئے۔ پہلی بات یہ ہے کہ جڑ کو تر و تازہ کیجئے آپ کو پتہ معلوم نہیں تو ممکن ہے کہ دوسروں کو معلوم ہو

ے تو گل از باغ می خواہی من از باغ می جویم
من از آتش دخان بینم تو آتش از دخان بینی

یقیناً حالات نے ہمیں بتلا دیا ہے کہ ضروریات ملی کی غرض سے ایک وسیع خزینہ ملی (نیشنل فنڈ) ضروری ہے۔ لیکن صرف اس سے ان آنے والے مصائب کو کیونکر دور کیا جائے گا۔ جو چاروں طرف سے ہم پر اُمنڈنے والے ہیں۔ کیا ملکوں اور قوموں کا انقلاب ایک ایسا معاملہ ہے جس کو ایک دو کروڑ روپیہ بطور رشوت دے کر ہم اپنے حسب مرضی طے

کرائیں گے۔ کیا کرایہ کی فوجیں اور کرایہ کا جوش لندن اور برلن میں ملتا ہے۔ کہ جب کبھی کوئی فوج بلاد اسلامیہ پر حملہ آور ہوگی تو ہم تار کے ذریعہ اُجرت طے کر کے فوراً انہیں میدان کی طرف روانہ کردیں گے کیا ہماری تمام بربادیاں اور نامرادیاں صرف اس لئے ہیں کہ ہم نے اپنے پاس روپیہ جمع نہ رکھا اور کیا یورپ نے صرف افلاس کا الزام رکھ کر ہم سے سلانیک اور ایڈریا نوپل لے لیا۔

ہمارے سامنے آج ہمارا زوال ہے۔ ہم اپنی تجہیز و تکفین کا سامان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے پاس اب اتنی مہلت نہیں کہ بار بار نسخے آزمائیں اور بہت سے طبیبوں سے رجوع کریں۔ ہم کو اس وقت صرف ایک ہی نسخے کی ضرورت ہے اور صرف ایک ہی طبیب کی۔ ہمارے امراض یقیناً بے شمار ہیں۔ اور فرصت ہوتی تو ایک ایک کا علاج کرتے۔ مگر اب تو اسی نسخہ کی تلاش ہی پر انحصار زندگی اور اُمید صحت ہے جو ایک ہو۔ مگر ایسے اندر ہمارے تمام بے شمار امراض کا علاج رکھتا ہو۔

(۲)

بیا کہ روئے بمحراب گاہ نور نہیم | بنائے کعبۂ دیگر ز سنگ طور نہیم
حطیم کعبہ شکست و اساس قبلہ بریخت | بتازہ طرح یکے قصر بے قصور نہیم
عُلو طاق حرم تا بچند مصلحت است | کہ داغ عشق بہ پیشانیٔ غرور نہیم
تو خطع دیر فرو چیں کہ ما قرابۂ مے | بشہپر ملک و طیلسان حور نہیم
ز جوش جرعہ کشاں صد قیامت انگیزیم | جہاں جہاں ز صراحی بادہ صور نہیم
بجرعۂ کہ بسوزد دماغ خلوتیاں | خفائے صومعہ و دو صومعہ ظہور نہیم
نفس بہ گرمیٔ این بزم تا بہ کے فیضی | دگر بہ مجلس روحانیاں بخور نہیم

پس میں کہتا ہوں اور از فرق تا بہ قدم ایک صدائے ربانی بن کر کہتا ہوں - جب کہ یقین کی وہ لازوال طاقت میرے ساتھ ہے جس کے لئے کبھی فنا نہیں - جب کہ وہ بصیرت الہٰی میرے دل کے اندر موجود ہے جس میں کبھی تزلزل و تذبذب نہیں اور جب کہ وہ شہادت العیانی میرے سامنے ہے - جس کی رویت میں کبھی دھوکا اور فریب نہیں کہ کامیابیوں اور زندگیوں کا وہ تقدس تخم کوئی انجمن کوئی سکیم کوئی بے شمار خزانہ غرض کہ دنیا کی کوئی آواز اور انسانوں کی کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی - مگر صرف وہ ایک ہی تحریک حق و صداقت جو مسلمانوں کو ان کی حیاتِ انفرادی و ملّی کی ہر شاخ میں "مسلم" بننے کی دعوت دے اور اپنی اس آواز کو ان کے تمام صغار و کبار - رجال و اناث - اعالی و ادانی - شہری و دیہاتی عوام و خواص غرض کہ ہر فرد ملت کے دل و جگر میں اُتار دے اور اس طرح اُتار دے - کہ خدا کے بندے پھر صرف اسی کے ہو جائیں اس کے رشتے سے ٹوٹے ہوئے پھر اسی کے ساتھ جڑ جائیں - اس کے دروازے سے بھاگے ہوئے پھر اسی کی غلامی کی زنجیریں پہن لیں اور اس ایک کی غلامی کا حلقہ پہن کر تمام دنیا کو پھر اپنا غلام بنانے والے پھر اسی کی چوکھٹ پہ جھک جائیں تاکہ اس کے آگے جھک کر سب کے آگے سر بلند ہوں اور اس کے سامنے جبینِ نیاز جھکا کے سب کو اپنے آگے مسجود دیکھیں - یعنی ہجر کے بعد پھر وصال کی بزم آرائی ہو، محرومی کے بعد پھر کامرانی کے راز و نیاز ہوں اور نامرادی کے بعد پھر دولت مقصود و مطلوب سے دامن و آستیں امید مالا مال ہو جائے۔

اور وہی غفور اور رحیم تو تمہارا معبود کارساز ہے کہ اس کے بندوں نے خواہ کتنی ہی اس کی نافرمانیاں کی ہوں اور خواہ کتنی ہی سخت مصیبتوں میں مبتلا ہو گئے ہوں لیکن جب وہ اس کے آگے توبہ کا سر جھکاتے ہیں

اور ہر طرف سے کٹ کر صرف اسی کے ہو جانا چاہتے ہیں تو وہ ان کی توبہ کو قبول فرما لیتا ہے اور ان کی خطاؤں سے درگزر کر دیتا ہے۔ اور تم لوگ جو کچھ کر رہے ہو اُسے سب کچھ معلوم ہے اور پھر جو لوگ اس کے احکام پر ایمان لائے اور اعمال صالحہ اختیار کر لئے تو وہ ان پر اپنی رحمت کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ ان کی دعاؤں کو سنتا ہے اور ان کی آرزوؤں کو پورا کرتا ہے اور اپنے فضل بندہ نواز سے ان کو ان کے حق سے بڑھ کر اس کا بدلہ دیتا ہے (۲۶/۴۲)

اس صدا سے میرا مقصود کیا ہے۔ صداؤں کی تو کبھی بھی کمی نہیں رہی زبانوں نے ہمیشہ قدموں سے زیادہ کام کیا۔ پس صدا سے مقصود وہ آواز نہیں جو کھوکھلے سینوں تاریک دلوں اور بے سوز حلقوں سے اٹھ کر دوسروں کے اندر وہ چیز پیدا کرنا چاہتی ہے جو خود اس کے اندر نہیں ہے۔ میں تو اس صدائے رعد آسائے قلب تشکن اور غدائے ضلالت ربائے ہوش فگن کی طرف اشارہ کر رہا ہوں جو گو انسانوں کی حلقوں سے نکلتی ہو مگر دراصل ہدایت ربانی اور توفیق حقانی کی ایک صدائے مقلب القلوب ہو۔ جس نے لسانِ عباد کو اپنا ظاہر بنا لیا ہو۔ اور حق و صداقت کا ایک حسن حقیقی ہو۔ جو انسانی خال و خط کے اندر سے اپنے جمالِ حقیقی کی شعاعیں دکھلا رہا ہو۔ یعنی وہ صدا جس کا مدار زبان کی حرکت کی جگہ دل کا اضطراب ہے۔ جو گویائی کی زبان سے نہیں بلکہ خاموشی کے لبوں سے بولتی اور انسان کے پردہ ہائے سماعت سے نہیں بلکہ ایمانی جذب و روح کی دیواروں اور محرابوں سے ٹکراتی ہے۔

بہتر ہے کہ میں اپنے مطلب کو زیادہ واضح کر دوں۔ میرا مقصود اس صدا سے

دعوت ہے۔ جو محض آج کل کی مصطلحہ تحریک اور ایک رسمی آواز ہی نہ ہو بلکہ اس کی داعی ایک ایسی جماعت ہو جو سر سے لے کر پیر تک اس دعوت کا ایک پیکرِ مجسم ہو، اس کے اندر حقیقت اسلامیہ کی عملی روح ہو۔ اس کا دل تجلیاتِ الٰہی کا مسکن ہو اور اس کا چہرہ حسنِ حقیقت کا حجاب ہو۔ وہ دنیا کی تمام طاقتوں اور ماسوا اللہ قوتوں سے باغی ہو کر صرف خدائے اسلام کی وفادار اور تابع احکام ہو اور ایک کے استغراق و استہلاک میں اس طرح فنا ہو گئی ہو کہ غیر دنیا کی صدہا قوار شیطانیہ کے لئے اس کے پاس کوئی متاع باقی نہ رہی ہو اور ہر آن و ہر لمحہ اس کے اعمال کی زبانِ حال "من رآنی فقد رأی الحق" کی صدائے توحید سے غلغلہ انداز تسلیم روح و معنی ہو۔ یہی ہیں جن کے لئے کہا گیا ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　　گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(نظم)

قصۂ عشق کہ ماند ایں ہمہ ناگفتہ بسے　　　با تو گویم سخن شیریں کہ نگوئی بہ کسے
کس بمنزلگہ مقصود نہ رفت آبلہ پا　　　بوالفضولی دو سہ دیدم بہ پئے بوالہوسے
ہمت است ایں کہ دہد کام دل ما ہیچ کنی　　　کہ بایں طاق بلندت نبود دست رسے
جگرم سوخت کہ ہمراز بگوشم آمد　　　صوتِ زنجیر در کعبہ بہ بانگ جرسے
اگر ہمت گل تازہ کہ می خوانم نیست　　　بلبلاں را ز پریدن گراں تر قفسے
آستانِ حرمِ عشق مقام ادب است　　　دست بکشائے وبیں پردہ بہ ہر ملتمسے

فیضیا از زندگیٔ مردہ دلاں مے خواہی
بایدت گرم تر از صبح قیامت نفسے

اس تمہید و تفصیل کے بعد جو میرے لئے باقی رہ گیا ہے وہ اپنے اغراض کا نظام

پیش کرنے سے پہلے احبابِ کرام کو ایک آزمائش میں ڈالوں اور انہیں مقامِ کعبہ کے متعلق اپنی معروضات پیش کروں۔

حاجی بہ کعبہ رو اں کیں رہ دین ست

خوش بہر دو انا رہ مقصود نہ این ست

میں اس پکار کے بلند کرنے پہ مجبور ہوں کہ ہم مسلمان ہیں اور ہم دنیا میں اس لئے نہیں آئے ہیں کہ کعبہ معظمہ کی خدمت کریں بلکہ ہم اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ تجلی گاہ کعبہ کے ساتھ ہو کر تمام عالم کی خدمت کریں۔ ہم کعبہ کے محافظ نہیں ہیں۔ بلکہ ہم میں ایک چیز ہے کہ اگر اس کو پالیں تو خود ہمارا وجود تمام عالم کے لئے کعبہ بنے دُنیا ہمارا طواف کرے اور مخلوقاتِ الہٰی احرام نیاز باندھ کر ہماری طرف دوڑے۔

یہ جو میں کہہ رہا ہوں تو تفکر کا محتاج اور ہمہ تن دل ہو جانے کا طالب ہے۔ آج جو کچھ ہم پکار رہے ہیں۔ کل یہی ہمارے دل و دماغ پہ نقش ہو گا۔ بس مقصدوں اور ارادوں کی عمارت بناتے ہوئے پہلی اینٹ کی غلطی خطرناک اور ناقابلِ تلافی ہوتی ہے۔

قرآن حکیم نے جو ہمارے مقاصدِ حیات و مساعی کے لئے ایک ہی نصب العین ہے اس بارے میں بھی جو کچھ کہنا تھا روزِ اول ہی کہہ دیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس کی آیات میں سے ایک ایک پہ غور کرو اور دیکھو کہ تمہارا خدا نے فردوس تم کو بلندی و عظمت کی کیسی خصوصیت بخشتا ہے۔

ان آیات سے حسب ذیل امور واضح ہوتے ہیں۔

(۱) مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے "امتِ وسطہ" فرمایا ہے۔ نیز کہا کہ وہ تمام امم عالم میں بہترین اُمت ہیں "وسطہ" سے مراد اس کا اعلیٰ ہونا ہے یعنی وہ دنیا میں قیام

اعمال کا موجب ہوں گے۔

(۲) پھر ان کے اسی وصف حقیقی اور علت شرف و اقبال کی دوسری جگہ یوں تعبیر کی کہ تم بہترین اُمت اس لئے ہو تاکہ تم تمام عالم کی صلاح و فلاح کے لیے گواہ بنو۔

* شہادت " سے یہاں مراد اسی دنیا میں شہادت ہے نہ کہ قیامت کے دن جیسا کہ بعض مفسرین نے سمجھا ہے۔ حضرت عیسیٰ کا قول قرآن میں ہے۔ وہ قیامت کے دن اللہ سے کہیں گے۔

اے خدایا۔ میں تو اپنی اُمت پر اسی وقت تک شاہد تھا جب تک کہ دُنیا میں ان کے اندر موجود تھا پھر جب تو نے مجھے وفات دی تو تو ہی ان کا نگہبان حال تھا (۵ : ۱۱۷)

پس اس آیت میں بھی شہادت کا مطلب دنیا ہی کی گواہی ہے

(۳) پھر ایک آیت میں " امر بالمعروف و نہی عن المنکر " کو مسلمانوں کا فرض بتلایا ہے بعض مفسرین اور فقہائے کرام رحمہم اللہ نے جو اس فرض کو فرض کفایہ بتلایا ہے، صحیح نہیں ہے۔ بلکہ ایسا قرار دینا ہی درحقیقت عالم اسلامی کے تمام مفاسد کا سرچشمہ ہے۔ یہاں " من " تبعیض کے لئے نہیں ہے جس سے استدلال کیا جاتا ہے۔ بلکہ تبیین کے لئے ہے۔ وہ کسی خاص جماعت کی خصوصیت اس کے لئے نہیں کرتا بلکہ مسلمانوں کا ایک ایسی جماعت مجموعی ہونا بتلاتا ہے۔ جو امر بالمعروف کے لئے اپنے تئیں ہر حال میں وقف سمجھتی ہو۔

(۴) چوتھی آیت کریمہ مقصود بحث کے لئے عجیب و غریب ہے۔ اس میں بالترتیب

حسب ذیل امور پر زور دیا ہے۔

(۱) اللہ کی راہ میں قیام عدل و انصاف اور استیصال ظلم و عدوان کے لئے جہاد کرو۔

(۲) اس نے تم کو غلام دنیا میں بندگی اور بڑائی کے لئے چن لیا ہے۔

(۳) تمہاری شریعت ایسی صاف اور سادہ ہے جس میں مثل دیگر شرائع کے ترقیات دنیویہ دینیہ اور مدنیہ و عمرانیہ میں کسی طرح کی رکاوٹ اور حرج نہیں۔

(۴) یہ ملت حضرت ابراہیمؑ کی قائم کی ہوئی ہے جنہوں نے راہ اسلام میں اپنے نفس کی قربانی کی اور اپنے بیٹے کی گردن پر چھری رکھ دی کیونکہ یہی جان فروشی اصل حقیقت اسلام ہے اس لئے اس نے تمہارا نام "مسلم" رکھا اور اب بھی اسی نام سے متصف رہو گے۔

(۵) یہ اس لئے ہوا تاکہ جو ہدایت تم کو رسول سے ملی ہے وہ تمام دنیا تک پہنچاؤ۔

(۶) پس تمہارا کام یہ ہے کہ صلوٰۃ الٰہی کو دنیا میں قائم کرو، اپنے مال کو اللہ کی راہ میں لٹاؤ۔ اس کے ہو جاؤ وہی تمہارا آقا اور شہنشاہ ہے اور جس کا وہ آقا ہو اس کے غلام کی قسمت کو کیا کہیے۔

(۵) پانچویں آیت کو تمام مطالب بالا کا خاتمہ سمجھئے کہ صاف صاف لفظوں میں فرما دیا ہے کہ

مسلمانوں کی قوم ایسی ہو گی کہ اگر اسے زمین پر قائم کر دیا جائے تو وہ اللہ کی نام کی پکار بلند کرے گی اس کی بندگی و عبادت کی طرف داعی ہو گی۔ عدل و صداقت اور معروف و حقانیت کا حکم دے گی۔ برائیوں سے روکے گی اور اس طرح دنیا اور دین کے

رہنے والوں کی اصلاح میں اپنی زندگی و قیام اور حکمرانی و تسلط سے کام لے گی۔

(۴)

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشکافیم و طرح نو در اندازیم

اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

چو در دست است رودے خوش بزن مطرب سرودے خوش
کہ دست افشاں غزل خوانیم و پاکوباں سر اندازیم

یکے از عقل می لافد دگر طامات می بافد
بیا کیں داوریہا را بہ پیش داور اندازیم

بہشت عدن اگر خواہی بیا با ما بہ میخانہ
کہ از پائے خمت یکسر بحوض کوثر اندازیم

یہ آیاتِ بینہ محکمہ اور تصریحات قاطعہ ساطعہ تھیں اور یہ ان کے متعلق سرسری اشارات جن سے ہم اپنے مقصدِ حیات اور مرکز جہد و جہاد کو معلوم کر سکتے ہیں۔ ان آیتوں میں کہیں بھی ہم کو یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ تم فلاں مقام کی حفاظت کرو۔ اور فلاں سرزمین کی خدمت کو اپنا مقصدِ سعی بناؤ۔ بلکہ ہم کو بتایا گیا ہے کہ تمام دنیا تمہارا گلہ ہے اور تم اس کے چرواہے ہو۔ یہ تمام انسانی آبادیاں تم کو دی گئی ہیں تاکہ اللہ کی طرف سے تم ان کی حفاظت کرو اور گرگ ابلیس کے خونخوار حملوں سے ان کو بچاؤ۔ تم کو بہترین امت اور افضل ترین امم بنایا گیا تاکہ تم ارضِ الٰہی کے خدمت گزار ہو۔ اور تم کو دنیا میں اس لئے اپنی جماعت اپنی فوج اور قائم مقام قرار دیا تاکہ اس کی ہدایت کا علم صرف تمہارے ہی ہاتھ میں ہو اور اس کے تمام بندے اس کے سایہ کے نیچے آکر پناہ لیں۔

تم جس ابراہیم خلیل کی مقدس قربان گاہ کی حفاظت کا نام لیتے ہو کیا بہتر نہ

ہو گا۔ کہ اس کے بنائے ہوئے معبد کو دیکھنے سے پہلے خود اس پر بھی ایک نظر ڈالو۔ اس نے خانۂ کعبہ کی بنیاد ضرور رکھی۔ لیکن ساتھ ہی اپنے نفس اور اپنے فرزند کے گلے پر چھری بھی رکھ دی۔

نماز اسلام کی ایک عبادت ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ تمہارا منہ کعبہ کی طرف ہو مگر "اسوۂ ابراہیمی" اسلام کی حقیقت ہے اور اس کے لئے صرف کعبہ کی طرف منہ کر دینا ہی کافی نہیں بلکہ بانیٔ کعبہ کی طرف دل کو پھیر دینا بھی شرط ہے۔

پس جس طرح تمہارا رب کریم "رب العالمین" ہے۔ جس کی ربوبیت میں کسی نسل کسی قوم کسی زبان اور کسی زمین کی قید نہیں اسی طرح پیغامِ ظہور ہدایت اور وجودِ بشیر و نذیر بھی رحمۃ للعالمین ہے۔ جس کی اُمت کے بال بال کے لئے تمام کرہ ارضی خطۂ پرواز اور معرکۂ حق و باطل کے لئے تمام دُنیا کارزارِ جنگ ہے۔

پس جس قوم کے شرف و اجتبا اور جس قوم کے مقاصد کے جولانِ ارتفاع کا یہ حال ہو، میں ایک لمحہ کے لئے بھی راضی نہیں ہو سکتا کہ اس کے سامنے اس کے سوا کوئی اور مقصدِ حیات پیش کیا جائے۔ پھر خدارا سوچو کہ تمہاری حدِ نظر کہاں تک ہے اور میں کیا دیکھ رہا ہوں۔

## خیال کن تو کجائی و ما کجا واعظا

جس شے کو میں مسلمانوں کا فراموش کردہ مقصدِ حیات سمجھتا ہوں اور جس بھولی ہوئی بات کو از سرِ نو یاد دلانے کے لئے بے قرار ہوں مجھے الزام نہ دیجئے اگر میں اسے بار بار دہراؤں لیکن میں ایک حد تک دہرا چکا اور اب ختم مقالہ سے پہلے چاہتا ہوں کہ ایک دقیق اور اصل اصول کی طرف اور اشارہ کر دوں۔ منجملہ ان عظیم ترین حقائق

لے جو مجھ میں اور کار فرمایانِ عمل میں ہے۔ ایک اختلاف یہ ہے کہ وہ آج کسی کام کے لئے اُٹھتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ راہ "تاسیس" اختیار کریں اور میں اللہ کی بخشی ہوئی بصیرت کی بنا پر مسلمانوں کے لئے ان کے اعمال تک میں سے کسی شاخ کے لئے بھی "تاسیس" کی ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ صرف تجدید کی اور اس بارے میں الحمدللہ اس درجہ مطمئن و مشتعل ہوں کہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی رائے میں متزلزل نہیں ہو سکتا۔

میرا عقیدہ ہے کہ آج حیاتِ ملت کے لئے مسلمانوں کو اپنے اعمال کی کسی شاخ میں بھی تاسیس کی ضرورت نہیں۔ "تجدید" کی ہے۔ کہ جن اصولوں کو ہم نے بھلا دیا ہے۔ ان کو دوبارہ زندہ کریں۔ ہمارا جیب و دامن آج کی طرح ہمیشہ خالی نہ تھا۔ اگر آج اوروں کے پاس "لعل و جواہر" ہیں تو ہمارے پاس بھی اس کی کانیں تھیں۔ آج اگر ہم مفلس ہیں تو دوسروں کو حسرت و طمع سے دیکھنے کی بجائے ہم کو اپنی گم کردہ کانوں کے سراغ میں نکلنا چاہیئے۔ جن کی دولت لازوال تھی اور ہمیشہ لازوال رہے گی۔

روشنی کے تم بھی متلاشی ہو اور میں بھی لیکن پھر بھی مجھ میں اور تم میں اختلافِ خیال کا ایک سمندر حائل ہے تم ڈرتے ہو تاکہ غیروں کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں سے اپنا چراغ روشن کر دیا، لکڑی کھینچتے ہو تاکہ انہیں جلا کر ایک نئی انگیٹھی مشتعل کرو لیکن میں روتا ہوں کہ بادشاہ کے لڑکے کے لئے کسی سوداگر کی الماری پر للچائی ہوئی نظر ڈالنا مناسب نہیں میں پوچھتا ہوں تمہاری وہ شمع کیا ہوئی جس کی روشنی سے تمہارے گھر کا کونہ کونہ منور تھا۔

اللہ ہی کے نور سے آسمان و زمین کی روشنی ہے اس کے نور کی مثال ایسی سمجھو جیسے ایک طاق ہے۔ طاق میں چراغ اور چراغ ایک بلور

کی قندیل میں وہ قندیل اس قدر شفاف ہے گویا موتی کی طرح چمکتا ہوا ایک درخشندہ ستارہ - پھر اس چراغ کی روشنی ایک ایسے شجرہ مبارکہ زیتون کے تیل سے ہے جو نہ مغربی ہے اور نہ مشرقی اس کے تیل میں یہ ایک عجیب خاصیت ہے کہ اپنے مشتعل ہونے میں وہ آگ کا محتاج نہیں - آگ اسے نہ بھی چھوئے تاہم وہ آپ سے آپ جل اٹھے گا اس کے نور کا حال کیا کہا جائے کہ وہ نور علیٰ نور ہے - اور اللہ کے ہاتھ میں ہے کہ وہ جس کو چاہے اپنے اس نور کی طرف ہدایت بخشے یہ چراغ کا بیان در اصل ایک مثال تھی اور اللہ لوگوں کے سمجھنے کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے - اور وہ ہر شے کی حالت سے واقف ہے

(۲۴ : ۳۵)

اسلام ایک آخری دین الٰہی تھا جس نے نہ صرف احکام شریعت ہی میں بلکہ حیات قومی کی ہر شاخ میں ہم سب سے آخر اور سب سے بہتر اصول دے دیئے اور دنیا خواہ کتنی ہی بدل جائے لیکن آزمایا جا سکتا ہے - کہ ان اصول کی صداقت کو بدلنے کی ضرورت نہیں "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا" یہی سبب ہے کہ حضرت داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خاتم النبیین فرمایا اور اسی کا نتیجہ ہے - کہ امت مرحومہ کی ہدایت کے لئے ائمہ کرام اور مجددین عظام مامور ہوئے مگر دروازہ نبوت کا بند ہو گیا - ان تمام احادیث صحیحہ کا تفحص کرو جن میں مجدد دین اسلام کے ظہور کی اطلاع دی گئی ہے - اور اس حدیث مشہورہ کو پڑھو جس میں حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کو محدث کے لقب سے یاد فرمایا ہے - ان سب سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ امت مرحومہ کی اصلاح کے لئے

"تناسیں" کا اب سدباب ہے اور صرف "تجدید و احیاء" کا سلسلہ باز رکھا گیا ہے۔ پس آج بھی ہم کو اپنے ہر عمل میں صرف تجدید احکامِ شریعت اور احیاء سنتِ سلفِ صالح کی ضرورت ہے۔ ہم کو اپنے تمام کاموں میں چاہیے کہ گزشتہ محلوں کو زندہ کریں اور اپنے اعمالِ حسنہ کے مٹے ہوئے نشانوں کو ابھاریں۔ ہم کو نئے مقصدوں کی ضرورت نہیں۔ ہم کو نئی صداقتوں کی احتیاج نہیں۔ ہم کو آگے نہیں بڑھنا ہے۔ بلکہ پیچھے ہٹنا ہے۔ ہمارے سامنے صاحبِ خُلقِ عظیم کا اُسوۂ حسنہ موجود ہے۔ ہم اہلِ بیت مطہرہ اور صحابہ کرام کے اعمال کو دیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے پاس قرآن حکیم اپنی ہیئت و حقیقت اصلی میں موجود ہے۔ جب کہ اس کی آیتیں یثرب و بطحا کے ریگستانوں میں اسرار الٰہی سے پردے اُٹھا رہی تھیں۔ اور دنیا کو انسانیتِ اعلیٰ کے اصولوں کا سبق دے رہی تھیں۔ پھر کیا ہے کہ ہم نئے مقصدوں کے متلاشی ہوں اور کیوں نئے اصولوں کی دعوت کی طرف ہمیں بلایا جائے۔ نئے ولولوں اور نئے تماشوں کا بھی ہم نے تجربہ کر لیا اب ہم اُکتا گئے ہیں۔ اور زیادہ تجربے کی ہم میں سکت نہیں۔ ہمیں چھوڑ دو تا کہ اپنی قدیمی وحشت کی ایک ادنیٰ ادا پر تمہاری نئی دلفریبیوں کو قربان کر ڈالیں۔

من و بدل حریف بسی بیجا نشستم زاہد
تو و قطع منازلہا، من و یک لغزش پائے

مثلاً آج کتنے ہیں جو یورپ کے جماعتی اصولِ کار کی تقلید میں صرف انجمنوں کے قائم کرنے کانفرنسوں کی تحریک کرنے اور ان کے بلے بلے اصول و قواعد کے نظام لکھنے میں بڑی بڑی دواتوں کی سیاہی خالی کر دیتے ہیں۔ لیکن آج ہمیں انجمنوں اور باقاعدہ جماعتوں سے کیا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ پس ہمارے اس قدیمی دعوت و تبلیغ کے سلسلے کو زندہ ہونا

چاہیئے۔ جب کہ ہر مسلمان کا وجود ایک انجمن تھا۔ اور ہر آواز اپنے اندر ایک مشن رکھتی تھی۔ جب کہ اسلام وادیٔ حجاز میں ظاہر ہوا اور چین و ہند اور جاوا و سماترا میں اس کے پرستار پیدا ہوئے تو کون سی انجمن تھی اور کون اس کا پریسیڈنٹ اور سکریٹری تھا۔ یہ کیا تھا کہ ایک عرب تاجر تجارت کا مال لے کر سماترا میں جاتا ہے۔ اور ایک پورے مشن کا کام انجام دے دیتا ہے ؟

(۵)

بیا ساقی ز خود آگاہیم دہ — شراب بزم حزب اللّٰہیم دہ
شراب گرم درخشاں ہمچو خورشید — پیالۂ تخت ظل اللّٰہیم دہ
ز جوئے جنت کہ شوقش بر نسیم — ز عشرت گاہِ شاہنشاہیم دہ
دلم تاریک و من سرگشتہ در خود — چراغِ مے درین گمراہیم دہ
خرد جانِ مرا جانکاہ از غم — نجاتِ دل ازیں جانکاہیم دہ
فسونِ عقل فیضی بس دراز است
ازیں داستاں زباں کوتاہیم دہ

قسم ہے اس عصرِ انقلاب اور دورِ تغیرات کی جو پچھلے دور کو ختم کرتا اور نئے دور کی بنیاد رکھتا ہے۔ کہ نوعِ انسانی کے لئے دنیا میں نقصان و ہلاکت کے سوا کچھ نہیں۔ مگر ہاں وہ نفوسِ قدسیہ جو قوانینِ الٰہیہ پر ایمان لائے، اعمالِ صالحہ اختیار کئے، اور ایک دوسرے کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعہ دینِ حق کی وصیت کرتے رہے اور نیز صبر و استقامت کی بھی انہوں نے تعلیم دی (۱۰۳)

یہ ہے جماعت "حزب اللہ" کا مقصد وحید جسے غالباً ہر مسلمان روزانہ نماز میں ضرور پڑھتا ہے۔ اور یہ ہے خلاصہ اس کے پیش نظر اغراض کا جو سورۃ والعصر کی صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے۔ گزشتہ چار صحبتوں میں جو کچھ عرض کر چکا ہوں۔ اس سے بہت زیادہ عرض کرنا تھا۔ مگر مناسب یہ نظر آیا کہ پہلے مختصراً اصل اغراض و مقاصد بیان کر دیئے جائیں ؎

مخاطب اندکے نازک مزاج است سخن کم گو کہ کم گفتن رواج است

گزشتہ مطالب و بیانات سے آپ نے اندازہ کر لیا ہو گا۔ کہ اس عاجز کا مقصد کیا ہے۔

دنیا کی بیماریاں ہمیشہ یکساں رہی ہیں اس لئے ان کا علاج بھی اصولاً ایک ہی ہونا چاہیئے۔ وہ جب کبھی تلاشی ہوتی ہے تو اس کی تلاش اس جستجو سے کبھی مختلف نہ تھی جو جستجو کہ آج ہمیں درپیش ہے۔

ایک ہی چیز تھی جس کی ہمیشہ تلاش رہی۔ ہم بھی آج اسی کو ڈھونڈیں گے جب کہ اسی زمین پر اب سے ہزاروں برس پہلے خدا کے ایک مخلص بندے نے اسی کو درد اور تڑپ کی آواز میں پکارا تھا کہ

خدایا میں نے اپنی قوم کو رات دن حق و ہدایت کی دعوت دی۔ لیکن افسوس کہ میری دعوت کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہ نکلا کہ وہ اور مجھ سے بھاگنے لگے۔ میں نے جب کبھی ان کو پکارا تاکہ وہ تیری طرف رجوع ہوں تو انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں کہ کہیں میری آواز سن نہ لیں اور اپنے اوپر سے کپڑے اوڑھ لئے کہ کہیں میرے چہرے پر نظر نہ

پڑجائے اور ضد اور ہٹ دھرمی میں آکر اکڑ بیٹھے۔ اس پر بھی باز نہ آیا پھر انہیں پکار پکار کر تیرا پیغام پہنچایا اور اس کے بعد بھی ظاہر و پوشیدہ ہر طرح سمجھایا لیکن خدایا با ایں ہمہ سعی دعوت و اصلاح ان سرکشوں نے میرا کہا نہ مانا اور انہیں معبودان باطل کی غلامی کرتے رہے جنہوں نے ان کے مال اور ان کی اولاد کو فائدے کی جگہ اُلٹا نقصان ہی پہنچایا

تو وہ بھی اپنی قوم کو اسی کی تلاش کا پتہ دے رہا تھا۔

جب کہ کالڈیا کے بتخانے میں ایک برگزیدہ نوجوان نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض ادا کیا۔ جب کہ اس نے اپنے ہاتھ میں چھری لی اور اپنے فرزند کو محبت الٰہی کی بےخودی میں دشمنوں کی طرح زمین پر دے ٹپکا۔ جب کہ اس نے دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے اپنے خاندان کو دین الٰہی کی پیروی کی وصیت کی اور کہا ——— دیکھو اللہ نے تمہارے اس دین اسلام کو تمہارے لئے پسند فرمایا ہے۔ پس ہمیشہ اسی پر قائم رہنا اور دنیا سے نہ جانا مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو

تو اس نے بھی اسی کو ڈھونڈھا۔

جب کہ تخت گاہ فراعنہ کے ایک قید خانے میں کنعان کے قیدی نے دین الٰہی کا وعظ کہا اور جب کہ اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ

اے یاران مجلس! بہت سے مالک اور آقا بنا لینا اچھا ہے یا ایک ہی خدائے قہار کے آگے جھکنا۔ تم جو اللہ کو چھوڑ کر دوسرے معبودوں کی پرستش کر رہے ہو تو یہ اس کے سوا کیا ہے کہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے پیشروؤں نے گھڑ لئے ہیں۔ حالانکہ خدا نے تو اس کے لئے کوئی

سند بھی نہیں اے گمراہو یقین کرو کہ تمام جہان میں حکومت صرف اسی خدا
کے لئے ہے اس نے حکم دیا ہے کہ صرف اسی کے آگے جھکو یہی اسلام
کا سیدھا راستہ ہے ۔ لیکن افسوس کہ اکثر لوگ نہیں سمجھتے ۔

تو اس کی نظر بھی اسی کی طرف تھی ۔ اور اسی کی تلاش تھی جس کا وہ سراغ دے رہا تھا ۔

وہ " شاطئ وادی ایمن " اور " بقۂ مبارکہ " کا مقدس چرواہا ۔ جب کہ کوہ سینا کے کنارے " اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ " کی ندائے محبت سے مخاطب ہوا تھا ۔ اور جب کہ ایک ظالم و جابر حکومت کی غلامی سے نجات دلانے والے کے لئے اس نے یکہ و تنہا فرماں روائے عہد کے سامنے حریفانہ کھڑے ہو کر پیشین گوئی کی تھی کہ

اے لوگو ، مجھ کو جھٹلانے میں جلدی نہ کرو ۔ خدا خوب جانتا ہے ۔ کہ کون
شخص اس کی طرف سے سچائی لے کر آیا ہے اور آخر کار کس کے ہاتھ نتیجہ
کی کامیابی آنے والی ہے ۔ یقین کرو کہ خدا کبھی ان لوگوں کو فلاح نہیں
دیتا جو برسر ناحق ہیں ۔

تو وہ بھی اسی تلاش کا اعلان کر رہا تھا اور یہی تلاش تھی جس نے اسے منزل مقصود تک پہنچا دیا تھا ۔

وہ " ناصرہ " کا نوجوان اسرائیلی جو پچھلی کتابوں کی پیشین گوئی کے مطابق آیا تھا تاکہ عہد اسرائیلی کے خاتمے اور دور اسماعیلی کے آغاز کا اعلان کرے اور جب کہ اس نے چلنے سے پیشتر ایک باغ کے گوشہ میں اپنے نادان اور ناسمجھ ساتھیوں سے کہا تھا کہ

میں اللہ کی طرف سے تمہاری طرف بھیجا ہوا آیا ہوں میں کوئی نئی شریعت
نہیں لایا بلکہ میرا کام صرف یہ ہے کہ کتاب توریت کی جو مجھ سے پہلے

آچکی ہے تصدیق کرتا ہوں اور ایک آنے والے رسول کی خوشخبری دیتا
ہوں جو میرے بعد آئے گا۔ اور جس کا نام "احمدؐ" ہو گا۔

تو وہ بھی اسی وادئ جستجو کا ایک کامیاب قدم شوق تھا اور یہی گوہر مقصود تھا جس کے لیے اُس نے اپنے بے عقل ساتھیوں کے جیب و دامن کو بے قرار دیکھنا چاہا تھا۔

اور پھر وہ ظہور انسانیت کبریٰ، وہ مجسمہ نعمت الٰہیہ عظمیٰ، وہ معلم کتاب و حکمت وہ مزکّی نفوس انسانیت، وہ ہادی الی صراط المستقیم، وہ مخاطب انک لعلیٰ خلق عظیم، وہ تاجدار کشور یزداں پرستی، وہ فتح باب اقلیم قلوب انسانی، وہ علم آموز درسگاہ "ادبنی ربی فاحسن تادیبی"، وہ خلوت نشین شبستان "ابیت عند ربی، ھو یطعمنی و یسقینی"، یعنی وہ وجود اطہر و اقدس جس کے لیے دشت حجاز میں ابراہیمؑ خلیل نے اپنے خدا کو پکارا۔ جس کے زمزمیں کی تجلی فاران کی چوٹیوں پہ موسیٰؑ نے دیکھی۔ جس کے عشق میں داؤدؑ نے نغمہ سرائی کی۔ جس کے جمال الٰہی کی تقدیس میں سلیمانؑ اپنے تخت جلال پہ جھک گیا۔ جس کی طرف یوحنا سے پوچھنے والوں نے بے قرارانہ اشارہ کیا اور جس کے لیے ناصرہ کے اسرائیلی نبیؑ نے اپنا جانا ہی بہتر سمجھا کہ وہ اپنے "باپ" سے جو آسمان پہ ہے سفارش کرے اور اس کو جو "آنے والا ہے" جلد بھیج دے۔

غرض کہ جب وہ آنے والا آیا اور خدا کی زمین آخری مرتبہ سنواری گئی تا اُس کی ابدی حکومت و جلال کا تخت بچھے اور پھر اس کے فرمان آخری کا اعلان ہوا۔

اب سے جو انسان احکام اسلامی کی جگہ کسی دوسری تعلیم کو تلاش کرے گا تو
یقین کرو کہ اس کی تلاش کبھی مقبول نہ ہوگی۔ اور اُس کے تمام کاموں کا
آخری نتیجہ نامرادی ہی ہوگا۔

تو وہ بھی اسی کی جستجو میں نکلا تھا جس کی جستجو میں سب نکلے اور قبل اس کے کہ وہ اس کے لئے بے قرار ہو خود اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

اور اے پیغمبر، ہم نے تم کو دیکھا کہ ہماری تلاش میں سرگرداں ہو۔ پس
ہم نے تم کو اپنی راہ دکھلا دی۔

جب کہ یہ حالت تھی تو دنیا بگڑ کر پھر سنوری۔ انسانیت مر کر پھر زندہ ہوئی اور خدا نے اپنے چہرے کو پھر بے نقاب کر دیا۔ وہ جو شام کے مرغزاروں اور یروشلم کے ہیکل کے ستونوں سے روٹھ گیا تھا اب پھر آگیا تا کہ دشتِ حجاز کے ریگستانوں کو پیار کرے اور اپنے راز و نیازِ محبت کے لئے ایک نئی قوم کو چن لے۔ دنیا جو صدیوں سے اس کو بھلا چکی تھی پھر اس کی تلاش میں نکلی اور انسان نے اپنے مقصود کو کھو کر دوبارہ پا لیا۔

غرض کہ دنیا کی حیات ہدایت و سعادت یکسر تلاش و جستجو ہے اور اس نے جب کبھی تلاش کیا پایا۔ اس نے جب کبھی پکارا، اُسے جواب ملا۔ پانی ملنے میں کبھی دیر نہ ہوئی البتہ تشنگی کا ثبوت ہمیشہ مانگا گیا ہے

جمالِ حال شود ترجمانِ استحقاق
دلیلِ آب جگر تشنگی و تشنہ لبی ست

لیکن یہ انقلابِ عظیم جو جمعیتِ انسانی میں ہوا، کس چیز کا نتیجہ تھا؟ یقیناً وہ ایک عطیۂ الٰہی تھی۔ لیکن کن کے اندر سے اٹھی اس جلوہ ریزی کا آفتاب کن کے سیاہ وجود پر چمکا؟ ان کے حق کی نسبت کہا گیا ہے۔ سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ۔ اصل یہ ہے کہ وہ ایک جماعت تھی اور تاریخِ اصلاحِ عالم میں ہر دعوت و انقلابِ اصلاح نے سب سے پہلے جماعت ہی کو پیدا کیا ہے۔ دنیا میں جب کوئی اصلاحی تغیر ہوا ہے تو محض تعلیمات

سے

سے نہیں ہے بلکہ اس جماعت کے اعمال سے ہوا ہے جو ان تعلیمات کی حامل و محافظ تھی۔ وہ صدائیں جو شفق زبانوں سے اٹھتی ہیں ہوا کی منجمد سطح میں تموج پیدا کر سکتی ہیں مگر دلوں کے سمندر میں لہریں پیدا نہیں کر سکتیں۔ یہی سبب ہے کہ دنیا میں جب کبھی مصلحین حق کا ظہور ہوا خواہ وہ ظہور انبیاء و رسل کا تھا۔ جو بمنزلہ اصل ہیں یا ان کے متبعین و مجددین کا جو بمنزلہ فروع و ظل کے ہیں ہمیشہ ان کا پہلا کام یہی رہا کہ انہوں نے اپنی تعلیم و دعوت کا نمونہ ایک جماعت کی صورت میں پیش کیا اور پھر یہ بنیاد جتنی محکم بن گئی اتنا ہی استحکام بعد کی تعمیرات کو حاصل ہوا۔

بے شک تمہارے واسطے اتباع و پیروی کے لئے ایک بہترین نمونہ
اور نصب العین ہے حضرت ابراہیمؑ کی زندگی میں نیز اُن کے ساتھیوں
کی زندگی میں (۶۰ : ۴)

پس اصلاحِ عالم کا یہ آخری ظہور جس نے دینِ الٰہی کو اس کے قدیمی نام "اسلام" کے ساتھ پیش کیا یہ بھی دنیا میں اسی لئے آیا تاکہ ایک جماعت پیدا کرے اور اس نے جماعت پیدا کی۔ یہی جماعت تھی جس کو خدا نے اپنے کاموں کے لئے چن لیا اور اس کے دلوں کو جمال و صفاتِ الٰہیہ کا مسکن بنایا۔ عشقِ الٰہی کی وہ آتش مقدس جس کے لئے نوحؑ نے لکڑیاں چنیں۔ جس کو ابراہیم خلیلؑ نے اپنے دامنِ قربانی سے ہوا دی جس کی چنگاریاں وادئ ایمن کی تاریکی میں چمکیں۔ جس کے شعلوں کے لئے مسیحؑ کے خون نے تیل کا کام دیا اور جو بالآخر جبل بو قبیس کے غاروں میں سراجاً منیراً بن کر بھڑکی اس کے شعلوں سے اس جماعتِ الٰہی نے اپنے دلوں کی انگیٹھیوں کو روشن کر لیا تھا۔ اور یہ انگیٹھیاں گو تعداد میں قلیل اور دنیا کی تاریکی وسیع تھی لیکن جنہیں سے دعوت

و اصلاح کے وہ لاتعداد وہ نخصی چراغ روشن ہوئے جن میں سے ایک ایک زمین کے بڑے بڑے رقبوں اور انسانوں کی بڑی بڑی آبادیوں میں آفتاب جہانتاب بن کر ظلمت رُوئے عالم ہوا۔

یہی وہ خدا کی روشنی تھی جو اس کی جماعت میں سے ہو کر چمکی اور جس کو خدا نے نوراللہ کے لقب سے یاد کیا۔ میرا مقصود تاریخ دعوت اسلامیہ کی اس اوّلین جماعت سے ہے جس نے حضرت ابراہیم خلیلؑ کے ساتھیوں کی طرح محمدؐ رسول اللہ کا ساتھ دیا اور اتباع اعمال نبوت کے ذریعہ خود اپنے اندر خصائص و برکات نبوت پیدا کر لیے۔

محمد رسول اللہ اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں دشمنان حق کے مقابلے میں نہایت سخت لگ آپس میں نہایت رحم دل۔ ان کو تم ہمیشہ اللہ کے آگے عاجز اور رکوع و سجود میں دیکھو گے کہ اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طالب ہیں۔ ان کی پیشانیوں پر کثرت سجود کی وجہ سے نشان بن گئے ہیں (۲۹ | ۴۸)

یہی جماعت تھی جس کے الٰہی کاروبار کو حضرت مسیحؑ نے "آسمان کی بادشاہت" سے تعبیر کیا۔ کیونکہ وہ دنیا کو قوائے شیطانیہ کے تسلط سے نکالنے والی تھی اور اسی کے اعمال حقہ کے ذریعہ خدا کا تخت عدل و صلاح بچھنے والا تھا۔ وہ ایک بیج تھا۔ جو بوتے وقت گو حقیر اور بہت چھوٹا تھا۔ پر بار آور ہونے کے بعد ایک درخت وسیع و تناور بننے والا تھا اسی لئے انجیل نے اس کو اس تمثیل میں بیان کیا کہ

"آسمان کی بادشاہت رائی کے دانے کے مانند ہے جسے ایک شخص نے لے کر اپنے کھیت میں بو دیا۔ وہ سب بیجوں سے چھوٹا ہے پر جب اُگتا ہے تو سب

ترکاریوں سے بڑا ہوتا ہے اور ایسا درخت ہوتا ہے۔ کہ ہوا کے پرندے اُس کی ڈالیوں پر بسیرا لیتے ہیں"

دیکھو آسمان کی بادشاہت کا یہ بیج جو بویا گیا فی الحقیقت کیسا حقیر تھا۔ ایک جماعت قلیل جس کو نہ ساز و سامان دنیوی حاصل تھا اور نہ کسی طرح کی دنیوی ریاست وعزت۔ نہ ان کے پاس آلات جنگ تھے اور نہ کوئی مسلح فوج۔ چند فقراء و مساکین تھے۔ جنہوں نے دعوتِ الٰہی پر لبیک کہا اور آسمان کے لئے زمین والوں سے اپنا رشتہ قطع کر دیا۔ اُنہوں نے تعلیم الٰہی کو اپنا دستور العمل بنایا۔ اُنہوں نے ہر اس لفظ کو جو خدا کے مقدس پیغامبر کی زبان سے نکلا اپنے اعمال و افعال کے اندر محفوظ کر لیا۔ اُنہوں نے اس "اسوہ حسنہ" کی زندگی کو اپنا نصب العین بنایا جو گو انسان تھا مگر اپنے ہر فعل کے اندر ایک خدا نما جلوہ رکھتا تھا۔ وہ ایک عملی نمونہ لے کر دنیا میں بڑھے اور آسمان کی بادشاہت کا مقدس تخم جس کی منادی شام کے مرغزاروں میں ہوئی تھی۔ حجاز کے ریگستانوں میں نشو و نما پانے لگا۔ تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا کہ ایک سرسبز و شاداب درخت نے اپنی ڈالیوں سے کرۂ ارضی کو چھپا لیا۔ ہوا کے پرندوں نے اس کی شاخوں میں نشیمن بنائے اور زمین کی مخلوقات نے اس کے سائے میں پناہ لی۔

یاد رکھو کہ وہ خدا جو مکان و زمان سے منزّہ ہے اپنے بسنے کے لئے گھر چاہتا ہے۔ اس کے بسنے کے لئے چاندی اور سونے کا محل اور صندل و آبنوس کا تخت مطلوب نہیں جس میں لعل و الماس کے ٹکڑے جڑے ہوں۔ وہ ان دلوں کا طالب ہے جن میں اس کے درد محبت کے زخموں سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہوں۔ زمین کی شاندار آبادیاں پہاڑوں کی سر بفلک چوٹیاں سمندروں کی ناپید اکنار موجیں صحراؤں کے

وسیع میدان یہ سب اس کے لئے بے کار ہیں۔ بادشاہوں کے عظمت ہیبت و جلال لعل و جواہر سے لبریز خزانے بڑے بڑے گنبدوں اور ستونوں کے عظیم الہیبت ایوان وغیرہ اس کا گھر نہیں بن سکتے۔ اس کے لئے فقیروں اور خاک نشینوں کی ایک ایسی جماعت چاہیئے جن کے دل ٹوٹے ہوئے۔ جن کے جگر جلے ہوتے اور جن کی آنکھیں خون بار ہوں۔ وہ کہ آبادیوں کی رونق صحراؤں کی فضا پہاڑوں کی بلندی اور ملکوت السموات کی بوقلمونی اسے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی۔ دلوں کی اجڑی ہوئی بستیوں اور ٹوٹی پھوٹی دیواروں کو اپنا کاشانۂ وصال بناتا ہے۔ اور اس گھر کے سوا اور کوئی جگہ اُسے پسند نہیں۔

ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی۔ لیکن سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس بارِ گراں کے متحمل نہ ہو سکے۔ لیکن انسان آگے بڑھا اور اسے بے تامل اُٹھا لیا کچھ شک نہیں کہ وہ اپنے اُوپر سخت ظلم کرنے والا اور سرگشتۂ نادانی رہا ہے۔

غیر انساں کسش نہ کرد قبول
زانکہ انساں ظلوم بود و جہول

پس اگر تم اس کے طالب ہو تو ایک جماعت پیدا کرو تاکہ اس کے جلال و تمدیت کا وہ آشیانہ بنے۔ دنیا کے اندر تبدیلی پیدا کرنا آسان نہیں ہے دنیا میں مادی انقلابات ہمیشہ سلطنتوں کے تغیرات اور خونریز جنگوں کے ظہور سے ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن غور کرو کہ ان میں کا ہر چھوٹے سے چھوٹا انقلاب بھی کیسی

گراں قدر قیمت رکھتا ہے۔ قرنوں کی قرنیں فکر و تدبیر میں گزر جاتی ہیں۔ خزانوں کے کے خزانے لٹا دیئے جاتے ہیں۔ کروڑوں گنیوں کے قرض لیے جاتے ہیں۔ فوجوں کے سمندر طوفان میں آتے ہیں قیمتی سے قیمتی آلات و اسلحہ تقسیم کیے جاتے ہیں بے شمار انسانوں کی قربانیاں تڑپتی اور خون کی ندیاں بہتی ہیں۔ عورتیں بیوہ بچے یتیم والدین زندہ در گور ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ تب کہیں جا کر ایک چھوٹا سا انقلاب تکمیل کو پہنچتا ہے۔ پھر وہ بھی یقینی نہیں۔ اکثر کوشش رائگاں اور اُمیدیں پامال بھی ہو جاتی ہیں۔

جب دنیا کے مادی انقلاب کا یہ حال ہے جو صرف حکومت کے تخت بدلنا چاہتے ہیں تو پھر اس روحانی اور قلبی انقلاب کو سوچو جو زمین کی سطح اور انسان کے جسموں کو نہیں بلکہ روحوں اور دلوں کے عالموں کو پلٹ دینا چاہتے ہیں اور اعمال و خصائل کے اندر تبدیلی کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ پھر ان انقلابات کے لیے کیا محض انسانی قوت و تدبیر اور محض چند اخلاقی رسمی اصولوں کو پکار دینا ہی کافی ہو سکتا ہے ـــــ تم ایک مرتبہ خود اپنے ہی نفس کو آزما دیکھو جس پر تمہارے ارادے کو پوری قدرت ہے۔ کیا ایک چھوٹی سے چھوٹی تبدیلی بھی اپنے نفس و عمل کے اندر تم آسانی سے پیدا کر سکتے ہو

پھر جب تم ایک نفس کی تبدیلی پر قادر نہیں تو ان کروڑوں دلوں کو کیونکر بدل سکتے ہو۔ جن پر صدیوں کی پرورش یافتہ و محکم اعتقادات و اعمال کی حکومتِ قاہرہ اور نفس کا تسلط جابرہ قائم ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان جسم کو پارہ پارہ کر سکتا ہے۔ پر دل کو نہیں بدل سکتا۔ زمین کی خشکی و تری کا نقشہ ممکن ہے۔ وہ بدل دے لیکن قلب و روح کا ایک گوشہ

بھی اس کے پھیرے نہیں پھر سکتا۔ وہ تعلیم دے سکتا ہے اور اصلاح اصلاح پکار سکتا ہے لیکن نہ تو فتح مندی کا بیج اس کے دامن میں ہے اور نہ بارآور کرنے والی قوتِ نشوونما اس کے قبضہ میں۔ یہ صرف اسی حکیم و قدیر کے دستِ قدرت کا کام ہے جو مقلب القلوب اور محول الاحوال ہے اور جو ہمیشہ اپنے کاروبار قدرت کی نیرنگیاں دکھاتا اور اپنی عجائب فرمائی پر حیرانی و تحیر کی بخشش کرتا ہے۔ پس اگر تم ارواح و قلوب کے عوالم کو منقلب کر دینا چاہتے ہو تو یاد رکھو کہ جب تک تم انسان ہو ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ انسانوں کو اس کی قدرت نہیں دی گئی۔ البتہ اگر تم اپنے اندر قوتِ الٰہی پیدا کرو اگر اپنی جماعت کے اندر اس کا ذرائے تحقیق کا گھر بنا لو یعنی از فرق تا بہ قدم اپنے تمام اعمال و خصائل میں ایک پیکر اخلاقِ الٰہی بن جاؤ تو پھر تمہارے کام خود تمہارے کام نہ ہوں گے۔ جن کے لئے انتظار حسرت اور ناکامی ہو بلکہ اس قادر و مقتدر کے کاروبار ہوں گے جس کا دامنِ عزوکبریائی اس سے بہت اقدس و منزہ ہے۔ کہ آلودہ ناکامی و تلوثِ حسرت و افسوس ہو۔

پھر جب وہ کہ سب کا مالک ہے تم میں ہوگا تو تم کو بھی اس کی ملک کی ہر شے پر قدرت ہو جائے گی۔ تمہاری صدائے دعوت ایک سیلاب انقلاب ہوگی تمہاری زبانوں سے جو کچھ نکلے گا، وہ دلوں اور روحوں پر منقش ہو جائے گا۔ اور پھر نہ زمین کا پانی اُسے دھو سکے گا۔ اور نہ آسمان کی بارش اُسے محو کر سکے گی۔ تمہاری تعلیم بیج اور پھل دونوں اپنے ساتھ لائے گی اور تم گو چپ رہو گے لیکن تمہاری خاموشی کی ایک ایک صدائے عمل پر کروڑوں ہستیاں اپنے دلوں کو ہتھیلیوں پر رکھ کر پیش کش کریں گی۔ تمہاری زبانوں سے جب ساقیِ الٰہی کی صدائے دعوت اُٹھے گی۔

تو خدا کی آواز کو سن کر اس کی کون مخلوق ہے۔ جو لبیک نہ کہے گی تم جس طرف سر اٹھاؤ گے
دلوں کو سربسجود اور روحوں کو معترف عجز و نیاز پاؤ گے۔

تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ بہتر سے بہتر ارادے اکارے ذہنوں میں
اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات ہماری فکروں میں اور پاک سے پاک تعلیمات ہماری زبانوں پر ہیں
مگر نہ تو ارادوں میں قبولیت ہے نہ خیالات میں فعالیت اور نہ تعلیمات میں اثر
جس دنیا کے بڑے بڑے وسیع ٹکڑوں کو صرف ایک زبان کی دعوت نے مضطر کر دیا تھا
آج اسی دنیا میں بڑی بڑی جماعتوں کی صد ہا صدائیں ایک نفس واحد کی خدمت جامد و
ساکن میں حرکت پیدا نہیں کر سکتیں۔ یہی اسلام کی صدائے دعوت اور یہی اس کی کتاب
ہدایت کی صدائے اصلاح اس وقت بھی تھی جب کہ اس کے ایک داعی نے ایک ایک
اقلیم کو مسخر کر لیا تھا اور یہی اب بھی ہے کہ خود اپنے ہی دلوں میں تپش محسوس نہیں ہوتی۔
ایک ہی علت کے دو مختلف نتیجے پیدا نہیں ہو سکتے۔ اصل یہ ہے کہ دنیا کا
سر انقلاب و تغیر ہمیشہ صدائے عمل کے آگے جھکا ہے نہ کہ صدائے قول کے سامنے۔
خلق حق ہر تعلیم کے لئے "نمونہ" ہے اور جب تک مصلح اپنے اندر اپنی اصلاح کا
نمونہ نہیں رکھے گا، اس کی تعلیم دلوں کی قبولیت اور روحوں کی اطاعت سے محروم
رہے گی۔ آگ جب جلتی ہے تو سب سے پہلے جلانے والے کو گرم کرتی ہے۔
اگر خود تمہارے اندر آگ موجود ہے تو اس مجمر سوزاں کو جہاں کہیں بھی رکھو گے
خود بخود ہر طرف گرمی پھیل جائے گی۔ گرمی آگ کے شعلوں سے نکلتی ہے۔ برف کی سل
سے پیدا نہیں ہو سکتی۔

اسلام نے ایک جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پیدا کر دی تھی جو تعلیم کا ایک صحیح ترین

عملی نمونہ اپنے اندر رکھتی تھی اور ان میں کا ہر فرد اس اسوۂ حسنہ کی قوت سے ایک ایک اقلیم کی تسخیر اپنے قبضۂ اقتدار میں رکھتا تھا ان کے اعمال کے اندر تعلیمات الٰہیہ کی مقدس انگیٹھی شعلہ فروز تھی اس لئے وہ جہاں جاتے تھے آتشکدۂ اثر اپنے ساتھ لے جاتے تھے

## ۶

غیرِ من در پسِ ایں پردہ سخن سازے ہست
رازِ در دل نتواں داشت کہ غمازے ہست

زخمِ کاریست صراحی و قدح بر مپسند
نیم بسمل شدہ بر سرِ پروازے ہست

بلبلاں روز گلستاں بہ شبستاں آرند
کہ دریں کنجِ قفس زمزمہ پردازے ہست

عشق بازیم بہ معشوق خرابے انداخت
زاں نیازیم کہ با اوست بخود نازے ہست

گدایاں صفت شکستاں قصد ضعیفاں نکنند
کہ دریں قافلہ کلہے قدر اندازے ہست

تو چہ دانی کہ ایں نغمہ بخود مے گویم
گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

دی نظیری نہ بیدست کہ امروز رود
ہمتے را بود انجام کہ آغازے ہست

آج دنیا پھر تاریک ہے، وہ روشنی کے لئے پھر تشنہ ہے، وہ پھر سو گئی ہے۔ اس کا وہ پرانا دکھ جس کے علاج کے لئے خدا کے رسولوں نے آہ وزاری کی اور جس کو چھٹی صدی عیسوی میں اللہ کے ہاتھوں سے آخر مرہم نصیب ہوا آج پھر تازہ ہو گیا ہے جو تاریکی چھٹی صدی عیسوی میں جہالت نے پھیلائی تھی جب کہ اسلام کا ظہور ہوا تھا، ویسی ہی تاریکی آج تہذیب و تمدن کے نام سے پھیل رہی ہے۔ جب کہ اسلام اپنی غربت اولیٰ میں مبتلا تھا۔

اگر اس زمانے میں دنیا کی سب سے بڑی تاریکی بُت پرستی تھی تو اس کی جگہ آج

ہر طرف نفس پرستی چھا گئی ہے۔ پہلے انسان پتھر کے بتوں کو پوجتا تھا۔ اب خود اپنے تئیں پوجتا ہے خدا کی پرستش اس وقت بھی نہ تھی اور اس کے پوجنے والے آج بھی نہیں ہیں دنیا کی وہ کون سی بیماری ہے جو آج پھر عود نہیں کر آئی ہے۔ پہلے وہ پتھر کی چٹائی پر بیماری کی کروٹیں بدلتی ہوگی۔ اب چاندی اور سونے کے پلنگ پر لیٹ کر کراہتی ہے لیکن بیمار کے بستر بدل جانے سے بیمار کی حالت نہیں بدل سکتی۔

جنسی اور نسلی تعصبات کروڑوں طاقت ور انسانوں کو اپنا شکار بنائے ہوئے ہیں ضعف اور کمزوری سے بڑھ کر قوموں اور ملکوں کے لئے کوئی جرم نہیں۔ ہر قوم جو طاقت رکھتی ہے خدا کی تمام دنیا کو صرف اپنے ہی لئے سمجھتی ہے۔ اور اس کے کمزور بندوں کے لیے عدالت کے ایک جج کی طرح موت کا فتویٰ صادر کر دینے میں بالکل بے باک ہے۔ حق اور عدالت کے الفاظ لفظاً جس قدر زیادہ دُہرائے جا رہے ہیں معناً اتنے ہی متروک ہو گئے ہیں۔ اور نوعِ انسانی کی مساوات و اخوت کی حقیقت قوت کے زور اور طاقت کے ادعا سے پامال ہے۔

انسان لہو و لعبِ حیات اور غرورِ زخارفِ دنیوی کے نشہ سے شاید ہی کبھی اس درجہ بدمست ہوا ہوگا۔ جیسا کہ اس وقت ہو رہا ہے۔ اس کی معصیت پرستی قدیمی ہے اور شیطان اسی وقت سے موجود ہے جس وقت سے کہ انسان ہے۔ تاہم معصیت کی حکومت اتنی جابر و قاہر کبھی بھی نہ ہوئی تھی اور شیطان کا تخت اس عظمت و دبدبہ سے کبھی بھی زمین کی سطح پر نہیں بچھایا گیا تھا جیسا کہ اب قائم و مسلط ہے۔ یہ سب کچھ جہالت کے سائے میں نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ علم و مدنیت کے گھمنڈ میں ہو رہا ہے۔ بیماری وہی ہے۔ جس نے خاک و گرد پر دُنیا کو لٹایا تھا۔ البتہ اب وہ سنہری پلنگ پر لیٹ گئی ہے

اور موتیوں کی مہری کے پردے چار طرف گرا دیے گئے ہیں

پس آج وقت آگیا ہے کہ اسلام پھر ایک مرتبہ اپنے اس فرض کو دہرائے جو وہ ایک بار انجام دے چکا ہے اور مسلمان اپنی اصلاح خود اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے کریں تاکہ ان کی درستگی سے تمام عالم درست ہو اور چشمہ کی روانی سے تمام کھیت سرسبز ہوجائیں۔ اسلام کا مشن ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ دنیا جس قدر اس کی تعلیم کی پہلے محتاج تھی اس سے کہیں زیادہ آج ہے۔ اس کو اپنے امن و نظام کے لئے اپنی عدالت وصداقت کے قیام کے لئے اپنی سفاکیوں اور بے رحمیوں کے ازالے کے لئے اپنی صلح عام اور امنیت عمومی کے ظہور کے لئے ... اصلاح انسانیت اور استیصال سبعیت و بہیمیت کے لئے اور سب سے آخر یہ کہ خدا کے ٹوٹے ہوئے رشتے کو پھر جوڑنے کے لئے صرف اسلام ہی کی ضرورت ہے۔ اسلام کے فرزند خود اسلام سے بے نیاز ہوگئے ہیں مگر دنیا بے نیاز نہیں ہو سکتی۔!

باوجود اعلان ختم سخن کے میں نے پچھلی صحبتوں کی بہت سی باتیں دہرائیں اور بہت سی نئی باتیں بھی کہیں یہ اس لئے تھا تاکہ اس نقطۂ کار کو تمہارے ذہن نشین کر سکوں کہ جب تک اصلاح عالم کی ان الٰہی سنتوں کے ماتحت ہم ایک جماعت پیدا کریں گے جو دنیا میں ہمیشہ تاریکیوں اور گمراہیوں کے انتہائی دوروں میں ظاہر ہوئے ہیں اور جب تک ہماری کوشش انسانی جماعتوں اور انکی آرائیوں کی جگہ خدا کے رسولوں اور نبیوں کے اعمال سے نسبت نہ پیدا کریں گی اس وقت تک ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمارا وجود نہ خود اپنے لئے مفید ہو سکتا ہے نہ دنیا کے لئے۔

پس ان تمام راست باز روحوں کے لئے جو دین الٰہی کی غربت پہ کڑھتی ہیں

"حزب اللہ" کی دعوت ایک پیامِ الٰہی ہے جس کا منشاء یہ ہے۔ کہ مومنین مخلصین اور مسلمین قانتین کی ایک جماعت پیدا ہو جو اپنے تئیں "حزب اللہ" یعنی مومنین صادقین کہلانے کی اہل و مستحق ثابت کریں سے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر خدا اسے اپنے کاموں کے لئے اسی طرح چن لے گا۔ جیسا کہ ہمیشہ اس نے چُنا ہے اور اسے وہ نسبت نبوت و صدیقیت حاصل ہو جائے گی جو ماموران الٰہی کے متبعین کو فنا، اتباع و طاعت کے وسیلے سے حاصل ہوتی ہے اور جس کو لسان الٰہی نے مقام "معیت" سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن ایسا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ کامل خلوص اور سچی قربانی کے ساتھ خدا کے چند مخلص بندے اس کے نام پر اپنے تئیں عام لوگوں سے الگ کریں اور خدا اور اس کے سچے مومنوں میں عہد و میثاق اسلام کی ایک مرتبہ پھر تجدید ہو جائے وہ گو ابھی عمل میں ناقص ہوں۔ لیکن ضرور ہے کہ تلاش و تشنگی میں کامل ہوں۔ کچھ ضرور نہیں کہ ان کی تعداد زیادہ ہو کیونکہ دنیا میں تعداد نہیں بلکہ ہمیشہ تنہا صداقت کام کرتی ہے۔ اور ایک ہی سچے موتی کا ہار میں ہونا اس سے بہتر ہے کہ کانچ کے چمکیلے ٹکڑوں کا پورا ہار بنایا جائے۔ ہاں وہ جماعت خواہ کتنی ہی قلیل و اقل اور عزت و شوکتِ دنیوی کے اعتبار سے کیسی ہی ذلیل و اذل ہو، پر ضرور ہے کہ اس کا ظاہر جتنا حقیر ہو اتنا ہی اس کا باطن عزیز و جلیل ہو۔ اس کے چہرے گردِ ہلاکت سے سیاہ، پر دل نورِ صداقت و حق پرستی سے تابندہ و درخشاں ہوں۔ اس کے جسم پر پھٹے ہوئے کپڑے ہوں مگر دوشِ ہمت پر تاج و تختِ حکومت کی مخمل چادروں سے بھی زیادہ قیمتی ردائیں پڑی ہوں۔ وہ پہاڑوں کی چٹانوں سے بڑھ کر محکم ارادہ اور لوہے کے ستونوں سے زیادہ مضبوط ہمت لے کر اٹھے اور بیک دفعہ و بیک دم محسوس کرے کہ اس کے پاس زندگی کی

قربانی میں سے جو کچھ تھا وہ اب اس کا نہ رہا بلکہ اسلام اور خدا کے اسلام کے سپرد ہو گیا۔ وہ مال و منال اور اہل و عیال جن کی محبت کی زنجیریں اس کی رگِ جاں سے بندھی ہوئی ہیں خود اس کا دل اندر سے پکار اٹھے کہ راہِ حق میں ان کی بندش کچے تاگے سے بھی کمزور ہے۔ اگر خدا تک پہنچنے کے لئے ان کو توڑنا ضروری ہو تو ایک ہی جھٹکے میں پارہ پارہ ہو سکتی ہیں ؎

آں کس کہ ترا خواست جاں را چہ کند | فرزند و عیال و خانماں را چہ کند
دیوانہ کنند ہر دو جہانش بخشی | دیوانۂ تو ہر دو جہاں را چہ کند

اگر تمہارے باپ تمہارے فرزند تمہاری بیویاں تمہارا خاندان تمہاری وہ دولت جو تم نے کمائی ہے۔ وہ کاروبارِ دنیوی جس کے نقصان کا تمہیں ہر وقت اندیشہ لگا رہتا ہے۔ وہ مکان و جائداد جو تمہیں بہت محبوب ہیں۔ غرض کہ یہ تمام چیزیں اگر تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں صرف قربت کرنے سے زیادہ محبوب و عزیز ہیں تو پھر خدا کی راہ سے ہٹ جاؤ یہاں تک کہ اسے جو کچھ کرنا ہے کر گزرے۔ وہ اپنے کاموں کے لئے تمہارا محتاج نہیں ہے۔ اور اس کی ہدایت ان کے لئے نہیں ہے۔ جن کے اندر ایمان کے ایثار و قربانی کی جگہ فسق کی نفس پرستی بھری ہوئی ہے (۹: ۲۴)

پس اگر یہ سب کچھ تم کر سکے اور خدا کی راہ میں قربانی کے اس جانور کی طرح زمین پر گر گئے جس کے لئے چھری تیز کی جا رہی ہو تو میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ اس آسمان کے نیچے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو خدا کی راہ میں قربان ہونے

والوں کے حکم سے باہر ہو۔ جس کے عنقائے حریت کی تلاش میں تم سرگرداں ہو مگر ہاتھ نہیں آتا۔ وہ اور سب چیزیں جو تم چاہتے ہو خود بخود تمہارے پاس آ جائیں گی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان فخارت کی کیا ہستی ہے وہ مقصود و مطلوب اعلیٰ جو تمہارا اصل نصب العین ہے مگر جسے تم بھولے ہوئے ہو۔ وہ بھی تمہیں خود ڈھونڈے گا۔ تاکہ تمہارے سامنے نمایاں ہو اور تمہاری امانت تمہارے سپرد کر دے۔

پھر تمہاری زبان سے جو کچھ نکلے گا اللہ کے فرشتے اُسے اپنے نورانی پروں پہ اُٹھا لیں گے اور تم جب کبھی پکارو گے فراز و نشیبوں کی ارواح ساری تمہاری صداؤں کو اپنی آغوش میں لے لیں گی۔ تاوں کی جگہ زمین پہ گر کر ضائع نہ ہوں اگر زمین کے بسنے والے تمہارا ساتھ دینے سے انکار کر دیں گے تو یقین کرو کہ خدا اپنے ملائکۂ مومنین اور کروبیانِ مقربین کو اُتارے گا تاکہ وہ تمہارے پیچھے پیچھے چلیں۔ اور اگر ضرورت ہوئی تو وہ ہوا کے پرندوں اور دریا کی موجوں پہاڑوں کی چوٹیوں اور درختوں کی ڈالیوں کو حکم دے گا کہ تمہاری سچائی اور راست بازی پہ گواہی دیں۔

عزیزانِ ملت جب کہ تمہارے اعمال کے اندر قرآن کی رُوح جاری و ساری ہو جائے گی تو پھر تم خدا کے کلام کے حامل ہو گے۔ اور خدا کا کلام بہت سے انسانی دلوں کو جو گوشت کے ریشوں سے بنے ہیں نرم نہ کر سکے مگر میں تم سے سچ سچ آسمانوں اور زمینوں کے مالک کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جس طرح مجھے اپنے وجود کا یقین ہے بالکل اسی طرح اس کا بھی یقین ہے کہ اس میں وہ قدرت ہے کہ اگر وہ چاہے تو پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا دے اور سمندروں کی موجوں پر اپنا تخت بچھا دے۔

اس میں شک نہیں کہ میری تمہید طویل اور انتظار کا زمانہ منتظروں پر شدید تھا۔ تاہم میری طبیعت کسی طرح راضی نہ ہوئی کہ اپنے دل کے تمام جذبات ظاہر کئے بغیر کسی کو اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دوں پھر یہ بھی تھا کہ اس ضمن میں ارادوں کے استقلال اور طلب کی صداقت کے لئے بھی ایک ابتدائی آزمائش تھی جو لوگ چند دنوں تک سماع مطلب کا انتظار نہیں کر سکتے۔ وہ آگے چل کر خطرات سفر کے لئے کیونکر مستعد ہو سکتے ہیں؟ لیکن اب کہ میں اپنی تمہید ختم کر چکا ہوں اور میری آرزوئیں بے نقاب اور میری خواہش غیر مستور ہے تو ہر شخص کو موقع حاصل ہے کہ اپنے دل سے پوری طرح سوال و جواب کر لے اور کل کے لئے کوئی بات سوچنے اور سمجھنے کی اٹھا نہ رکھے اس سفر کا ارادہ خدا نے میرے دل میں ڈال دیا ہے میں اٹھا ہوں اور اب چلوں گا میرا چلنا اٹل ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ حرکت مقدر ہو چکی ہے۔

میرے پاؤں میں سب سے بوجھل زنجیر اپنے نفس اور اس کی ہوا پرستی کی ہے جس کے ولولوں اور چھپی ہوئی معصیت پرستی کے طوفان میں ہمیشہ موجیں اٹھتی رہتی ہیں اور میرے ارادہ کو تہ و بالا کر دینا چاہتی ہیں اس کے بعد اپنے وجود سے باہر نفسِ انسانی کے فتنہ ہائے ابلیسی کے بند و علائق ہیں جو گو بہت سے ٹوٹ چکے ہیں۔ لیکن جتنے باقی ہیں وہ بھی کم نہیں اور ایسے سخت ہیں کہ بعض اوقات انہیں توڑنے کی کوشش کرتے کرتے تھک جاتا ہوں اور قریب ہوتا ہے کہ میری انگلیوں سے خون بہنے لگے

ہزار رخنہ بدام و مرا بہ سادہ دلی — تمام عمر باندیشۂ رہائی رفت

میں اکثر راہ کی مشکلوں سے بے خبر نہیں ہوں لیکن ان سختیوں ہی کے اندر اپنے نام کی پکار بھی پاتا ہوں۔ بارہا ایسا ہوا کہ نفس کی شرارتوں نے کانوں میں انگلیاں

ڈالیں اور دل کی غفلت نے خوب شور مچایا تا کہ اس آواز کو نہ سن سکوں اور اس کی طرف سے غافل ہو جاؤں۔ ایسا بھی ہوا کہ دن پہ دن اور راتوں پہ راتیں اسی کش مکش میں گزر گئیں اور مدت کے افسردہ ولولہ ہائے معیت یکایک زندہ ہو کر اُٹھ بیٹھے تاہم یہ وقت بھی گذر گیا اور کان لگا کر غور کیا تو بند ہونے پہ بھی ایک صدا تھی جو اس کے اندر گونج رہی تھی ؎

تو مپندار کہ ایں زمزمہ بے چیزے ہست

گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

میں درمیان میں اپنی پکار بلند کر کے پھر چپ ہو گیا تھا کیونکہ جب میں نے اپنی جانب دیکھا تو معلوم ہوا کہ ابھی چند دنوں اور اپنی آزمائش کی ضرورت باقی ہے۔ اس راہ میں دعوت دینے کے لئے مقدم شرط یہ تھی کہ میں خود بھی اس طرح تیار اور آمادہ ہو بیٹھوں کہ جس دن آغازِ سفر کا اعلان کروں اس دن سب سے پہلے خود اپنے پاؤں کو تمام زنجیروں سے خالی دیکھوں۔ پس میں اپنی فکروں میں غرق ہو گیا۔ اور جس قدر زمانہ توقف کا خدا کو منظور تھا اس عالم میں بسر ہو گیا۔ لیکن مجھے نظر آیا کہ ایسا ہونا ممکن نہیں پانی اتنے اونچے تک پہنچ گیا ہے کہ اب دریا سے بھاگنا محال ہے اور قریب ہے کہ مدت کے بھاگے ہوئے غلام کے پاؤں میں آخری مرتبہ ایک ایسی بوجھل زنجیر ڈال دی جائے کہ پھر کبھی بھی اس کے پاؤں اس چوکھٹ سے باہر نہ نکل سکیں ؎

غلامِ حافظ ازاں زلف تابدار مباد      کہ بستگانِ کمندِ تو رستگار انند

الحمد للہ کہ اللہ کی توفیق رفیق نے مجھے نہ چھوڑا اور جس کو وہ چھوڑ دے تو اس کا پھر کون ہے ؎

تو گر بہم زنی سودائے دل، بارسے زبانی ہائس

مرا سرمایۂ دنیا و دیں نابود سے گردد

ہیں اب بہ ہمہ وجوہ مستعد سفر ہوں اور ہمرہان سفر کے لیے صلائے عام ہے

مردانہ تمام کن دستے بدو عالم زن — فصلے کہ ہمی بہ نہ نقشے کہ زنی کم زن

ہر دم چو فلک بعثت از پردہ بروں آرد — ایں شعبدہ یکسو نہ دیں معرکہ برہم زن

گر مہر نہی بر دل از شوق پیاپے نہ — ور نقل زنی بر لب از رطل دمادم زن

تو بہر چہ خاموشی کز نقل نیندیشی — من پاس گہر دارم غواص نیَ، دم زن

ایماں ز یقیں خیزد و ز ہر چہ بہ تشکیک یابی — در آتش حرماں بیں یا بر محکِ غم زن

بینائی جاں خواہی شمشیر تبارک زن — آگاہی دل جوئی الماس بہ مرہم زن

مومن نتواں گفتن عاشق کہ مجاہد نیست

رو بوسہ چو سربازاں بر طرۂ پرچم زن

# حجتِ ابراہیمی

یہ مضمون مولوی عبدالحق صاحب خیر آبادی کے ایک استفسار کا جواب ہے جو انہوں نے حضرت ابراہیمؑ اور نمرود کے مکالمہ کے بارے میں کیا تھا۔

انہیں تجسس یہ تھا کہ جب حضرت ابراہیم نے نمرود کے خدائی دعویٰ کو توڑنے کے لئے یہ کہا کہ میرا پروردگار وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ نمرود خاموش نہ ہوا اور کہنے لگا یہ تو میں بھی کر سکتا ہوں جسے چاہوں مار دوں جسے چاہوں زندگی بخش دوں تو دوسرے جواب پر کہ اچھا اگر ایسا ہی ہے تو خدا ہمیشہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تم مغرب سے نکال دکھاؤ وہ کیوں ہکا بکا رہ گیا۔

مولوی صاحب نے اس سلسلہ میں بعض کتب متداولہ سے بھی راہنمائی حاصل کرنا چاہی مگر تشفی نہ ہوئی۔ آخر مولانا آزاد نے ان کی دست گیری فرمائی۔

(۱) قرآن حکیم کے مطالعہ و تدبر میں آپ کو جو مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ وہ اس وقت تک پیش آتی رہیں گی جب تک کہ اس بارے میں چند بنیادی اصول واضح نہ

ہو جائیں گے یہ موقع تفصیل و اطناب کا نہیں۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ صدر اول کے بعد سے قرآن حکیم کے فہم و تدبر کی راہیں دو ہو گئی ہیں۔ ایک قرآنی ہے دوسری غیر قرآنی۔

قرآن کے فہم و تدبر کے لئے غیر قرآنی طریقہ کیونکر ہو سکتا ہے ممکن ہے کہ اس پر آپ کو تعجب ہو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ معاملہ فکر انسانی کے عجائب تصرفات میں سے ہے، مگر ایسے تصرفات اس کثرت سے ہو چکے ہیں کہ انہیں عجیب سمجھتے ہوئے بھی ہمیں متعجب نہ ہونا چاہیئے۔

قرآنی طریقہ سے مقصود قرآن کے مطالعہ و فہم کا وہ طریقہ ہے جو تمام تر قرآن پر مبنی تھا۔ قرآن سے باہر کے اثرات کو اس میں دخل نہ تھا۔ عربی لغت کے صاف اور معروف معنی، عربی بول چال کے صاف اور سادہ محاورات، صدر اول کا بے لاگ ذوق و فہم، اور انبیاء کرام کا فطری اور غیر صناعی اسلوب بیان اس طریقہ کی خصوصیات تھیں۔ سلف امت کا طریق تفسیر یہی تھا۔

غیر قرآنی طریقے سے مقصود وہ تمام طریقے ہیں جو قرآن سے نہیں بلکہ مفسرین قرآن کے ذوق و فکر سے پیدا ہوئے۔ یہ علوم وضعیہ کی اشاعت، ایرانی روحی تمدن کے اقتباس اور عجمی اقوام کے اختلاط کا قدرتی نتیجہ تھا۔ مفسرین کے ہر گروہ نے قرآن کے مطالب اسی شکل و نوعیت میں دیکھے جیسی شکل و نوعیت کی فکری حالت ان کے اندر پیدا ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ حالت ہو گئی کہ قرآن کے الفاظ، تراکیب، اسلوب بیان، دلائل و براہین، مواعظ و حکم سب نے ایک دوسری ہی طرح کی نوعیت پیدا کر لی۔ قرآن کی تعلیم و بیان کی تمام تر بنیاد فطرت اور فطرت کی سادگی پر تھی۔ علوم و فنون کی تمام تر بنیاد وضعیت کے تعمق اور کاوش پر ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جوں جوں وضعیت کا انہماک بڑھتا

گیا۔ فطرت کے فہم و ذوق کی استعداد کم ہوتی گئی یہاں تک کہ وہ زمانہ آگیا جب لوگوں کے دماغ وضعی طریق بحث کے عادی ہو گئے کہ کسی اہم اور عظیم بات کو اس کی سادہ اور سہل صورت میں دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ ذہن کی کاوش پسندی جو علوم وضعیہ کے اشتغال کا نتیجہ تھی آسان اور سہل مطلب کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتی تھی۔

یہ موقع تشریح کا نہیں اگر آپ دقتِ نظر سے کام لیں گے تو ان چند جملوں کے اندر اصولِ تفسیر کی ایک اصل عظیم آپ کے سامنے آجائے گی۔

بہر حال یہ دوسرا غیر قرآنی طریقہ ان تمام طریقوں پر مشتمل ہے جو صدر اول کے بعد پیدا ہوئے۔ متکلمینِ مفسرین کا طریق تفسیر کم و بیش یہی ہے کوئی اس طریقہ میں ایک خاص حد تک گیا ہے۔ کوئی بہت دور تک۔ امام فخر الدین رازی رحمتہ اللہ علیہ بھی اسی راہ کے شہسوار ہیں۔ ان کے بعد اکثر مفسرین نے دانستہ یا نادانستہ انہیں کا نقش قدم اختیار کر لیا۔ قاضی ابن رشد کی کشف الدولہ اور فصل المتعال اور شیخ الرئیس کی بعض مختصر تفسیریں امام رازی اور مفسرین متکلمین سے پہلے لکھی گئی ہیں ان کے مطالعہ سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ متکلمین اشاعرہ، فلاسفۂ اسلام اور معتزلہ سے کتنا ہی انکار کرتے ہوں لیکن وہ خود بھی اسی طریقے کی پیداوار تھے۔ بہتر قسم کی نہیں ناقص اور کمزور قسم کی پیداوار۔

ایک سخت بنیادی غلطی جو اس طریقے کی مقبولیت کا باعث ہوئی متاخرین کا یہ خیال تھا کہ وقت کی علمی ضرورتوں کے لئے سلف کا طریقہ سود مند نہیں ہے۔ یہ بات ضرب المثل کی طرح ان کی زبانوں پر جاری ہو گئی تھی۔ کہ سلف کا طریقہ ایمان کے لئے بہتر ہے۔ مگر استدلال کے لئے مفید نہیں حالانکہ اگر ایمان کو جہل سے نہیں بلکہ علم و بصیرت سے پیدا ہونا چاہیئے تو جو طریقہ ایمان کے لئے سود مند ہو گا وہ استدلال و برہان

کے لئے کیوں غیر مفید ہو جہاں تک نام نہاد علمی ضروریات کا تعلق ہے واقعہ یہ ہے کہ متاخرین کے طریقہ سے بڑھ کر کمزور اور نامراد طریقہ کوئی نہیں ہو سکتا وہ استدلال کو فنون وضعیہ کے "منطق استدلال" سے باہر نہیں دیکھ سکے اور وجدان وطبیعت کی حقیقی شہادتوں سے آنکھیں بند کر لیں۔

آپ نے اپنے استفسار میں جابجا لکھا ہے کہ امام رازیؒ کا طریقہ موجودہ زمانہ میں سودمند نہیں لیکن میں کہتا ہوں (اس قید و پابندی) کی کیا ضرورت ہے یہ طریقہ تو کسی زمانہ میں بھی سودمند نہ تھا۔ کیا یہ طریقہ اس زمانہ میں سودمند تھا جب امام صاحب نے تفسیر لکھی ہے اس کا حال خود انہیں سے پوچھ لیا جائے ان سے بہتر ان کی نارسائیوں کے لئے کوئی شاہد نہیں ہو سکتا۔

تفسیر اور اساس التقدیس وغیرہ ان کے ابتدائی اور درمیانی عہد کی کوششوں میں سے ہیں۔ آخری عہد کی مصنفات میں سے ایک رسالہ مباحث ذات وصفات میں ہے اس کے دیباچہ میں مشکلات مباحث کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

> میں نے علم کلام اور فلسفہ کے تمام طریقوں پر غور کیا لیکن معلوم ہوا کہ مشکلات راہ کے لئے کچھ سودمند نہیں سب سے بہتر طریقہ قرآن ہی کا طریقہ ہے۔

امام صاحب کا یہ اعتراف بعینہٖ وہی اعتراف ہے جو موجودہ عہد کے تمام حکماء کی زبانوں پر بھی جاری ہو چکا ہے۔ یہ مذہبی مباحث کی راہ سے اس کوچہ میں آئے تھے اس لئے الٰہیات کی اصطلاحوں میں اعترافِ عجز کر رہے ہیں۔ لیکن لامارک ہیگل اور اسپنسر براہ راست حقائق کائنات کی جستجو میں نکلے تھے۔ اس لئے وہ ان مصطلحات کی جگہ دوسرا

طرح کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اعتراف عجز کی ایک ہی طرح کی روح دونوں کے اندر پھیل رہی ہے۔ لامارک کے اس قول میں کہ ہمارا علم اس سے زیادہ نہیں کہ جہل کا اقرار کریں یا اسپنسر کے اس اعتراف میں کہ اصلیت اور حقیقت کے تمام سوالوں کے جواب میں ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہم کچھ نہیں جانتے اور امام رازی کے اعتراف میں کیا فرق ہے۔

بہر حال جب تک قرآن حکیم کی تفسیر خالص قرآنی طریقہ پر نہیں کی جائے گی مشکلات راہ حل نہیں ہو سکتیں۔

(۲) ایک اہم اور بنیادی کام اس باب میں یہ ہے کہ قرآن حکیم کے الفاظ، تراکیب اور اسلوب بیان کو تمام وضعی اور خارجی عوارض سے پاک کر کے ان کی اصلی صورت و نوعیت میں نمایاں کر دیا جائے۔ جونہی یہ اصلیت نمایاں ہو گئی تمام اشکال خود بخود دور ہو جائیں گے۔

قرآن حکیم عربی زبان میں نازل ہوا اس کے الفاظ عربی زبان کے الفاظ تھے وہ انہی معنی کے لئے استعمال کئے گئے تھے۔ جن معانی کے لئے عربی لغت میں مستعمل تھے۔ قرآن نے خود جا بجا اپنے عربی زبان میں ہونے۔ نہایت کھلے اور دلنشیں ہونے اور مطالب کے سہل اور زود فہم ہونے کا ذکر کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآن کا یہ عظیم اور ابتدائی وصف باقی نہیں رہتا اگر ایک لمحہ کے لئے بھی یہ فرض کر لیا جائے کہ اس کے الفاظ ان عام اور معروف معانی کے علاوہ کوئی دوسرا مفہوم بھی رکھتے تھے۔

صدر اول میں چونکہ مسلمانوں کا ذوق خارجی اثرات سے متاثر نہیں ہوا تھا۔ اس

لیے قرآن کے تمام الفاظ اپنے لغوی معنی میں قائم رہے ہے۔ بلاشبہ اس عہد میں بھی ہر انسان جو قرآن کا علم رکھتا تھا الفاظ قرآنی کے مجازات سے واقف تھا لیکن یہ زبان اور بول چال کے ویسے ہی صاف اور سادہ مجازات تھے جو دنیا کی ہر زبان میں ہوتے ہیں اور جن کے معلوم کرنے کے لئے کبھی کسی اہل زبان کو کسی فلسفیانہ فن بلاغت وبیان کی ضرورت نہیں ہوتی۔

حضرت عبداللہ ابن عباس اور ابن کعب جب "بَلْ یَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ" اور "اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ" پڑھتے تھے تو بغیر "ید" "علو" کے نفی واثبات کی بحثوں میں اُلجھے اس کا وہ سیدھا سادھا مطلب سمجھ لیتے تھے جو ہر غیر متکلف عربی دان سمجھ لے گا۔ لیکن آگے چل کر جب علومِ دخیلہ کی اشاعت ہوئی اور وضعی علوم کی اصطلاحات اور نظری مباحث کی منطقی تعریفات وحدود کا لوگوں میں مذاق پیدا ہو گیا تو ایک بڑی جماعت ان لوگوں کی وجود میں آگئی جنہوں نے قرآن کو آہستہ آہستہ منطقی وفلسفی جامہ پہنانا شروع کر دیا اور تدریجاً اس کے الفاظ عربی لغت سے ہٹ کر منطقی تعریفات وحدود کی نوعیت اختیار کرنے لگے یہاں تک کہ کچھ عرصے کے بعد ان الفاظ کے لئے وہی معانی سمجھے جانے لگے جو علوم وضعیہ میں ان کے قرار پا چکے تھے۔

(۱۳) یہ تبدیلی الفاظ اور مطالب دونوں میں ہوئی۔ مطالب میں بنیادی چیز قرآن کا اسلوب بیان واستدلال ہے ایک عظیم اور اصولی غلطی متاخرین سے یہ ہوئی کہ وہ قرآن کے فطری اور وجدانی اسلوب بیان کی اہمیت نہ معلوم کر سکے۔ یونانی فلسفہ کے اشتغال نے ان میں منطقی استدلال کا ذوق پیدا کر دیا تھا انہوں نے کوشش کی کہ جہاں کہیں قرآن حکیم میں استدلال اور اثبات مدعا کے قسم کا کوئی بیان ہے۔ اُسے کھینچ تان کر

منطقی استدلال کی شکل دے دیں۔ حالانکہ انبیاء کرام کے علوم کی راہ وضعی و منطقی طریق استدلال سے بالکل مختلف ہے۔ انبیاء کرام کا خطاب علوم سے نہیں بلکہ قلوب سے ہوتا ہے وہ علماء کے لئے بحث و نظر کا سامان پیدا کرنے نہیں آتے بلکہ عامۃ الناس کے لئے ہدایت و سعادت کی راہیں کھول دینے کے لئے آتے ہیں۔ ان کا مقصود یہ نہیں ہوتا کہ اشیاء کی حقیقت کا سراغ لگائیں۔ وہ اس لئے آتے ہیں کہ اعمال اور ان کے نتائج کی حقیقت دنیا پر واضح کر دیں۔ پس وہ اپنی تعلیم اور ہدایت میں کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کرتے جسے کسی طرح کی بھی مشابہت منطقی طریق بحث و استدلال سے ہو۔ ان کا طریقہ سیدھا سادا فطری طریقہ ہوتا ہے جس کے تحت نہ تو ان کے بنائے ہوئے علوم و فنون کی تحصیل ضروری ہوتی ہے نہ پیچیدہ اور دقیق مقدمات ترتیب دینے پڑتے ہیں اور نہ کسی طرح ذہنی کاوش اور نظری سلوک کی قید ہوتی ہے۔ ہر انسان اپنے وجدان کی قدرتی استعداد اور طبیعت بشری کی فطری طلب و داعیہ سے اُسے سنتے ہی قبول کر سکتا ہے اور ایک فلسفی و حکیم سے لے کر ایک بادیہ نشین دہقان تک ہر درجہ، ہر طبقہ اور ہر زمانہ کا انسان یکساں طور پر اس سے یقین و ایمان حاصل کر لیتا ہے۔

(۴) انبیاء کرام علیہم السلام حکماء کے وضعی طریق استدلال کی جگہ فطری طریق تلقین کیوں اختیار کرتے ہیں۔ میں اس کی تشریح یہاں نہیں کروں گا۔ آیۂ زیر بحث میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے البتہ ترتیب، بیان کے لئے مختصر لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اولاً انبیاء کرام کی تعلیم کا مقصود بحث و نظر نہیں ہوتا ایمان و یقین ہوتا ہے۔ ایمان و یقین کے لئے وضعی علوم کا طریق استدلال کسی حالت میں سود مند نہیں۔ انبیاء کرام کے تمام احکام کا دارو مدار ماوراء محسوسات حقائق پر ہے جسے قرآن کریم نے عالم غیب سے تعبیر کیا ہے

عالم غیب کے معاملات خلافِ عقل نہیں ہیں مگر ماوراء عقل ضرور ہیں اس لئے ان کا علم نظری استدلال کے ذریعہ نہیں بلکہ صرف وجدانی شہادت کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ وجدانی شہادت جو فطرتِ انسانی میں ودیعت کر دی گئی ہے۔ اور جس کا اذعان قدرتی طور پر ہر انسان کے اندر موجود ہے پس انبیاء کرام کا طریق ارشاد یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کے وجدان سے خطاب کرتے ہیں نہ کہ ذہن و ادراک سے۔

ثانیاً ایک اصل عظیم اس باب میں یہ ہے کہ انبیاء کرام کا طریق تعلیم "مقدمات" کا طریقہ نہیں ہوتا براہِ راست تلقین کا طریقہ ہوتا ہے۔ عام بول چال میں اس کا مطلب یوں سمجھنا چاہیئے کہ کسی بات کے ثابت کرنے اور منوا دینے کے طریقے دو ہیں ایک طریقہ یہ ہے کہ پہلے مخاطب سے چند ایسی باتیں منوالی جائیں جو گو اصل مدعا نہیں ہیں لیکن ان کے تسلیم کر لینے کے بعد مدعا کا تسلیم کر لینا ضروری ہو جائے گا۔ یہ طریقہ مقدمات کا طریقہ ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جو بات مخاطب کے دل میں اتارنی ہو وہ ایسی شکل و نوعیت میں بیان کر دی جائے کہ بغیر کسی دوسری بات کے سہارے کے خود بخود دلنشیں ہو جائے۔ اس بات کے سمجھنے مان لینے اور شک و انکار سے محفوظ ہو جانے کے لئے کسی دوسری بات کے سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہی نہ ہو۔ یہ طریقہ براہِ راست تلقین کا ہے کیونکہ اس طریقہ میں اثباتِ مدعا کے لئے جو کچھ کہا جاتا ہے۔ مقدمات کا محتاج نہیں ہوتا پہلا طریقہ علوم وضعیہ اور نظار کا ہے دوسرا طریقہ طریق فطری اور انبیاء کرام کا ہے۔ انبیاء کرام اگر اپنی تعلیم میں مقدمات کا طریقہ اختیار کرتے تو ظاہر ہے کہ ان کا خطاب عام نوع بشر سے نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ بجز چند افراد کے جنہوں نے علوم وضعیہ کے طریقہ پر مقدمات کے بحث و نظر کی استعداد پیدا کر لی ہو۔ عامۂ ناس نہ تو ان کی تعلیم سمجھ سکتے نہ ایمان کے لئے مکلف ہو سکتے۔ انبیاء کے

لئے ضروری ہوتا کہ وہ ایمان کی براہِ راست دعوت دینے کی جگہ پہلے مدرسوں میں وضعی
علوم کی تعلیم دیتے پھرتے تعلیم کے بعد مقدمات ترتیب دے کر اثباتِ مدعا کی شکلیں بناتے
پھر ان مقدمات میں سے ایک ایک مقدمہ پر لڑتے جھگڑتے پھر جب مخاطب ان کے جال
میں اُلجھ جاتا تو اُسے بے بس کر کے اقرار کرا لیتے ـــــ یہ طریقہ حکماء کی بحث و نظر کا
ہے "دعوت" کا نہیں ہے اور انبیاء کرام داعی ہوتے ہیں مناظر اور تنظیر نہیں ہوتے۔

ثانیاً یہ کہ مقدمات کا طریقہ جیسا کچھ بھی ہو یقین نہیں پیدا کر سکتا۔ عجز پیدا کر دیتا ہے
اور دونوں میں فرق ہے۔ انبیاء اپنے مخاطبین میں یقین پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ بحث میں عاجز
کر کے چپ کرا دینا نہیں چاہتے۔ مقدمات کا طریقہ پیچ در پیچ اور چند در چند نظری مسلمات
پر مبنی ہوتا ہے اگر مخاطب اس پیچ وخم کا شاطر نہیں ہے تو بہت جلد لاجواب ہو کر چپ ہو
جائے گا یہ "چپ ہو جانا" نہ کہ "مطمئن ہو جانا" طریقِ مقدمات میں مناظر کی فتح سمجھی جاتی ہے لیکن
انبیاء کرام زبان نہیں دل جیتنا چاہتے ہیں۔ اور زبان کے بے بس ہو جانے سے دل
میں یقین نہیں پیدا ہو جاتا۔

رابعاً۔ مقدمات کے طریقہ کا تمام تر دارو مدار وضعی علوم کے نظری مسلمات پر ہوتا
ہے۔ اور یہ مسلمات نہ تو ہر حال میں حقیقی ہیں نہ ہر زمانے کی علمی استعداد ان کا اعتراف کر
سکتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کل تک جو بات مسلّم طور پر مانی جاتی تھی آج اتنی کمزور ہو
جائے کہ لوگ اس کی ہنسی اڑائیں۔

ایمان کی بنیاد ایسی متغیر اور متلون بنیاد پر نہیں ہو سکتی وہ ہر فرد ہر جماعت ہر
طبقہ اور ہر زمانہ کے لئے یکساں حقیقت ہے۔ ہمارے حکماء اور متکلمین نے حدوثِ
عالم اور اثباتِ صانع کے کتنے ہی استدلال ترتیب دیئے تھے جن کی بنیاد اب وقت

کے مذاہب فلسفہ کے نظری مسلّمات پر کی گئی تھی۔ لیکن آج ہم کسی پڑھے لکھے آدمی کے سامنے اُنہیں دُھرانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

(۵) صرف یہی نہیں کہ قرآن کا یہ طریقہ نہیں ہے بلکہ اس نے واضح طور پر اس طریقہ کی مذمت بھی کی ہے اور اُسے بھی اُنہیں طریقوں میں سے قرار دیا ہے جو اس کے نزدیک "جدل" کے طریقے ہیں اور جو طریق دعوت و ہدایت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ بلاشبہ اس طریق کا حامل ایک علمی قسم کا "جھگڑالو" بن جاتا ہے۔ لیکن مرشد اور ہادی نہیں بن سکتا اس کی طبیعت کبھی اس طرف نہیں جاتی کہ سچائی اور حق معلوم کرے اس کا قلب حقیقت سے نا آشنا ہو کر اس قسم کی باتوں پر قانع ہو جاتا ہے جسے "ٹکنیکل" قسم کی باتیں کہتے ہیں۔ اگر وہ ایک مخاطب کو جو حق کی جستجو اور یقین کی راہ میں اس سے نزاع کر رہا ہے، صرف ایک لفظی غلطی یا کسی اصطلاحی قاعدہ کی نا آشنائی یا ترتیب مقدمہ کے پیچ درخم کے اُلجھاؤ سے شرمندہ کر دے سکے اور لاجواب بنا دے تو وہ اُسے اپنی بڑی فتح مندی سمجھے گا۔ اور اُسے مناظرہ میں ہرا دینے سے تعبیر کرے گا۔ لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سوچے گا کہ اس نام نہاد فتح و شکست سے حقیقت اور سچائی کا فیصلہ کیونکر ہو گیا۔ یہ زیادہ سے زیادہ مناظرہ کی جیت ہے۔ لیکن حقیقت کا فیصلہ تو نہیں ہے اگر وہ اس مناظرانہ کج اندیشی کی مدہوشی سے افاقہ پائے اور خود اپنے دل کی گہرائیوں کا حساب لے تو اُسے معلوم ہو جائے کہ جس بات کے منوانے کے لیے وہ ایک عالم کو چپ کراتا پھرتا ہے خود اسی کے دل کو اس پر قرار نہیں ہے۔

قرآن و سنت پر تدبّر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور اس طرح کے تمام طریقے نہ صرف حصول مقصد کے لیے سود مند نہیں ہیں۔ بلکہ اس لیے ہدایت و یقین

کی راہوں سے دور کر دینے والے ہیں۔ قرآن ان تمام طریقوں کو "خصومت" اور جدل کی راہ قرار دیتا ہے۔

جس آیت کی نسبت آپ نے استفسار کیا ہے۔ دراصل وہ اس حقیقت کا ایک بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔ وہ واضح کرتی ہے کہ انبیاء کا طریق "دعوت" و "ہدایت" کا ہے "جدل" کا نہیں۔ تشریح اس کی آگے آئے گی۔

(۶) لیکن افسوس ہے کہ متکلمین کا منطقی ذوق۔ طریق قرآنی کی اہمیت و حقیقت معلوم نہ کر سکا۔ انہوں نے قرآن کو بھی وہی منطقی جامہ پہنا دینا چاہا جو خود انہوں نے علم و نظر کے ہر گوشہ میں پہن رکھا تھا۔ چونکہ یہ طریقہ قرآن کے لئے ایک مصنوعی طریقہ تھا۔ اس لئے قدم قدم پہ طرح طرح کی مشکلات پیش آئیں۔ لغت ساتھ نہیں دیتی تھی۔ عربی اسلوب بیان قطعی مخالف تھا، سباق و سیاق کا مقتضا کچھ اور ہی کہتا، سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن کا عام نظم بیان اس طریق کے ساتھ چل نہیں سکتا تھا تاہم وہ اپنی موشگافیوں اور کوہ کندنیوں میں برابر بڑھتے ہی گئے اور کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر ایک نیا کارخانہ استدلال گھڑ کر کھڑا کر دیا۔ اب کہتے ہیں کہ قرآن کی مشکلات حل نہیں ہوتیں لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ یہ مشکلیں قرآن کی مشکلیں نہیں ہیں، خود انہی کی پیدا کی ہوئی مشکلیں ہیں۔ اگر ایک بات کو اس کی زبان، اس کے اسلوب اور اس کے قدرتی معانی سے ہٹا کر ایک دوسری طرح کی شکل دے دی جائے گی تو یقیناً وہ صاف نہیں رہے گی۔ مشکلات کا ایک معمہ ہی بن جائے گی یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کے ساتھ ہم دو ہی طرح کا سلوک کر سکتے ہیں یا تو اس کی سچائی تسلیم کریں یا انکار کر دیں۔ اگر ہم اس کی سچائی تسلیم کرتے ہیں تو ضروری ہے کہ وہ تمام اوصاف بھی تسلیم کریں جو اس نے اپنی نسبت بار بار بیان کئے ہیں۔ ان اوصاف

میں سب سے پہلا اور بنیادی وصف یہ ہے کہ وہ ہر اعتبار سے سہل ہے۔ پس قرآن سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مگر مشکل اور پیچیدہ نہیں ہو سکتا کوئی تفسیر کوئی تاویل کوئی ایسی بات جس سے اس کی کوئی ایک کوئی ایک سورت کوئی ایک رکوع کوئی ایک آیت بلکہ اس کا کوئی ایک لفظ بھی مشکل اور مقدمات طلب بن جائے، قرآن کے لئے سچی تفسیر اور سچی بات نہیں ہو سکتی۔ یقیناً وہ سچی نہیں ہو سکتی اس لئے کہ قرآن جو سچ ہے بار بار کہتا ہے کہ۔

> قرآن صاف اور واضح عربی زبان میں نازل ہوا ہے اس کی تعلیم بالکل کھلی ہوئی اور اس کا طریق بیان تمام تر سہل اور دل میں اتر جانے والا ہے۔ سچائی اس میں گھول دی گئی ہے۔ حقیقت کے لئے اس میں کوئی نقاب نہیں۔ اس کا بیان یک قلم سیدھا سادھا ہے۔ کسی طرح کی ٹیڑھ اور پیچیدگی اس میں راہ نہیں پا سکتی۔ اس کے سمجھنے بوجھنے کے لئے صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ دل لگنے والا اور کان سننے والے ہوں، اُسے صرف سن لینا ہی اُسے پالینا ہے۔ اور اسے دیکھ لینے سے انکار تہ کرنا اس کی شیفتگی اور عشق کا اقرار ہے (۸۶ - ۱۴)

(۷) ضرورت ہے کہ اس معاملہ کی توضیح کے لئے مختصراً ایک دو مثالیں بھی دے دی جائیں۔

متکلمین نے جو طریقہ الٰہیات میں اثباتِ مدعا کا اختیار کیا تھا، اس میں سب سے زیادہ ان کا اعتماد حدوثِ عالم کے اثبات پر تھا۔ یعنی عالم "قدیم" نہیں ہے، پیدا

شدہ ہے حدوث عالم کے لئے سب سے زیادہ قوی استدلال حرکت اور تغیر کا استدلال سمجھا جاتا تھا۔ بچپنے میں ہم نے یہ شکل رٹی تھی "العالم متغیر وکل متغیر حادث فالعالم حادث" چونکہ متکلمین کے دماغ میں اثباتِ مدعا کی یہی شکلیں بسی ہوئی تھیں اس لئے انہوں نے قرآن کے استدلالات کو بھی کھینچ تان کر یہی جامہ پہنا دینا چاہا۔

قرآن حکیم نے جس طرح آیت زیر تدبر میں حضرت ابراہیمؑ کی ایک "حجت" کا ذکر کیا ہے اسی طرح سورۂ انعام میں ایک دوسری حجت کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ حجت کیا تھی؟ یہ حجت وہ تھی جس میں حضرت ابراہیم کے مشاہدۂ "ملکوت السموات والارض" کے واردات کا ذکر ہے یعنی حضرت ابراہیم نے ستارا، چاند اور سورج دیکھا اور جب ان میں سے ہر کوکب ڈوب گیا تو فرمایا "اِنِّیْ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ"۔

چونکہ اس معاملہ کو قرآن نے حجت کے لفظ سے تعبیر کیا تھا اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ متکلمین نے حجتِ مستعملۂ قرآن کو وہی حجت قرار دے لیا تھا جو ان کی مصطلحہ منطق "حجت" تھی اس لئے انہوں نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے اپنے منطقی استدلال کی شکل یہاں بھی چپکا دی۔ مطلب یہ قرار دیا کہ حضرت ابراہیمؑ نے حدوثِ عالم پر حرکت و تغیر سے استدلال کیا ہے یعنی انہوں نے کواکب کے صانع عالم نہ ہونے پر اس بات سے استدلال کیا ہے کہ ان میں حرکت ہے۔ حرکت تغیر کو کہتے ہیں اور جس میں تغیر ہو وہ محدث ہے اور جو محدث ہے وہ قدیم نہیں اور جو قدیم نہیں وہ صانعِ عالم نہیں ہوسکتا۔

اس تفسیر پر ہمارے متکلمین کو اس درجہ وثوق بلکہ فخر ہے کہ حضرت امام رازیؒ تغیر سے استدلالِ حدوث کو "طریق ابراہیمی" قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں پہلا حکیم ربانی جس نے اس حکمت سے مخلوق کو آشنا کیا وہ حضرت ابراہیمؑ خلیل ہیں۔

ابھی اس سے قطع نظر کیجیے کہ اس استدلال کی کمزوریوں کا کیا حال ہے اور اس کا صغریٰ و کبریٰ ہی کون سا قطعی اور مسلّم ہے کہ نتیجہ قطعی الثبوت نہ ہو۔ اس پر بھی بحث نہ کیجیے کہ اس طرح کا استدلال انبیاء کرام کی طرف منسوب کرنا طریق دعوتِ نبوت سے کس درجہ نا آشنائی اور حقیقت فراموشی ہے صرف اس بات پر غور کیجیے کہ لغت و عربیت کے لحاظ سے اس تعبیر کا کیا حال ہے۔

آیت کریمہ میں کوکب چاند اور سورج کا ذکر ہے اور تینوں کے لئے "افل" کا لفظ آیا ہے۔ متکلمین کی یہ تعبیرِ افول "کے معنی حرکت و تغیر قرار دیتی ہے اور جب تک یہ معنی قرار نہ دیئے جائیں ان کے گھڑے ہوئے استدلال کی دیوار کھڑی نہیں ہو سکتی لیکن جزم و قطع کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ عربی لغت میں کسی ایسے "افول" کا وجود ہی نہیں جو حرکت و تغیر کے معنی میں بولا جاتا ہو۔ جو افول عربی زبان میں مستعمل ہے اس کے معنی تو کسی چیز کے چھپ جانے اور غائب ہو جانے کے ہیں۔

آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ جب چاند ڈوب گیا سورج غروب ہو گیا تو حضرت ابراہیمؑ نے کہا "میں نے چھپ جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا" یہ حرکت و تفسیر کی مصیبت یہاں کہاں سے آگئی؟ پھر قیامت پر قیامت یہ ہے کہ حرکت سے بھی ان کا مقصود حرکتِ لغوی نہیں بلکہ حرکتِ مصطلحہ فلسفہ ہے۔ یعنی وہ "حرکت" جو ایک حالت سے دوسری حالت میں انتقال کہلاتی ہے خواہ مکان میں ہو یا زمان میں اور "کم" میں ہو یا "کیف" میں مثلاً درخت کا نمو بھی حرکت ہے اور یہ حرکت فی الکم ہے اور کسی رنگ کا تغیر بھی حرکت ہے۔ اور یہ حرکت فی الکیف ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر "افول" کے مفہوم میں کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر "حرکت" کی دلالت پیدا بھی کر لی جائے تو لغت اور قرآنی

پر یہ کیسا صریح اتہام ہو گا کہ حرکت کا یہ فلسفیانہ مفہوم اس کے سر تھوپا جائے۔

متکلمین اپنے ذوق تفلسف میں یہ حقیقت بھی بھول گئے کہ حضرت ابراہیمؑ کا خطاب جن لوگوں سے تھا، وہ کواکب کو صانع کائنات نہیں سمجھتے تھے کہ ان کے لئے اس مزعومہ استدلال کی ضرورت ہوتی ان لوگوں کا اعتقاد اجرام فلکیہ خصوصًا چاند سورج کی نسبت وہی تھا جو دنیا کی تمام مشرک عقول کا اپنے اپنے دیوتاؤں کی نسبت رہ چکا ہے اور اب تک ہے یعنی یہ ایسی روحانی اور ملکوتی ہستیاں ہیں جنہیں دنیا کی تدبیر و تصرف میں دخل ہے۔ اور اس لئے ایسی ان کی پرستش ضروری ہے پس جب وہ کواکب کو صانع کائنات سمجھتے ہی نہ تھے تو ان کے محدث و مخلوق ہونے کے دلائل پر حضرت ابراہیمؑ کیوں زور دیتے۔

ان کے علم میں تو کوئی ایسی بات آئی تھی جس سے کواکب کے تدبر و تصرفِ عالم میں دخیل ہونے کا بطلان ثابت ہوتا کیونکہ ان کے ہموطنوں کی اصلی گمراہی یہی تھی۔

یہ محل مزید تشریح و اطناب کا متحمل نہیں ورنہ یہی ایک تفسیر اس حقیقت کی توضیح کے لئے کافی تھی کہ متکلمین کے طریقہ نے قرآن کریم کے حقائق و معارف پر کیسے تو بہ تو پردے ڈال دیئے ہیں اور ان کی ذہنیت معارفِ قرآنیہ کی رُوح سے کس درجہ مختلف بلکہ متضاد ہے

فی الحقیقت قرآن حکیم کا یہ مقام منجملہ اہم ترین دلائل قرآنیہ کے ہے لیکن متکلمین نے ایک دور ازکار اور تعمیۃً بے معنی استدلال کا جامہ پہنا کر اس کی ساری دل آویزی اور خوبی غارت کر دی ہے لطف یہ ہے کہ یہ استدلال حضرت ابراہیم کی طرف اس جوش و سرگرمی کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے گویا ان کے لئے ابراہیمؑ خلیل کی جگہ امام الحرمین بن جانا کوئی بڑی ہی فضیلت کی بات ہے۔

قرآن حکیم نے اللہ تعالیٰ کے صفات کا ذکر کرتے ہوئے، "احد" اور "واحد" کا لفظ استعمال کیا ہے اس کے معنی اس زبان میں جس میں قرآن نازل ہوا ہے اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ صفت "تعدد" کی نفی کرتی ہے یعنی وہ ایک ہے۔ اکیلا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں کوئی عرب یا عربی دان انسان "احد" کا لفظ سُن کر اس سے زائد مفہوم کا تخیل ہی نہیں کر سکتا۔ لیکن متکلمین نے اس کے لئے فلسفیانہ معانی اور التزامات پیدا کر لئے اور بلا تکلف اُنہیں معنوں میں استعمال کرنے لگے مثلاً وہ کہتے ہیں خدا نے اپنا وصف "احد" قرار دیا ہے اور احد وہ ہے جو منقسم نہ ہو سکے پس معلوم ہوا کہ وہ جسم نہیں ہے کیونکہ اجسام قابل انقسام ہیں۔ ہمیں بھی اس کا شوق نہیں کہ خدا کی جسمیت ثابت کی جائے۔ لیکن یہ قطعی ہے کہ قرآن نے عربی کا لفظ "احد" ان متکلّمین کی اصطلاح میں استعمال نہیں کیا ہے اور نہ اس انقسام اور عدم انقسام کی دقیقہ بحثوں سے اُسے کوئی تعلق ہے۔

یا مثلاً عربی کا ایک لفظ "مثل" ہے "مثل" کے اصلی معنی کسی چیز کے نصب ہونے کے تھے۔ مصور صورت بنا دیتا ہے اس لئے اسے تمثل کہنے لگے پھر اسی نسبت سے اس کا استعمال مشابہت کے معنوں میں بھی ہونے لگا۔ قرآن نے بھی جابجا مثل کا لفظ اُنہیں معنوں میں استعمال کیا ہے۔

لیکن جب فلسفیانہ مصطلحات رائج ہو گئیں تو تمثیل کا استعمال ایک خاص تعریف وحدود کے ساتھ ہونے لگا مثلاً مماثلت کے مفہوم میں منطقی اطلاق پیدا کر کے اُسے مماثلت فی الجوہر وغیرہ میں لے گئے اور اس کے بعد مثل متنقلہ قرآن سے بھی وہی استدلال کرنے لگے مثلاً "لیس کمثلہ شیئ" میں "مثل" کو وہی مثل مصطلحہ قرار دیتے ہیں۔ اور

اسی پر اپنی تمام فلسفہ آرائیوں کی عمارت استوار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں تمام اجسام متماثل ہیں اور جسم وہ ہے جو جواہر فرد سے مرکب ہو یا جس کی طرف اشارہ کیا جا سکے اور جس کی مقدار ہو پس جب خدا نے فرمایا لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ تو اس سے ان تمام جسمی (مصطلحہ فلسفہ) مماثلتوں کی نفی ہو گئی جو جواہر میں یا اعراض میں ہو سکتی ہیں۔ یقیناً خدا کے مثل کوئی شی نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ قرآن نے عربی کا جو لفظ استعمال کیا ہے اور اس کا جو مطلب وہ سو برس تک تمام عرب مخاطبین سمجھتے رہے ہیں، وہ کیا تھا؟ کیا وہ یہی مثلیتِ مصطلحۂ فلسفہ تھی؟ حاشا و کلا عربی میں مثل کا لفظ ٹھیک انہیں سیدھے سادے معنوں میں بولا جاتا ہے جن معنوں میں ہم آج کل اردو میں بولا کرتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے "تاج محل آگرہ کے مثل کوئی عمارت نہیں" تو اس سے اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ ایسی خوش نمائی رکھنے والی کوئی دوسری عمارت موجود نہیں۔ قرآن نے بھی ٹھیک ٹھیک اسی سادہ اور لغوی معنی میں مثل کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ فلسفیانہ دقیقہ سنجیاں یہاں کہاں سے آ گئیں؟ یا مثلاً عربی کا ایک لفظ "خلد" اور "خلود" ہے جس کے معنی لغت اور زبان میں "طولِ عہد" کے ہیں اور اسی نسبت سے وہ "ہمیشگی" کے معنوں میں بھی بولا جاتا ہے لیکن یہ ہمیشگی ایسی ہی ہوتی ہے جیسے بول چال میں ہم کہتے ہیں "یہ آدمی ہمیشہ کلکتہ ہی میں رہے گا" اس سے یہ مقصود نہیں ہوتا کہ وہ ابد تک رہے گا اور مستقبل میں کوئی وقت ایسا نہیں آئے گا جب وہ کلکتہ میں موجود نہ ہو بلکہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ یہیں ٹھہرا ہوا ہے اور عرصہ تک یہیں ٹھہرے گا۔

قرآن نے بھی جابجا اسی معنی میں یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ لیکن بعد کو جب فلسفیانہ

بحثیں پیدا ہو گئیں تو "خلود" کے معنی ایسی ہمیشگی کے ہو گئے جس کی کوئی نہایت نہ ہو۔

یا مثلاً عربی میں لفظ "قدیم" کے معنی وہی ہیں جو اردو میں "پرانے" کے ہیں۔ یہ مکان بہت قدیم ہے یعنی بہت مدت سے ہے لیکن متکلمین نے فلسفیانہ مباحث میں "قدم" و "حدوث" کی خاص اصطلاحات اختیار کیں اور اس لئے "قدیم" کی بھی ایک خاص منطقی تعریف بن گئی اب کتاب و سنت کا مستعملہ "قدیم" بھی اسی معنی میں لیا جانے لگا۔

افسوس ہے کہ محل اس کا متحمل نہیں کہ مثالوں کے بیان میں اطناب سے کام لیا جائے ورنہ آپ دیکھتے کہ تفسیرِ قرآن کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس غیر قرآنی طریقِ تفسیر سے متاثر نہ ہو۔ اور اصلیت پر بے شمار پردے نہ پڑ گئے ہوں۔ اگر آپ صرف امام راغب اصفہانی کی مفردات ہی اٹھا کر دیکھ لیں جو آج کل نئے تحقیقِ قرآن میں سے اکثر کا توشہ عام ہے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ نہ صرف قرآن کے مطالب و دلائل کی صورت بدل دی گئی ہے۔ بلکہ اس کے تمام الفاظ کے لئے بھی ایک نیا فلسفیانہ قاموس ترتیب دے دیا گیا ہے اور وہ چیز جسے اپنے "عربی مبین" ہونے پر ناز تھا اب ایک مشکل ترین عربی چیستان بن کے رہ گئی ہے۔

اب جب کہ یہ تمہیدی مطالب ایک حد تک واضح ہو گئے ہیں، آیۂ زیرِ تدبر کی تفسیر نہایت سہل ہے۔ چند سطروں کے اندر تمام مشکلیں دور ہو جائیں گی۔ البتہ تفسیر سے پہلے چند مبادیات کی مختصراً تشریح اب بھی ضروری ہے۔

(۱) اس آیت میں قرآنِ حکیم نے حضرت ابراہیم اور ان کے عہد کے ایک انسان کا مکالمہ نقل کیا ہے۔ سب سے پہلی اور بنیادی غلطی جس کی وجہ سے تمام مشکلیں پیدا ہو گئی ہیں۔ یہ ہے کہ مکالمہ کی نوعیت ہی غلط سمجھ لی گئی ہے۔ آیت میں "حاج" کا لفظ آیا ہے

کیا تمہیں اس آدمی کا حال معلوم نہیں جس نے ابراہیمؑ سے پروردگار
عالم کے بارے میں حجت کی تھی؟

چونکہ متکلمین مفسرین کے دماغ میں منطقی طریق مناظرہ و حجت بسا ہوا تھا اور انبیاء کرام کے نہج و پیرایہ فطریہ کو بھی وہی جامہ پہنانا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے اس "مکالمہ" کو بھی مناظرۂ مصطلحہ منطق قرار دے دیا اور پھر لگے فنِ مناظرہ کے تمام اصول و آداب کو اس پر منطبق کرنے اور جب منطبق نہ ہو سکے تو الجھنیں اور دور از کار توجیہیں کرنے لگے

حضرت امام رازیؒ اس آیت کی تفسیر میں سب سے پہلی بات جو کہتے ہیں وہ یہی ہے کہ یہ "مناظرہ" تھا۔ جونہی انہوں نے اس معاملہ کو مناظرہ کے لفظ سے تعبیر کیا حقیقت سے الگ ہو گئے اور جب پہلا ہی قدم الٹا پڑ گیا تو اب جس قدر آگے بڑھتے جاتے ہیں حقیقت سے زیادہ دور ہوتے جاتے ہیں اور یکے بعد دیگرے الجھاؤ پڑتے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق الشبہۃ الاولیٰ اور الشبہۃ الثانیہ اور الاشکال الاول اور الاشکال الثانی کا سلسلہ یہاں بھی پوری قوت اور فصاحت کے ساتھ جاری رکھا ہے۔ لیکن جب جواب کا موقع آیا ہے۔ تو پانچ پانچ اور چھ چھ وجوہِ اشکال بیان کرنے کے بعد ایک شافی جواب بھی نہیں دے سکے اور ایک ایسے طریقے سے جو پڑھنے والے کو حیرت و اضطراب میں غرق کر دیتا ہے رخصت ہو جاتے ہیں۔ امام رازیؒ کے بعد جس قدر مفسرین پیدا ہوئے سب نے اس مکالمہ پر اسی حیثیت سے نظر ڈالی البتہ حافظ عماد الدین ابن کثیر جو شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے تلامذہ میں سے ہیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ وہ سلف کے طریق تفسیر سے آشنا ہو چکے تھے اس لئے ان موشگافیوں میں نہیں پڑے بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ یہ مطلب اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے جو بہت سے منطقیوں نے قرار دیا ہے لیکن افسوس کہ منطقیوں کے

طریقے سے الگ رہ کر بھی وہ پوری طرح ان کی لغزشوں سے محفوظ نہ رہ سکے یعنی اِس الجھاؤ سے وہ بھی نہ نکل سکے جو حضرت ابراہیمؑ کے ایک دلیل چھوڑ کر دوسری دلیل اختیار کرنے کے معاملہ میں پڑ گیا تھا۔

یہ بات معلوم کرنے کے لئے کہ متاخرین کی پیدا کی ہوئی مشکلات سے متقدمین کس طرح محفوظ تھے، امام ابن جریر طبری کی تفسیر پر نظر ڈالیئے جو محدثین کے صاف اور سادہ طریق پر روایات جمع کر دیتے ہیں انہوں نے سرے سے یہ فتنہ انگیز لفظ "مناظرہ" استعمال ہی نہیں کیا۔ وہ "حاج ابراہیم فی ربہ" کا ترجمہ "الذی خاصم ابراہیم فی ربہ" کرتے ہیں جو فی الحقیقت اس محل کے لئے خود قرآن کا بتلایا ہوا لفظ ہے۔ اور پھر سیدھا سادھا مطلب بیان کر کے خاموش ہو جاتے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ یہاں یہاں مناظرہ کے لغوی اطلاق سے اختلاف نہیں بلکہ اصطلاحی اور وضعی اطلاق سے اختلاف ہے

وضعی علوم کی اصطلاح میں "مناظرہ" ایک خاص فن ہے جس میں مباحثہ کے اصول و آداب وضع کئے گئے ہیں اور اس کا مقصود اسکاتِ خصم ہے یعنی جھگڑنے والے کو چپ کرا دینا۔ نہ یہ کہ اس کے شکوک دور کر دینا۔

نہ صرف یہ کہ انبیاء کرام کا طریق بیان یہ نہیں ہوتا بلکہ قرآن بتلاتا ہے کہ کسی طالب حق کا بھی یہ طریقہ نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ یہ طلبِ حق اور علم حقیقت کی راہ نہیں ہے جدل اور خصومت کی راہ ہے۔ اب غور کیجئے کہ یہ کیسی مصیبت ہے جس طریق بحث کو قرآن مذموم قرار دیتا ہے اسی کو ہمارے مفسرین متکلمین محمود و مطلوب قرار دیتے ہیں اور قرآن کے تمام دلائل اور انبیاء کرام کے تمام مطالبات و مخاطبات کو اسی شکل و صورت میں ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اور پھر ذہن کی اس کجی اور فکر کے اس مرض کو علم و معرفت کی ایک ایسی

عظمت سمجھتے ہیں جسے ابراہیم خلیلؑ کے منہ سے نکلوا دینا گویا ان کی بزرگی کی بڑی دلیل اور ان کے مرتبۂ نبوت و عظمت کی بڑی ہی خوبروئی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر عجب العجائب معاملہ یہ ہے کہ قرآن حکیم اس مقام پر جس حقیقت کا اعلان کر رہا ہے وہ یہی ہے کہ انبیاء کرام کا طریق دعوت ہدایت کا طریق ہوتا ہے جدل و خصومت کا نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت خلیل نے باوجود اس کے کہ ایک الد الخصام کج بحثی کرنے لگا تھا۔ سررشتۂ ہدایت ہاتھ سے نہ چھوڑا اور مجادلانہ نزاع کی جگہ طریق ہدایت سے اُسے اعترافِ حق پر مجبور کر دیا لیکن متکلمین ہیں کہ عین اس مقام کو مجادلانہ اندازِ استدلال کی شکل دے رہے ہیں اور بڑی کوہ کندنی و کاہ برآوردنی کے بعد ثابت کر دینا چاہتے ہیں کہ اصلی حقیقت یہ نہیں ہے بالکل اس سے اُلٹی ہے۔ یعنی طریق، طریقِ جدل و مناظرہ ہے نہ کہ ارشاد الی الحق اور ہدایت الی المقصود۔ تفسیر کبیر کا یہ پورا مقام پڑھ جائیے معلوم ہوتا ہے حضرت خلیلؑ اور نمرود کا مکالمہ منطقیوں کی ایک اچھی خاصی مجلسِ مناظرہ ہے ایک طرف نمرود بیٹھا ہے اور ایک پختہ کار فلسفی کی طرح "شفا" اور "اشارات" کے تمام مباحث رٹ چکا ہے دوسری طرف حضرت ابراہیمؑ ہیں اور امام رازیؒ اور قاضی عضد کے علم کلام کا ایک ایک لفظ نوکِ زبان رکھتے ہیں۔ نمرود ایک سوال کرتا ہے یہ اس کا جواب دیتے ہیں وہ ان کے جواب کا توڑ کرتا ہے اور نئے مقدموں میں اُلجھانا چاہتا ہے۔ یہ ایک شاطر مناظر کی طرح ذرا پینترا بدلتے ہیں اور انہیں مقدمات کے داؤ سے اسے گرا دینا چاہتے ہیں۔ وہ "سبب" اور "واسطہ" کی طرف رخ کرتا ہے یہ "حرکت افلاک" کا پیچ کس دیتے ہیں۔ سبحان اللہ حضرت ابراہیمؑ کی دعوتِ نبوت نہ ہوئی میر زاہد اور سیالکوٹی کا مباحثہ ہو گیا۔ حاشا و کلا کہ انبیاء کرام جو تلاوت آیت اور تعلیم کتاب و حکمت کے لئے آتے

ہیں یہ مجادلانہ انداز بھی اور مخاصمانہ طریق مناسبت رکھتے ہوں!

اگر ایک لمحہ کے لئے بھی یہ طریق تفسیر تسلیم کر لیا جائے تو ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کر لینا پڑے گا کہ دنیا کے سارے نبیوں اور رسولوں کی سب سے بڑی بڑائی یہ تھی کہ وہ منطقی اور متکلم تھے۔ لیکن اگر یہی معیار نبوت ہے تو دنیا کا سب سے بڑا نبی ارسطو تھا جس نے سب سے پہلے منطق کے اصول و قواعد سے دنیا کو آشنا کیا نہ کہ ابراہیم خلیل اور محمد ابن عبداللہ علیہما الصلوٰۃ والسلام جن کا لکھنے پڑھنے سے آشنا ہونا بھی ثابت نہیں۔

(۲) اب غور کیجئے اس مکالمہ کو مناظرہ قرار دے کر کس طرح انہوں نے اپنے آپ کو مشکلات سے دوچار کر دیا ہے۔ فن مناظرہ وغیرہ کے لحاظ سے پہلی چیز فریقین کی حیثیت کا تعین ہے۔ یعنی ان میں کون مدعی ہے کون منکر۔ پھر مستدل کے واجبات ہیں۔ اور مجیب کے فرائض ہیں۔ جو مدعی ہو اسے دلیل پیش کرنا چاہیے جو منکر ہو اسے توڑ کرنا چاہیے۔ چونکہ مقصود اس کارخانہ سے اسکات خصم ہے اس لئے تمام اصول و آداب اس محور کے گرد حرکت کرتے ہیں۔

امام رازی اور متکلمین کے اصول تفسیر یہی ہیں اور آپ بھی انہیں کے قدم بہ قدم چلنا چاہتے ہیں۔ آپ خود اپنے استفسار میں لکھتے ہیں۔

"یہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کا مناظرہ ہے جس میں نمرود کی حیثیت خدائی کے مدعی کی ہے اور حضرت ابراہیم اس کے زعم باطل کا بطلان ثابت کرنا چاہتے ہیں۔"

سوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم مناظر مصطلح قوم کیوں ہوں؟ اگر وہ مناظر ہوں تو

کیوں ان تمام گھوڑے اڑ سے قاعدوں کے پابند ہوں جو علوم وضعیہ کی تدوین کے بعد ہم نے اپنے اُوپر لازم کر رکھے ہیں؟ کون سی عقل کی قطعیت اور وحی کی تنزیل موجود ہے کہ حضرت ابراہیم کو بھی ان قواعد کلام کی پابندی کرنا چاہیئے جو "رشیدیہ" میں ہم رٹ چکے ہیں، یا جنہیں بحر العلوم نے اپنے حواشی میں لکھا ہے؟

"مناظرہ کے لئے یہ جائز نہیں"، اور "مستدل کے لئے یہ ضروری ہے"۔ سوال یہ ہے کہ کیوں جائز نہیں، کیوں ضروری ہے اور ان اصول موضوعہ اور قواعد مصنوعہ کے انبار درس کیوں پابند ہوں؟

کیا مصیبت ہے کہ قرآن عربی میں اُترتا ہے تمام فصحا اس کی فصاحت کے آگے سر بسجود ہو جاتے ہیں۔ لیکن چار سو برس کے بعد ہمارے مفسرین بحث کرتے ہیں۔ کہ "سیبویہ" اور "کسائی" کے بنائے ہوئے قواعد کے مطابق وہ ٹھیک ہے یا نہیں۔

چار ہزار برس پہلے ایک داعی الی الحق فطرتِ الٰہی اور وجدان انسانی کے مطابق رشد و ہدایت کا دروازہ کھولتا ہے۔ لیکن پانچویں صدی ہجری میں امام رازی آکر بحث کرتے ہیں کہ منطق طریق مناظرہ کے مطابق یہ مکالمہ صحیح ہے یا نہیں اور پھر چودھویں صدی میں آپ آتے ہیں کہ مشکلات حل نہیں ہوئیں۔

(۳) ایک دوسری بنیادی غلطی جو یہاں اُلجھاؤ پیدا کر رہی ہے حضرت ابراہیمؑ کے مخاطب کی اعتقادی حیثیت ہے۔ مفسرین سے ایک تسامح قرآن حکیم کے ان مقامات کی تفسیر میں ہوا ہے۔ جہاں بابل کے اُس بادشاہ کا جسے نمرود کہتے ہیں اور مصر کے فرعون کا، جو کچھ بھی اُس کا نام ہو، ذکر کیا گیا ہے۔

قرآن حکیم نے ان کا ذکر ایسے لفظوں میں کیا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ

رو اس خدا کے اقرار کے منکر تھے جس کی دعوت حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ نے ان کے سامنے پیش کی تھی اور وہ خود اپنی خداوندی کا دعویٰ رکھتے تھے۔

چونکہ مفسرین کے پیش نظر صحیح تاریخی معلومات نہ تھیں۔ اس لیے وہ صحت کے ساتھ اس انکار اور ادعا کی نوعیت متعین نہ کر سکے۔ یہ خیال پیدا ہو گیا کہ یہ دونوں بادشاہ اپنی خدائی کے اس معنی میں مدعی تھے کہ وہی صانع کائنات ہیں۔ چنانچہ دونوں مقامات کے تمام مکالمات و مخاطبات میں فریق ثانی کی یہی اعتقادی حیثیت قرار دی گئی ہے۔ چونکہ یہ بات حقیقت کے خلاف ہے اس لیے طرح طرح کے نئے الجھاؤ پیدا ہو گئے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف دنیا کی تاریخی معلومات کی بنا پر بلکہ خود قرآن کریم کی تصریحات کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ آج تک انسان نے اس معنی میں خدا ہونے کا دعویٰ کیا ہی نہیں ہے کہ وہ صانع کائنات ہے۔ ایسا دعویٰ کرنا بلکہ ایسے ادعا کا تخیل کرنا فطرت انسانی کے اس درجہ خلاف ہے کہ کوئی انسانی ہستی اس کی جرأت ہی نہیں کر سکتی۔ تحریر اندازہ سے زیادہ بڑھتی چلی جاتی ہے اس لیے اس مقام کے دلائل و مباحث درج نہیں کیے جا سکتے۔ حقیقت حال سمجھنے کے لیے حسب ذیل اشارات کافی ہوں گے۔

اولاً نوعِ انسانی نے خدا کی صفات کے تصور میں جو ٹھوکریں کھائی ہیں منجملہ ان کے ایک عالمگیر گمراہی شاہیت اور الوہیت کا تشابہ ہے یعنی شاہیت کے اختیارات نے بھی مافوق الفطرت اختیارات کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ جب کبھی کوئی انسان اپنی غیر معمولی جسمانی قوتوں سے مخالفوں کو زیر کر کے بادشاہ بن جاتا ہے لوگ خیال کرتے وہ دیوتاؤں کا انسانی مظہر ہے۔ بلکہ خود ہی دیوتا ہے۔ پھر جب شاہیت نے نسل و خاندان کا سلسلہ اختیار کر لیا تو گویا انسان کا شاہی نسل سے ہونا اس کے دیوتائی رشتوں کی دلیل

سمجھا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ اس عقیدے نے پوری طرح ایک مسلّمہ صورت اختیار کر لی کہ بادشاہ انسان نہیں ہے، انسانیت سے بلند تر ہستی ہے، اس کی طاقت بھی الٰہی طاقت اور اس کا حکم بھی خدائی حکم ہے۔

قرآن حکیم نے مصر و بابل کے جن دو بادشاہوں کا حال بیان کیا ہے، ان کی اور ان کی قوم کی گمراہی یہی تھی۔ وہ اپنی قوم میں ایک دیوتا کی طرح مانے جاتے تھے اس لئے نہیں کہ ان دو انسانوں نے خصوصیت سے اس کا دعویٰ کیا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ وہ بادشاہ تھے اور بادشاہ کے لیے ایسا ہی اعتقاد پیدا ہو گیا تھا۔

ثانیاً اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ مفسّرین کا نمرود اور فرعون تا جی دو انسانوں کو خدائی کا مدّعی سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ جس طرح کی خدائی کے یہ مدّعی تھے اس طرح کی خدائی کا اعتقاد اس عہد کے بے شمار بادشاہوں اور بادشاہی کے سلسلوں کے لئے رہ چکا ہے۔ خود ہندوستان میں بادشاہ کے لیے ایسا ہی اعتقاد موجود تھا حتّی کہ ان کا سلسلۂ نسب چاند سورج سے ملا دیا گیا تھا۔ ناتاریوں کی ابتدائی تاریخ بھی اس کی شہادت دیتی ہے۔ بنو اسرائیل نے جب شام اور فلسطین پر قبضہ کیا تو جو قومیں وہاں آباد تھیں، ان کا بھی اپنے بادشاہوں کی نسبت ایسا ہی خیال تھا خود تورات اور قرآن نے حضرت موسیٰؑ کی مصری زندگی کے جو واقعات بیان کئے ہیں ان کا تعلق بھی ایک بادشاہ سے نہیں ہے دو بادشاہوں سے ہے جو یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے تھے۔ ایک فرعون وہ ہے جس کے محل میں حضرت موسیٰؑ پیدا ہوئے دوسرا وہ ہے جو ان کا تعاقب کرتا ہوا خلیج سویز میں غرق ہوا۔

اگر فرعون کے ادعاء الوہیت سے مقصود یہ ہوتا کہ وہ کسی ایک انسان کا شخصی

اور عام تھا تو ظاہر ہے بغیر کسی امتیاز کے دونوں کی نسبت ایک ہی طرح کی اوصاف و کیفیت قرآن کیوں ظاہر کرتا۔

در اصل قرآن نے اسی لیے ان کے ناموں کی جگہ ان کا عام لقب "فرعون" استعمال کیا ہے۔ کیونکہ کسی ایک بادشاہ کا تمرد و طغیان دکھلانا مقصود نہیں تھا۔ تمام فراعنہ کا تمرد و طغیان دکھلانا مقصود تھا۔

بہر حال قرآن حکیم نے ان دونوں بادشاہوں کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ انسانی گمراہی کی ایک خاص حالت کا نمونہ دکھلا دے۔ اس نوع کی گمراہی کے لیے یہ کامل قسم کے نمونے تھے اس لیے انہیں کو بطور مثال کے چن لیا گیا۔ باقی رہے فرعون کے وہ متکبرانہ و سرکشانہ اقوال جو قرآن حکیم نے نقل کیے ہیں تو ان میں ایک جملہ بھی ایسا نہیں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے کو خدا یعنی صانع کائنات سمجھتے تھے۔ چونکہ مفسرین نے یہی مطلب ٹھہرا لیا تھا اس لیے ان کی نظر آیات کے صاف صاف مطلب کی طرف نہیں گئی دوسری وادیوں میں پہنچ گئے۔

نمرود: آیت زیر نظر میں جس بادشاہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی شخصیت بھی صحیح طور پر متعین نہیں کی گئی۔ عام طور پر مشہور ہے کہ وہ نمرود تھا لیکن بابل اور نینوا کے آثار قدیمہ سے جس قدر معلومات فراہم ہو چکی ہیں ان سے اس خیال کی تصدیق نہیں ہوتی "نمرود" سے مقصود وہ بادشاہ ہے جس کے خاندان نے سب سے پہلے بابل پر حکمرانی کی تھی اس خاندان کا سب سے زیادہ مشہور شخص "آور نمو" تھا جس کے سوانح حیات کی منقش اینٹیں جرمنی و عملی کوششوں سے سنہ ۱۹۰۰ء میں برآمد ہوئی ہیں ان اینٹوں کی عبارت سے جو خط میخی میں کندہ ہیں معلوم ہوتا ہے کہ نمرود اور اس

کے خاندان کا زمانہ دو ہزار سات سو برس قبل مسیح تھا۔ اگر تورات کے بیان تسلیم کر لیے جائیں تو حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ دو ہزار تین سو برس قبل مسیح لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حساب سے حضرت ابراہیمؑ کا ظہور نمرود سے کئی سو برس بعد ہوا ہے۔ ان کے زمانہ میں نہ حضرت نمرود کی بلکہ اس کے خاندان کی بھی حکومت باقی نہیں رہی تھی۔ خاندان نمرود کے دو سو برس بعد بابل میں ایک نیا سلسلہ شاہی قائم ہوا جسے "ایلامی" خاندان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس خاندان کا ایک بادشاہ دو ہزار تین سو برس قبل مسیح بابل میں حکمران تھا جس کا نام "کاردو لاعومر" تھا۔ غالباً یہی بادشاہ حضرت ابراہیمؑ کا معاصر تھا اور اسی سے ان کا یہ مکالمہ ہوا۔

بابل کے آثار میں اس بادشاہ کی تصویریں اور بعض فرامین کی اینٹیں بھی ملی ہیں ان کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت خود سر اور جبار تھا اس کی نسبت یقین کیا جاتا تھا کہ آسمانی دیوتاؤں کا قہر و جبروت اس کے اندر مجسم ہو گیا ہے یہ اوصاف ٹھیک ٹھیک اس متکبرانہ انداز گفتگو کے مطابق ہیں جو اس مکالمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح عربوں میں شاہان روم "قیصر" شاہان ایران "کسریٰ" اور شاہان مصر "فرعون" کہے جاتے تھے۔ اسی طرح بابل کے بادشاہوں کے لئے "نمرود" کا لفظ بطور لقب کے مشہور ہو گیا تھا۔ یہ تلقیب بے اصل بھی نہ تھا کیونکہ جس طرح روم میں "سیزر" اور ایران میں "خسرو" بادشاہوں کا نام رہ چکا ہے۔ اسی طرح بابل کے پہلے فرمانروا کا نام نمرود تھا۔

پس ابتدا میں جب لوگوں نے کہا ہوگا۔ کہ مکالمہ نمرود سے ہوا تو ان کا مقصود یہ ہوگا کہ بابل کے ایک بادشاہ سے ہوا تھا۔ یہ مطلب نہ ہوگا۔ کہ نمرود

نامی ایک انسان سے ہوا تھا۔

رابعاً یونانی مورخوں کے بیانات اور علم الآثار کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل بابل کواکب پرست تھے اسی کواکب پرستی نے انہیں علم ہیئت کے مبادیات سے واقف کیا تھا۔ ان کا اعتقاد تھا کہ اجرام سماویہ کائنات کی ایسی ملکوتی ہستیاں ہیں جنہیں تدبیر و تصرفِ عالم کی تمام قوتیں حاصل ہیں۔ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے انہیں کے عمل و تصرف سے ہوتا ہے۔ ان میں سات ستارے بڑے دیوتا ہیں اور سورج ان سب میں بڑا ہے۔ آج کل علم نجوم کے نام سے جو خرافات دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ ہندوستان اور بابل ہی کی کواکب پرستی کا بقایا ہیں۔

اپنے بادشاہ کی نسبت ان کا بھی وہی اعتقاد تھا جو اس عہد کی تمام قوموں کا رہ چکا ہے یعنی وہ سورج دیوتا کے زندہ مظہر سمجھے جاتے تھے۔

اب آیت زیر تدبیر پر غور کیجئے

اے پیغمبر! کیا تمہیں اس شخص کا حال نہیں معلوم جس نے محض اس وجہ سے کہ خدا نے اسے بادشاہت دے رکھی تھی جہل و غرور میں سرشار ہو کر ابراہیمؑ سے اس کے پروردگار کے بارے میں حجت کی جب ابراہیم نے کہا میرا پروردگار وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے تو اس نے کہا کہ یہ تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ میں جسے چاہوں ماروں اور جسے چاہوں زندگی بخش دوں۔ اس پر ابراہیمؑ نے کہا اچھا اگر ایسا ہی ہے تو خدا ہمیشہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تم مغرب سے نکال دکھاؤ یہ سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اور اللہ کا قانون یہ ہے کہ ظلم کرنیوالوں پر

ہدایت کی راہ کبھی نہیں کھلتی (۲/۱۰۴)

(۱) سب سے بڑا اُلجھاؤ جو اس آیت کی تفسیر میں پڑ گیا ہے وہ حضرت ابراہیمؑ کا انداز سخن ہے۔ جب مخاطب نے ایک ایسی بات کے جواب میں جو اثباتِ مدعا کے لیے قطعی اور نہایت درجہ واضح تھی جہل و غرور سے ایک نہایت درجہ لغو بات کہہ دی تو حضرت ابراہیمؑ نے نہ تو اپنی بات کی مزید تشریح کی نہ مخاطب کی اس کے جہل و نافہمی پر تنبیہ کیا۔ بلکہ فوراً پہلی بات چھوڑ کر ایک دوسری بات کہہ دی۔ ہمارے متکلمین کی نظر میں چونکہ انبیاء کرام کی بھی سب سے بڑی فضیلت یہی تھی کہ وہ مناظر اور منطقی تھے اس لئے مفسرین نے اس کی توجیہیں کی ہیں۔ بڑی تحقیق کی بات جو حضرت امام رازی نے ڈھونڈ نکالی ہے۔ یہ ہے کہ یہ دو مختلف دلیلیں نہیں تھیں ایک ہی دلیل کی دو مختلف مثالیں تھیں۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے مفسرین متکلمین ایک مناظرہ کی حیثیت سے اس مکالمہ پر بھی نظر ڈالتے ہیں اور قدرتی طور پر چاہتے ہیں کہ ایک شاطر مناظر کی طرح حضرت ابراہیمؑ بھی اپنی بات پر اڑ جاتے اور خواہ ان کا مخاطب سمجھ سکتا یا نہ سمجھ سکتا یہ اسی پر ڈٹے جھگڑتے رہتے۔ اگر اس نے جہل و غرور سے ایک لغو بات کہہ دی تھی تو چاہیئے تھا کہ یہ اس کی لغویت اور جہالت پر ایک لمبی چوڑی تقریر فرماتے پھر اگر وہ اس کے جواب میں بھی کوئی کج بحثی کر دیتا تو یہ اس کے جواب الجواب میں آستینیں چڑھا لیتے یہاں تک کہ صرف اپنی دلیل کی شرح و توضیح اور جواب ہی میں تمام کر دیتے۔

شاید ہمارے مفسرین بھول گئے اور انہیں یاد نہیں رہا کہ ابراہیم خلیلؑ داعیِ حق تھے مناظر و مجادل نہ تھے۔ ان کا کام یہ نہ تھا کہ کسی خاص دلیل پر اڑ جاتے یا مخاطب کے اظہارِ جہل و عجز کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیں۔ ان کا کام یہ تھا کہ گمگشتہ دلوں کو سچائی

کی راہ دکھا دیں وہ دلیلیں بے تحفظ کے لئے نہیں بلکہ حق اور ایمان کی حفاظت کے لئے اٹھتے تھے
اس مکالمہ میں تو حضرت ابراہیمؑ نے اتنا ہی کیا کہ ایک بات چھوڑ کر دوسری بات کہہ دی
اور اسی پر ہمارے مفسرین چراغ پا ہو رہے ہیں لیکن انہیں معلوم نہیں انبیاء کرام کا طریق
دعوت تو یہ ہے کہ اگر نوسو ننانوے باتیں کہہ کر چھوڑ دینی پڑیں اور ہزارویں بات سے مخاطب کے
اندر فہم و بصیرت پیدا ہو سکے تو انہیں ایسا کرنے میں بھی کچھ تامل نہ ہوگا وہ ایک کے بعد ایک سیکڑوں
باتیں چھوڑتے چلے جائیں گے۔ یہاں تک کہ مخاطب کے دل کا دروازہ کھل جائے اور حقیقت و سچائی
کی جھلک دیکھ لے۔

## طبیب اور داعی

افسوس قرآن کہاں لیجانا چاہتا تھا اور دنیا نے اسے سر پر رکھ کر کدھر کا رخ کیا۔
ہمارے مفسرین متکلمین ارسطو کی منطق اور یونانیوں کی دانش فروشیوں میں ایسے گم ہو گئے
کہ انہیں دوسری راہوں کی خبر ہی نہیں رہی۔ حالانکہ دنیا میں صرف مناظر اور منطقی ہی نہیں ہوتے
طبیب اور معالج بھی ہوتے ہیں۔

طبیب کا فرض کیا ہوتا ہے۔ کیا یہ ہوتا ہے کہ مریض سے اس کی ایک ایک بات پر لڑے
اور مناظرہ کرے۔ نہیں ہزار بار نہیں۔ اگر طبیب طبیب حاذق ہے تو اس کی ساری قابلیت صرف
اسی نقطہ میں مرکوز رہے گی کہ کسی طرح مریض کو شفا حاصل ہو۔ بسا اوقات ایسا ہوگا۔ کہ وہ مریض
کے لئے ایک غذا تجویز کرے گا۔ اصول طب کے لحاظ سے غذا بہترین غذا ہوگی۔ لیکن طبیب بہتر
نسخہ اور بہتر غذا تجویز کر سکتا ہے۔ بہتر معدہ خلق نہیں کر سکتا۔ بہت ممکن ہے کہ مریض کا معدہ اتنا
قوی نہ ہو کہ وہ اس غذا جیسی قوی غذا کا متحمل ہو سکے۔ جونہی طبیب کو معلوم ہوگا تغیر کرنا ہوگا

ہوئی غذا اسے پچ نہیں سکتی وہ فوراً اسے ترک کر کے دوسری غذا تجویز کر دے گا۔ اگر دوسری غذا بھی مریض ہضم نہ کر سکا تو عجب نہیں تیسری غذا تجویز کر دے بلکہ ہو سکتا ہے چوتھی اور پانچویں تک نوبت پہنچے۔ جب تک مریض غذا ہضم نہ ہو سکنے کی شکایت کرتا رہے گا۔ طبیب غذا بدلتا رہے گا۔ وہ کبھی یہ نہیں کرے گا کہ ایک غذا تجویز کر کے اس پہ اڑ جائے اور خواہ مریض ہضم کر سکے یا نہ کر سکے یہ وہی لقمے اس کے حلق میں ٹھونستا رہے۔ اگر ایسا کرے گا۔ تو یقیناً طبیب نہ ہو گا۔ نوعِ انسانی کا سب سے بڑا جاہل فرد اور سب سے بڑا قاتل ہو گا۔

انبیاء کرام کے اعمالِ دعوت کے لیے اگر انسانوں کے کسی عمل سے مشابہت پیدا کی جا سکتی ہے تو وہ مناظرین کا مناظرہ اور حکماء کی حکمت نہیں اطباء کا معالجہ ہے۔

طبیب جسم کا علاج کرتا ہے انبیاء روح کا روگ دور کرنا چاہتے ہیں۔

وہ بسا اوقات علم و یقین کی ایک دماغی غذا مریض کے سامنے رکھتے ہیں۔ غذا ہر طرح مفید اور بہتر سے بہتر ہوتی ہے لیکن انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ جہل و ضلالت نے مریض کی فکری حالت اس درجہ خراب کر دی ہے کہ یہ غذا اس کا دماغ ہضم نہیں کر سکتا جونہی انہیں اس حالت کا احساس ہوتا ہے ایک طبیب حاذق کی طرح فوراً غذا بدل دیتے ہیں۔ اور کوئی دوسری غذا جو اس کا معدۂ فکر ہضم کر سکے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ انہیں اس بات کی بالکل پرواہ نہیں ہوتی کہ پہلی غذا کیوں بدلنی پڑی۔ اس لیے کہ مقصود کسی خاص غذا کا کھلا دینا (یا اپنی تجویز کی ہوئی غذا پہ اڑ جانا) نہیں ہے بلکہ ایسی غذا کھلانا ہے جو مریض ٹھیک طور پہ ہضم کر سکے۔

ہضم کی استعداد کے لحاظ سے ہر مریض کی حالت یکساں نہیں ہوتی جو حال جسم کے لیے معدہ کا ہے وہی حال دماغ کے لیے فکر کا ہے۔ ذہن و فکر کا ایک بیمار ایسا ہو گا جو ایک خاص طرح کی

بآسانی قبول کر لے سکتا ہے لیکن ایک دوسرے مریض دل کے لیے وہی بات ناقابل ہضم ثابت ہوگی۔ انبیاء کرام علم و یقین کی بہتر توانائی رکھتے ہیں لیکن دماغ و فکر پیدا نہیں کر دے سکتے دودھ کے بہتر غذا ہونے پر کوئی حرف آ سکتا ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ کوئی بدنصیب مریض اپنا معدہ خراب کر چکا ہے۔ اور وہ دودھ جیسی عمدہ اور زود ہضم غذا بھی ہضم نہیں کر سکتا۔ یہی معنی ہیں اس آیۂ کریمہ کے کہ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۸ : ۵۶﴾ حالانکہ انبیاء کرام کے ہادی ہونے پر خود قرآن بار بار شہادت دے چکا ہے کہ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۲ : ۵۲﴾ تو مطلب یہی ہوا کہ پہلی قسم کی آیات میں استعداد اور قابلیت خلق کرنے کی نفی ہے اور دوسری میں استعداد رکھنے والوں پر سچائی کی راہ کھول دینے کا اثبات ہے۔

## بابل کا طبیب حق

کئی ہزار برس گزرے اس بیمارستان ہستی میں ایک طبیب حق ابراہیم خلیل ؑ بھی تھے۔ ان کا سابقہ بابل کے ایک مریض سے پڑا۔ یہ بادشاہی کے گھمنڈ کا روگی اور جہل و طغیان کی بیماریوں سے بدحال تھا۔ انہوں نے اس کے سامنے علم و بصیرت کی ایک غذا رکھی رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۔ یہ بہتر سے بہتر غذا تھی جو شک اور انکار کے کسی مریض کے لیے ہو سکتی ہے لیکن اپنے معدے کی صلاحیت مریض بالکل کھو چکا تھا۔ وہ اتنی ہلکی اور سادہ غذا بھی ہضم نہ کر سکا۔ جہل و طغیان کے ہیجان میں بول اٹھا اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۔ یہ جواب سن کر حضرت ابراہیم کو معلوم ہو گیا کہ غذا گو بہترین تھی لیکن مریض کے معدے میں اس کے ہضم کرنے کی صلاحیت نہیں ہے انہوں نے فوراً پہلی قاب ہٹائی اور ایک دوسری غذا پیش کر دی۔

"اچھا اگر ایسا ہے تو یہ دیکھو سورج ہمارے سر پر چمک رہا ہے یہ ہر روز پورب سے نکلتا ہے اور پچھم کی طرف ڈوب جاتا ہے۔ تم اسے ایک ہی مرتبہ پچھم سے نکال دکھاؤ۔"

یہ غذا ٹھیک اس کے معدہ کی استعداد کے موافق تھی۔ حلق سے اتری اور ہضم ہو گئی۔ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ اب اس میں کج بحثی کا دم خم نہ رہا دم بخود ہو کر رہ گیا خدارا غور کیجئے بات کتنی صاف اور دلآویز تھی اور مفسرین نے کس طرح اسے مشکلوں اور پیچیدگیوں کا گورکھ دھندہ بنا دیا۔ اگر حضرت ابراہیمؑ کا طریق بیان مجادلانہ ہوتا، ہدایت کانہ ہوتا تو وہ اپنی پہلی بات ہی پر مخاصم سے الجھ جاتے۔ وہ کہتے میرا مطلب جلانے مارنے سے یہ نہیں ہے جو تم سمجھتے ہو۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ اصل مدعا کی جگہ ایک خاص دلیل اور اس کے مفہوم کی بحث چھڑ جاتی اور مخاصم کے لئے حقیقت کے فہم و بصیرت کا موقع ہی نہ آتا۔ لیکن ان کی راہ ہدایت و دعوت کی راہ تھی انہوں نے ایک دقیقہ کے لئے بھی اپنی نظر اس مدعا سے نہیں ہٹائی جونہی معلوم ہوا کہ پہلی بات اپنے جہل و غرور کی وجہ سے وہ نہیں سمجھ سکا ہے تو بغیر کسی تامل کے اسے چھوڑ دیا اور ایک دوسری بات پیش کر دی۔ یہ بات اس کی فکری استعداد کے مطابق تھی: تیر ٹھیک نشانے پہ لگ گیا۔

(۲) میں نے سب سے پہلے مکالمے کے اسی پہلو پر نظر ڈالی۔ کیونکہ بغیر اس کے اس کی حقیقی نوعیت واضح نہیں ہو سکتی تھی۔ اب آیات کی ترتیب بیان کے مطابق پورے مکالمہ کی تفسیر سمجھ لیجئے۔

اَنْ آتَاهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ اس کی تفسیر اور اس کی ضمیر کے مرجع کے تعیین میں مفسرین

نے بیکار دماغ سوزی کی ہے۔ حالانکہ مطلب بالکل صاف تھا۔

یہ قرآن حکیم کا معجزانہ ایجاز بلاغت ہے کہ صرف ایک جملہ کہہ کر معاملہ کی پوری نوعیت آشکارا کر دی جس انسان نے حضرت ابراہیمؑ سے ان کے رب کے بارے میں کج بحثی کی تھی قرآن واضح کر دینا چاہتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ کونسی چیز تھی جس نے اس کے اندر گمراہی کا ایسا طغیان اور سرکشی کا ایسا ہیجان پیدا کر دیا کہ پروردگار عالم کا نام سن کر بھی اپنے تکبر اور خود پرستی کے دعووں سے باز نہیں آیا۔

یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ وہ بادشاہ تھا۔ یعنی یہ تاج و تخت کی بڑائی اور حکومت کے فانی اختیارات کا گھمنڈ تھا جس نے اسے اس درجہ مغرور اور خود غلط بنا دیا تھا۔

اس تصریح سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ قرآن حکیم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ شخص شخصاً خدائی کا مدعی تھا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو کیوں کہا جاتا کہ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ پس معلوم ہوا یہ بادشاہت کا گھمنڈ تھا اور بادشاہت کے گھمنڈ سے گمراہی کی ایسی ہی فکری حالت پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب اس بادشاہ کو ظلم و استبداد اور فساد و طغیان پر سرزنش کی اور پروردگار عالم کے احکام سے سرکشی کرنے کے نتائج سے ڈرایا تو وہ کج بحثی کرنے لگا۔ چونکہ وہ اپنے دیوتاؤں کی پرستش کرنے کے سوا اور کسی طریق عبادت سے آشنا نہ تھا اس لئے اس نے کہا

وہ تمہارا خدا کون ہے اور کہاں ہے جس کے بھروسہ پر تم تن تنہا میرے سامنے آ کھڑے ہوئے اور مجھ جیسے طاقتور بادشاہ کو بے باکانہ سرزنش کرنے کی جرأت کرتے ہو۔

حضرت ابراہیمؑ نے اس کے جواب میں کہا، تمہارے دیوتاؤں کی طرح میرا کوئی خاص دیوتا نہیں، میرا ایمان تو اس پروردگار عالم پر ہے جس کے قبضہ و تصرف میں تمام مخلوقات کی موت و حیات ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کا یہ ارشاد کوئی فلسفیانہ استدلال نہ تھا انہوں نے ایک ایسی سیدھی سادی بات کہہ دی تھی جس کا فطری طور پر ہر انسان کے دماغ میں اذعان موجود ہے بشرطیکہ اس نے اپنی خلقی بصیرت بالکل ضائع نہ کر دی ہو۔ بات بالکل صاف اور واضح تھی۔ لیکن بابل کا متکبر بادشاہ جو اپنی بادشاہی کی طاقتوں کے نشہ میں چور تھا، حضرت ابراہیمؑ کو زک دینے کے لئے اور اپنی دعوتِ ایمانی کی تحقیر کے لئے بول اٹھا۔ واہ یہ تمہارے خدا کی کونسی بڑی طاقت ہوئی کہ مارتا ہے اور جلاتا ہے یہ بات تو مجھے بھی حاصل ہے۔ ہزاروں لاکھوں انسانوں کی جان میرے قبضہ و تصرف میں ہے۔ میں بادشاہ ہوں جسے چاہوں قتل کر ڈالوں جسے چاہوں بخش دوں۔

بلاشبہ یہ جواب انتہا درجہ جہل و ضلالت کا جواب تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے کیا بات کہی تھی۔ اور اس مغرور نے اس کا کیا مطلب نکالا، چونکہ حضرت ابراہیمؑ کا طریقِ مخاطبت ہدایت کے لیے تھا جدل کے لئے نہیں اس لئے اس کی جاہلانہ بات پر بالکل متوجہ نہ ہوئے اور فوراً دوسری بات فرما دی "فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ" یہ بات سن کر اس متمرد کی ساری کج بحثی ختم ہو گئی اور اچانک حقیقت کی جھلک سامنے آگئی۔

موت و حیات والی بات اگرچہ ایک حق پسند انسان کے لئے نہایت واضح بات تھی۔ لیکن اس مغرور جاہل کی فکری حالت شدتِ طغیان و غفلت سے اس قدر مسخ ہو چکی تھی کہ کج بحثی کی ایک راہ نکال ہی لی۔ لیکن یہ دوسری بات اس کی فکری حالت

کے مطابق اس درجہ اوقع فی النفس تھی کہ حقیقت کی طرف سے آنکھ بند کر لینے کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔

سورج سر پر چمک رہا تھا اور وہ ہر روز کی طرح آج بھی مشرق ہی کی طرف سے نکلتا دکھائی دیا تھا۔ اور مغرب ہی کی طرف غروب ہونے کے لئے ڈھل رہا تھا صدیوں سے ہزاروں برس سے ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے کبھی ایسا نہیں ہوا ہے کہ اس کی مقررہ رفتار میں یا طلوع و غروب کی جہتوں میں فرق پڑا ہو۔ پھر کیا دنیا کا کوئی حکمران، دنیا کا کوئی شہنشاہ، دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی ایسی ہے جو ایک دن کے لئے اس کا رخ بدل دے ایک دن کے لئے نہیں ایک گھنٹے کے لئے ایک دقیقہ کے لئے اس کی رفتار میں اپنی مرضی سے فرق ڈال دے۔

یہ حقیقت تھی جو اس جاہل و مغرور کے سامنے نمایاں ہو گئی۔ اگرچہ اس کی غفلت و شقاوت اس درجہ تک پہنچ چکی تھی کہ وہ اب بھی سر جھکانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ لیکن حقیقت کے سامنے آجانے سے شوخ چشمی سے کج بحثی کا دم خم بھی نہیں رہا۔ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ

(۳) اب آپ نے سمجھ لیا ہو گا کہ جس قدر شبہات پیدا ہوئے تھے فی الحقیقت ان میں سے کسی شبہہ کی بھی یہاں گنجائش نہیں، باقی رہا یہ شبہہ کہ جب مخاصم نے پہلی بات کے جواب میں ایک جاہلانہ دعویٰ کر دیا تھا تو دوسری بات کے جواب میں بھی کوئی نہ کوئی بات کہہ دے سکتا تھا تو اس شبہہ کی بھی اب کوئی گنجائش نہیں رہی۔

یہ شبہہ اس لئے پیدا ہوا تھا کہ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ کے معنی مناظرہ میں لاجواب ہو جانے کے سمجھے گئے تھے۔ لیکن جب ثابت ہو گیا کہ "بہت" سے یہاں مقصود بات بنانے میں لاجواب ہو جانا نہیں ہے۔ بلکہ ایک سچی بات سے متاثر ہو کر ہکا بکا رہ جانا

ہے تو ظاہر ہے کہ یہ شبہ کیوں وارد ہو؟ جب ایک حقیقت جس کے جھٹلانے اور نہ دیکھنے کی وہ کوشش کر رہا تھا اس کے سامنے بے نقاب ہو گئی تو اس میں کج بحثی کا دم خم باقی نہ رہا لاچار اور دم بخود ہو کر رہ گیا۔

(۴) اور چونکہ باوجود حقیقت کے نمایاں ہو جانے کے وہ اعتراف حق پہ آمادہ نہیں ہوا اس لئے فرمایا

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

خدا کا قانون ہدایت یہی ہے کہ جن لوگوں نے ظلم و طغیان کی راہ اختیار کر لی ہے ان پہ ہدایت و سعادت کی راہ نہیں کھلتی۔

# واقعۂ ایلاء و تخییر

ایلا شوہر اور بیوی کی اس علیحدگی کو کہتے ہیں کہ شوہر طلاق تو نہ دے مگر غصہ کی حالت میں کوئی قسم کھالے کہ اپنی بیوی کے پاس نہ جاؤں گا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کی زندگی میں ایک مرتبہ یہی صورت پیش آئی تھی ۔ آپ نے عہد فرمایا تھا کہ ایک ماہ تک ازواج مطہرات سے کوئی تعلق نہ رکھیں گے ۔ اس واقعہ کو کچھ مسیحی معلّمین نے ایسی روایات کی آمیزش کے ساتھ پیش کیا ۔ جو صحاح ستہ میں موجود نہیں ۔ البتہ بعض مورخین نے نقل کی ہیں ان روایات کو توڑ مروڑ کر اور ان کا بے محل اطلاق کر کے ایک مسیحی معلّم نے جس طرح گمراہی؟ غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی ۔ اس سے بعض لوگ یہاں تک متاثر ہوئے کہ حدیث ہی کی سند سے انکار کرنے لگے ۔ اس پر مولانا نے یہ بصیرت افروز مقالہ سپرد قلم فرمایا جس میں پچھ واقعہ کے ہر پہلو کو صحیح اور محققانہ روشنی میں پیش کیا گیا ہے ۔

[ واقعہ ایلا و تخییر پر ایک پادری کے احادیث سے سند لانے اور اس

سے متاثر ہو کر غلام سرور شاہ صاحب کا سر سید احمد خاں کے زرین اصول کے تتبع میں حدیث ہی کی سند سے انکار کر دینے پر مولینا ابوالکلام کو بجا طور پر دینی غیظ آ گیا اور پھر عالم غیض میں انہوں نے تفسیر، حدیث اور سیرت کی جو مشترک بحث چھیڑ دی ہے اور جس حسن سے اس مشکل سے عہدہ برآ ہوئے ہیں یہ سچ تو یہ ہے کہ انہیں کا حصہ ہے ]

مخالفین و اعداء اسلام جس قدر اعتراضات اسلام اور حضرت داعیٔ اسلام کے متعلق کرتے ہیں خواہ وہ آج پادری عماد الدین پادری فنڈر سر ولیم میور اور مارگولیتھ وغیرہ نے کئے ہوں یا اب سے صدہا سال پہلے ان معترضین نے جن کے جوابات ابن حزم نے "ملل والنحل" میں غزالی نے "تحفۃ الاریب" میں ابن تیمیہ اور ابن قیم نے "ارشاد الحیارٰی" وغیرہ میں دیئے ہیں۔ ان سب کی اصولاً دو ہی قسمیں ہیں۔

الف۔ وہ اعتراضات جو محض سوء فہم یا دانستہ تلبیس و اعراض عن الحق کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً قرآن کریم کے احکام جہاد و نکاح و طلاق کے متعلق جس قدر اعتراضات کئے جاتے ہیں یا اختلاف بیانات قرآن و کتب مقدسہ کی بنا پر جو کچھ کہا جاتا ہے ان کی بنیاد ایک صحیح اور واقعی تعلیم پر ہے اور یقیناً وہ احکام قرآن حکیم میں موجود ہیں۔ لیکن یا تو ان کی نسبت تعصب جہل سے غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں یا دانستہ ان کے رد و بطلان کی کوشش کی گئی ہے۔ یا سرے سے اس اصل ہی کو قابل اعتراض قرار دے دیا ہے؛ جس پر وہ تمام تعلیمات و احکام متفرع ہیں۔ غرضیکہ اس صورت میں اسلام کو ان باتوں کے لیے الزام دیا ہے جن کے وجود سے تو وہ منکر نہیں لیکن جن وجوہ و دلائل کی بنا پر الزام دیا گیا ہے ان کا منکر و مبطل ہے۔

ب ۔ یا پھر وہ اعتراضات ہیں جن کی بناء نہ تو کسی اسلامی تعلیم پر ہے اور نہ اسلام کے مسلمہ واقعہ پر ۔ نہ تو خود قرآن کریم میں ان کا وجود ہے اور نہ احادیث صحیحہ و معتبرہ میں ۔ ان کا دارومدار صرف ان بیانات و روایات پر ہے ۔ جو بعض مسلمان مصنفوں نے اپنی کتابوں میں کسی نہ کسی حیثیت سے درج کر دیئے ہیں یا عام طور پر مسلمانوں میں بیان کی جاتی ہیں اور افواہ عام پر چڑھ گئی ہیں مثلاً قصہ غرانیق اور واقعہ حضرت زینب وغیرہ مثلاً یہی واقعہ ماریہ قبطیہ جو آپ کے دوست کو ایک نہایت مکروہ و محرف صورت میں دکھلایا گیا ہے ۔ ان دو قسموں کے علاوہ بے شمار اعتراضات ایسے بھی ہیں جو محض افترا اور بہتان ہیں جیسے صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں مشرقی پادریوں نے مسلمانوں کی بت پرستی کے اکاذیب مشہور کر دیئے تھے اور جن کو موسیو کاستری نے اسلام اور سبانی اسلام میں مفصل بیان کیا ہے ۔

یا آج بھی ایسی صدہا باتیں اسلام کی طرف منسوب کر دی جاتی ہیں جن کی کوئی ادنیٰ اور ضعیف اصلیت بھی روایات اسلامیہ میں نہیں ہے ۔ لیکن یہ تمام اعتراضات یکسر عداوت و تعصب اور جہل و فساد کا نتیجہ ہیں جن کو خود صاحب نظر معترضین بھی تسلیم نہیں کرتے اور یہاں مقصود صرف قابل توجہ اعتراض ہیں نہ کہ افتراء محض ۔

جن لوگوں نے مخالفین و معترضین کے اسفار و کتب سے واقفیت حاصل کی ہے وہ تسلیم کریں گے کہ اعتراضات کا سب سے زیادہ حصہ در اصل دوسرے ہی قسم پر مشتمل ہے اور پہلی قسم کے اعتراضات گو اصلاً زیادہ اہم ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے اور اعداء کو اسلام کی تضحیک و تحقیر میں بھی ان سے نسبتاً بہت کم مدد ملتی ہے ۔ یہ صدہا کتابیں جو اسلام کی مخالفت میں لکھی گئی ہیں یا لکھی جا رہی ہیں انہیں اٹھا کر دیکھئے اور ان

تمام اعتراضات پر نظر ڈالیے جو ان میں پیش کیے گئے ہیں ان میں بہت تھوڑا حصہ ان اعتراضات کا ہو گا جو براہ راست قرآن کریم کی تعلیمات یا احادیث معتبرہ و مسلمہ کی بناء پہ کیے گئے ہیں اور تمام مجلدات یکسر انہیں مطاعن و معائب سے لبریز ہوں گی جو عام روایات مفسرین و کتب سیرت و مغازی کی بنا پہ کئے گئے ہیں اور جن میں یہ مقدمہ ضمناً تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اسلام و پیروان اسلام کے لئے ہر مسلمان مصنف کا بیان حجت و برہان ہے۔

سب سے بڑا الطبیعی وسیلہ اعداء اسلام کے پاس یہ ہے کہ حضرت داعی اسلام کی حیات طیبہ و مقدسہ کو دنیا کے سامنے ایسی مکروہ و معیوب شکل میں پیش کیا جائے جس کے دیکھتے ہی طبائع میں نفرت و کراہیت پیدا ہو جائے اور اسلام کے متعلق کسی حسن ظن کے پیدا کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔

یہ مقصد پہلی قسم کے اعتراضات سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم میں جہاد کا حکم ہے۔ تعداد ازدواج کی اجازت ہے۔ طلاق کو جائز بتلایا ہے۔ قوم عاد و ثمود کے تاریخی مقامات کا ذکر ہے۔ حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے خانہ کعبہ بنانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت مریمؑ کو ملامت کرنے والوں نے یا اخت ھارون کہا ہے۔ معترضین ان پہ نکتہ چینی کرتے ہیں احکام جہاد کو ظالمانہ جہاد بتاتے ہیں تعدد ازدواج اور طلاق کو اخلاقاً معیوب کہتے ہیں۔ قوم عاد و ثمود کے متعلق تاریخی ثبوت طلب کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی بنائے کعبہ کی دلیل توریت سے مانگتے ہیں۔ حضرت مریمؑ کا اخت ہارون ہونا ان کی سمجھ میں نہیں آتا ــــ تاہم ان تمام اعتراضات سے اسلام کے محاسن و فضائل پہ بالکل پردہ نہیں پڑ جا سکتا اور سننے والے کے لئے باقی رہ جاتا ہے کہ وہ اس کے دیگر احکام و تعلیمات کے متعلق حسن ظن قائم کرے یا بعض دیگر شرائع سے مقابلہ کر کے تسلی حاصل کرے۔ حضرت موسیٰؑ

نے تلوار سے کام لیا۔ حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ نے صد ہا ہی بیاں رکھیں اگر مخاطب ان الزامات کو صحیح مان بھی لے جب بھی زیادہ سے زیادہ یہی نتیجہ حاصل کر سکتا ہے کہ قرآن کریم اور کتب مقدسہ عتیقہ کو ایک درجہ میں رکھنا چاہیئے۔ لیکن برخلاف اس کے دوسری قسم کے اعتراضات و مطاعن اپنی معاندانہ تاثیر و نفوذ میں ان اعتراضات سے بالکل مختلف ہیں۔ ان میں اس زندگی کی تصویر دکھلائی جاتی ہے جو تعلیمات اسلامیہ کی حامل ہے اور جس کی رسالت و نبوت کی صداقت پر قرآن و اسلام کی حقانیت موقوف ہے۔

یہ تصویر نہایت مکروہ ہوتی ہے اور شیطان کفر و ضلالت اعدائے اسلام کے اندر حلول کر کے اس کے خال و خط درست کرتا ہے۔ انسانی معاصی و رذائل سے تمام اعمال سیئہ اس میں جمع کئے جاتے ہیں اور ایسے ایسے قبائح و فضائح کو اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جو نعوذ باللہ انسانی بد اخلاقی کی انتہا ہیں اور درجۂ نبوت و رسالت تو بہت اعلیٰ ہے ایک شریف و نیک اعمال شخص کی زندگی بھی ان معائب سے ملوث نہیں ہو سکتی۔ آج یورپ و امریکہ میں عام طور پر جو توحش اور تنفر اسلام کی طرف سے پھیلا ہوا ہے وہ زیادہ تر اسی تلبیس و شیطنت کا نتیجہ ہے۔ ان مفتریات کو سن کر ایک سادہ ذہن مخاطب اس درجہ اسلام سے متوحش ہو جاتا ہے کہ اس کے کسی حسن و فضیلت کا اسے تصوّر بھی نہیں ہو سکتا اور ہمیشہ کے لئے حسنِ ظن و تلاشِ حقیقت کا سدِ باب ہو جاتا ہے۔

پس فی الحقیقت قسم اول کے اعتراضات اس درجہ اسلام کے لئے مضر نہیں ہیں۔ جس قدر دوسری قسم کے۔ اور آج اعدائے اسلام کے ہاتھ میں سب سے زیادہ خطرناک حربہ یہی مفتریات ہیں۔

کسی مذہب کے متعلق یہ کہنا کہ وہ بزور شمشیر پھیلا، سننے والے کو اس درجہ متاثر

نہیں کر سکتا۔ جس قدر اس افترا کا پیش کرنا کہ نعوذ باللہ اس کا بانی اپنے متبنیٰ کی بیوی کو طلاق دلا کر اسے خود اپنے نکاح میں لے آیا۔

اس قسم کے تمام مطاعن و معائب میں جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں ان کا ایک بڑا حصہ تو خود معترض کے افکار کفر و ضلالت کا نتیجہ ہوتا ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں۔ البتہ معاندانہ حذف و اضافہ اور تحریف و تلبیس کو الگ کر دینے کے بعد دیکھا جائے تو اس کی بنیاد میں کوئی بات ایسی ضرور نکل آتی ہے۔ جو یا تو کسی مسلمان مصنف کا بیان ہے۔ یا کوئی روایت اور اثر ہے یا پھر کوئی قصہ ہے جو عام مسلمانوں کی زبانوں پر چڑھ گیا ہے۔

معترض عموماً یہ کرتے ہیں کہ اسلامی تصنیفات کے متعلق ایک سطحی اور سرسری واقفیت حاصل کر کے چند کتابیں تفسیر اور سیرت یا قصص و فضائل کی اپنے سامنے رکھ لیتے ہیں اور اس میں جس قدر روایتیں اس قسم کی پاتے ہیں جن کی بنا پر اسلام کی زندگی پر طعن و قدح کیا جا سکتا ہے۔ انہیں کمال ابلیسانہ ہوشیاری اور پوری مفتریانہ چالاکی کے ساتھ یکجا کر لیتے ہیں پھر اپنے اکاذیب و مفتریات کا ان پر اضافہ کرتے ہیں۔ اور مفید مطلب توجیہہ و تعلیل کے ساتھ ترتیب دے کے اس طرح پیش کر دیتے ہیں کہ ناواقف ان کے استدلال اور استشہاد سے مرعوب ہو جاتا ہے ۔۔ وہ عموماً کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں اور بعض اوقات ان روایات کو نقل بھی کر دیتے ہیں۔ جن سے ان کا استدلال ہوتا ہے۔ امریکن مشن نے عربی زبان میں جو کتاب بلاد مصر و شام کے لئے شائع کی تھی جو چار ضخیم جلدوں میں ختم ہوئی تھی۔ اور جس کا نام "الھدایہ" ہے۔ اس میں اول سے لے کر آخر تک ہر اعتراض کے ساتھ کوئی نہ کوئی روایت بھی پیش کی ہے۔ غیروں کے علاوہ خود ناواقف مسلمانوں پر بھی ان حوالوں کا اثر پڑتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ جب خود اسلامی روایات میں یہ

واقعات موجود ہیں تو ان سے کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے۔

اس قسم کی روایات زیادہ تر تفاسیر اور عام کتب سیر و تواریخ میں ہیں یا حضرت شاہ ولی اللہ کی تقسیم مدارج کتب حدیث کے مطابق تیسرے اور چوتھے درجے کی کتابوں سے اس قسم کے واقعات لئے جاتے ہیں۔

## فتنۂ اصلاح و اجتہادِ جدید

یہ ایک نہایت اہم اور اصولی بحث ہے کہ اس قسم کے مطاعن اور اعتراضات کے لئے صحیح اور حقیقی طریقہ جواب اور رد کا کیا ہے۔ ہمارے زمانے میں ایک نیا گروہ مصلحین اور متکلمین کا پیدا ہوا ہے جس نے اپنی قابلِ تعریف بیداری و باخبری سے پہلے پہلے ان اعتراضات سے واقفیت پیدا کی ہے اور چاہا کہ ان مطاعن کی آلودگی سے اسلام کے دامن کی تنزیہہ و تقدیس ثابت کرے اس کی مستعدی قابلِ تعریف اور اس کی نیت مستحقِ تحسین لیکن افسوس ہے کہ جس کام کو کرنا چاہتا تھا اس کے لئے مستعدی و آمادگی تو اس کے پاس ضرور تھی پر اسباب و وسائل یکسر مفقود تھے اس کا دماغ کارکن اور اس کا فہم طالبِ اجتہاد تھا۔ لیکن نہ تو اس کے پاس نظرِ علم بجاتی جو معین مقصد ہوتی اور نہ ہی فکر و افکار تھی جو سامان مہیا کرتی۔ نہ تو اسے علوم اسلامیہ کی خبر تھی نہ فنِ حدیث و آثار پر نظر تھی نہ اصولِ فن سے اس نے واقفیت حاصل کی اور نہ اسفار و مصنفاتِ محققین و ائمہ قوم پر نظر ڈالی جس طرح اسلام کے حریفوں نے اس پر طعن کرتے ہوئے اپنے جہل کا اعلان کیا اسی طرح اسلام کے ان حامیوں نے ان کا جواب دیتے ہوئے صرف اپنے بے خبرانہ اجتہاد ہی کو کافی سمجھا چونکہ انہیں اپنی قوت کی خبر نہ تھی اور صرف اپنی فکر و رائے

ہی پر اعتماد تھا۔ اس لئے وہ حریفوں کی سطوت سے مرعوب ہو گئے اور قابلِ اعتراض روایات و بیانات کا انبار دیکھ کر اس طرح گھبرا گئے کہ ان میں رد و تحقیق کے لئے کوئی قوت فعال باقی نہیں رہی۔ اور ان کا رشتۂ کار حریفوں کی قوت اور استیلاء اثر کے ہاتھوں میں چلا گیا۔

اس گھبراہٹ میں انہوں نے اپنے تئیں بالکل مجبور پایا اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھا کہ اپنے کسی جدید خود ساختہ اصول کی بناء پر احادیث و روایات کی صحت ہی سے قطعی انکار کر دیں اور اس طرح ان کے جواب کی ذمہ داری سے بآسانی سبکدوش ہو جائیں۔ پس بجائے اس کے کہ وہ ان روایات کی حقیقت و اصلیت کو واضح کرتے انہوں نے اس قسم کے مجتہدانہ اصول وضع کرنا شروع کر دیئے جن کو اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو معترضین کے فتنہ سے بھی بڑھ کر ایک داخلی فتنۂ عظیم اسلام میں پیدا ہو جائے نعاذ باللہ من شرہا و من شر الجہل و الفساد!

مثلاً انہوں نے ان اعتراضات سے بچنے کے لئے جو احادیث کی بناء پر کیے جاتے ہیں سرے سے فن حدیث ہی کی تحقیر و تضحیک شروع کر دی حتیٰ کہ صاف فیصلہ کر دیا کہ چونکہ حدیثیں اکثر خبر احاد ہیں اور خبرِ احاد مفید یقین نہیں اس لیے حدیث فی الحقیقت کوئی شئی نہیں ہے۔ اس کے جواب کے ہم ذمہ دار نہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

اس طرح انہوں نے ایک فتنہ سے بچنے کے لیے اپنے وجود کو دوسرا فتنہ بنا دیا اور دشمن نے چونکہ مکان کے شاگرد پیشہ پر قبضہ کر لیا تھا اس لئے اس کے ہلاک کرنے کے لئے پوری عمارت میں آگ لگا دی۔ وقت تفصیل متحمل نہیں اس لئے میں نہایت سرسری اشارات کروں گا کہ اگر فن وارباب فن پر ان بے خبروں کی نظر ہوتی تو وہ سمجھتے کہ مخالفین

کے حملوں سے بچنے کے لئے اس مہلک اجتہاد کی کوئی ضرورت نہیں ہے ایک محفوظ و مصئون طریق کار پیشتر ہی سے موجود ہے اور بغیر اس کے کہ کسی جدید مصلح و مجتہد کو اپنے عزاز اجتہاد کے اعلان کی ضرورت ہو، خود محققین فن نے اس بارے میں جو اصول و قواعد وضع کر دیئے ہیں انہیں کے مطابق ہم بہتر سے بہتر حق تحقیق و دفاع ادا کر سکتے ہیں۔

## اصول بحث و مسلک صحیح و مستقیم

اصل یہ ہے کہ یہ تمام نتائج جہل و بے خبری کے ہیں اور وہ بے خبری ہمارے مخالفین اور ہمارے نئے حماۃ و مصلحین دونوں کے حصے میں آئی ہے۔ ہمارا اولین فرض یہ ہے کہ ہم معترضین کو بتا دیں کہ قرآن کریم کے بعد ہمارے لئے حجت و دلیل کونسے مصادر علوم ہو سکتے ہیں۔ نیز یہ کہ کیا کسی روایت کا کسی کتاب میں درج ہونا اس کے لئے کافی ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے حجت ہو سکے اور اس بارے میں ائمہ سلف نے کچھ اصول مقرر کئے ہیں یا نہیں۔

دراصل انہیں دو سوالوں کا جواب آج کل صدہا داخلی و خارجی مباحث و اختلاف کے لئے بمنزلہ اصل و اساس کے ہے اور جس قدر مشکلات ہمیں نظر آتی ہیں اور جس قدر ٹھوکریں نئے مصلحین نے کھائی ہیں وہ تمام تر اسی اصول بحث کے افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔

ان دو سوالوں کا مختصر جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کے بعد یقیناً اور حتماً احادیث صحیحہ کا درجہ ہے۔ اور بغیر کسی خوف و تامل کے اس کا اعتراف کر لینا چاہئیے کہ حدیث صحیح ایک ایسا مصدر علم ہے جو ہمارے لئے قطعی دلیل اور حجت ہو سکتا ہے اور جس طرح ہم اپنے داخلی اعمال میں احادیث کے معترف و معتقد ہیں بالکل اسی طرح خارج کے اعتراضات میں بھی ان کی

حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔

لیکن حدیث ایک مدوّن و منضبط فن ہے جس کے اصول و قواعد ہیں اور اس کی جمع و ترتیب کا کام صدیوں تک جاری رہا ہے۔ اس لئے صحت و اعتبار کے لحاظ سے مختلف طبقات و مدارج میں منقسم ہو گیا ہے۔ اس کی بنیاد انسانوں کی روایات پر تھی۔ اس لئے اصول شہادت کی بنا پر ضروری تھا کہ نقد و درایت کے اصول وضع کئے جاتے اور وضع کئے گئے۔

اس پورے کرۂ ارضی کے اندر جس میں انسان نے ہزار ہا برس کے تجارب و مساعی کے بعد صدہا علوم و فنون تک رسائی حاصل کی ہے اور ہر قوم نے علم کی تفتیش و تدوین میں حصہ لیا ہے، بے خوف دعویٰ کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کسی علم و فن کو بھی انسانی دماغ نے اس درجہ منضبط اور سعی انسانی کی انتہائی حد تک مرتب و مہذب نہیں کیا جیسا کہ سلف نے فنِ حدیث کو۔ اور یہ ایک مخصوص شرف و مزیت علمی ہے امتِ مرحومہ کی جس میں دنیا کی کوئی قوم اس کی شریک و سہیم نہیں۔

پس ضرور ہے کہ جس حدیث سے ہمارے سامنے استدلال کیا جائے اس کی صحت اصول و قواعدِ مقررۂ فن اور علوم متعلقہ حدیث سے ثابت بھی کر دی جائے۔

## ایک عام غلط فہمی

ایک بہت بڑی غلط فہمی یہ پھیل گئی ہے کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ تفسیر و سیر اور مغازی و ملاحم کی کسی کتاب میں بسلسلۂ اسناد کسی روایت کا درج ہونا اس کے لئے کافی ہے کہ اسے تسلیم کر لیا جائے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں جو تصریحات اس بارے میں کر دی ہیں وہ قدما کی تصنیفات سے مستغنی کر دیتی ہیں۔ انہوں نے بہ اعتبار شہرت

وصحت و قبول کتب احادیث کو چار درجوں میں تقسیم کیا ہے اول درجہ میں وہ مؤطا امام
مالک اور صحیحین کو قرار دیتے ہیں اور بقیہ کتب صحاح ستہ کو دوسرے درجے میں رکھتے ہیں
اس کے بعد دارمی۔ ابویعلیٰ۔ ابن حمید۔ طیالسی کے مسانید اور عبدالرزاق۔ ابن ابی شیبہ۔ حاکم
بیہقی اور طبرانی وغیرہ کے مجموعے ہیں انہیں تیسرے درجے میں قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اس
میں رطب و یابس ہر طرح کا ذخیرہ ہے۔ یہاں تک کہ موضوع حدیثیں بھی شامل ہیں۔ شاہ صاحب
نے سنن ابن ماجہ کو بھی اسی درجہ میں قرار دیا ہے مگر اس کے خلاف رائیں زیادہ ملیں گی۔ چوتھے
درجے میں کتب حدیث کا تمام بقیہ داخل ہے علی الخصوص تصانیف حاکم ابن عدی۔ ابن
مردویہ۔ خطیب۔ تفسیر ابن جریر طبری۔ فردوس دیلمی۔ ابونعیم صاحب حلیہ۔ ابن عساکر وغیرہ
وغیرہ۔ عام کتب تفاسیر و دلائل و خصائص و قصص کا سرچشمہ یہی کتابیں ہیں ان بزرگوں نے
اپنا مقصد کتب صحاح کے جامعین سے بالکل مختلف قرار دیا تھا۔ اس مقصد کی بے خبری ہی
سے تمام مشکلات پیدا ہوتی ہیں انہوں نے کبھی بھی یہ دعوی نہیں کیا کہ جس قدر حدیثیں وہ
پیش کرتے ہیں سب کی سب قابل اعتماد ہیں۔ ان کا مقصد صرف احادیث کو کسی خاص سلسلے
سے جمع کر دینا تھا اور اس کے نقد و بحث کو انھوں نے دوسروں کے لیے چھوڑ دیا تھا چنانچہ
اس کا سب سے بڑا واضح ثبوت یہ ہے کہ محققین فن حدیث نے ہمیشہ اپنی تصنیفات میں
ان کی جمع کردہ حدیثوں کو اسی وقت قبول کیا جبکہ وہ اصول مقررہ حدیث کے مطابق
جانچی گئیں اور ہمیشہ ان پر اپنے اصولوں کے ماتحت رد و قدح اور نقد و جرح کرتے
رہے ـــــ سب سے بڑا ذخیرہ حدیث اس قسم کا امام ابن جریر طبری کی تفسیر ہے جنہوں
نے قرآن کریم کی ہر آیت کے نیچے روایات کے جمع کرنے کا التزام کیا ہے اور واقعہ ماریہ
قبطیہ کے متعلق جو روایت آپ کے دوست نے نسخ و اضافے کے بعد پیش کی ہے وہ بھی

امام موصوف ہی نے سورۂ تحریم کی تفسیر میں درج کی ہے۔

یا پھر طبرانی معاجم ہیں اور حاکم کی مستدرک۔ ابن حمید و دارمی کی مسانید اور ابو نعیم و دیلمی کی تصنیفات ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ ذہبی۔ جیسے مسلّم محدثین اپنی تصنیفات میں جا بجا ان کی مرویات پر جرح و تنقید کرتے ہیں۔ اور کسی روایت کو بحث و نظر کے بعد قبول اور کسی کو مردود قرار دیتے ہیں صرف فتح الباری اور عینی ہی اٹھا کر دیکھ لیجئے کہ اس رد و قبول کا کیا حال ہے۔

امام ابن تیمیہ سے بڑھ کر فنّ حدیث کا اور کون حامی اور غوّاص ہو گا جنہوں نے اس راہ میں بے شمار متاعب و شدائد بھی فقہاء متقشفین کے ہاتھوں برداشت کئے مگر جن خوش نصیبوں کو امام موصوف کے تصانیف مطالعہ کرنے کی توفیق ملی ہے وہ اندازہ کر سکیں گے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں منہاج السنۃ وغیرہ میں صحاح کی متعدد احادیث کو انہوں نے صاف صاف رد کر دیا ہے۔

یہ ہمارے پاس علامہ ابن قیم کی زاد المعاد اور اعلام الموقعین وغیرہ مصنفات شہیرہ موجود ہیں ایک نہیں متعدد مقامات پر علامہ موصوف ان کتابوں کی بیان کردہ احادیث کو بلا تکلف رد کر دیتے ہیں صرف اتنا ہی نہیں بلکہ کتب صحاح کی مرویات پر بھی روایت و درایت کے مقررہ اصول کے بموجب نظر انتقاد ڈالتے ہیں اور کسی سے استدلال کرتے ہیں اور کسی کو اعتماد کے لیے غیر مفید بتلاتے ہیں۔ پھر فقہاء حنفیہ کا طرز عمل تو اس بارے میں ایک صاف شہادت ہے جو احادیث صحیحین تک کو بلا تکلف اپنے قیاس و درایت کے مقابلے میں تسلیم نہیں کرتے۔

احادیث کے تسلیم کرنے کے لیے طریق نقد و نظر سے کام لینے کے بارے میں ہمیشہ

اکابر فن کا یکساں یہی طرز عمل رہا ہے اس امر کے لئے کسی شہادت کے پیش کرنے کی ضرورت نہ تھی میں نے اس لیے زور دیا تا کہ مخالفین اسلام یہ نہ سمجھیں کہ ان کے اعتراضات سے بچنے کے لئے یہ کوئی نیا اصول قرار دیا جا رہا ہے یہ اصول ہمیشہ سے موجود ہے اور جس طرح ہم اب سے آٹھ سو برس پہلے صرف انہیں احادیث کو تسلیم کرتے تھے جو قواعد مقررہ فن سے ثابت ہو جائیں اسی طرح آج بھی ہم صرف انہیں روایتوں کو تسلیم کریں گے جو خود ان روایات کے جمع کرنے والوں کے مقررہ اصول کے مطابق ثابت کر دی جائیں۔

یہ بالکل ایک کھلی ہوئی بات ہے علی الخصوص کتب تفسیر و سیرت و مغازی اور قصص انبیا سابقین و اسرائیلیات کے متعلق ابتدا سے ائمہ فن نے یہی رائے دی ہے اور حضرت امام احمد کے زمانے سے جبکہ انہوں نے

ثلاثة كتب ليس لها اصل المغازى والملاحم والتفسير

کہا تھا۔ حفاظ حدیث کے آخری عہد تک جبکہ ابن حجر، ابن تیمیہ، ابن قیم اور حافظ ذہبی رحمہم اللہ نے کتابیں تصنیف کیں۔ تمام محققین کا طرز عمل اسی کا مؤید رہا ہے۔

## خلاصۂ مطالب

پس ضرور ہے کہ اس امر کو اچھی طرح معترضین اسلام پر واضح کر دیا جائے اور اس کے اصول و قواعد ان کے سامنے پیش کر دیئے جائیں اس کے بعد ان سے بحث کی جائے تو باوجود اس واقفیت کے جو مجھے معترضین کے ذخیرۂ کثیرہ مطاعن و معائب سے ہے اور باوجود ان مشکلات کا کامل اندازہ کرنے کے جو ہمارے نئے مصلحین و مجتہدین و متکلمین قرن حاضر کو رد مطاعن اور رفع اعتراضات و شکوک میں پیش آئی ہیں یا پیش آئے

طمانیت قلب اور وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ احادیث معتبرہ کی بناء پہ کوئی دقت نہیں اس راہ میں پیش نہیں آئے گی اور نئے اجتہادات و تجدیدات کا طوفان مہلک و ہادم اٹھانے کی بالکل ضرورت نہ ہوگی۔

یہی وہ مقام ہے جہاں آکر باوجود اتحاد مقصد و علم و ضرورت مجھے نئے مصلحین متفرنجین سے علیحدہ ہو جانا پڑتا ہے اور باوجود ان کاموں سے غیر جامدانہ و غیر متقشفانہ واقفیت کے میرے دل میں ان کے لئے کوئی حسنِ اعتقاد و اعتماد پیدا نہیں ہوتا۔ بلاشبہ ضرورتیں شدید اور نظر و تحقیق کی داعیات ناگزیر ہیں یقیناً ہمارا مقابلہ سخت اور بہت سے عوارض و جزئیات میں بالکل نئے قسم کا ہے اور یہ بھی بالکل سچ ہے کہ جو لوگ سب سے پہلے حریف کے وجوہ سے خبردار ہوئے اور میدان کارزار میں نکلے ان کی مستعدی و ہوشیاری اور سعی و محنت کا پوری طرح اعتراف کرنا چاہئے تاہم ان میں سے کوئی بات اس کے لئے مستلزم نہیں ہے کہ واقفیت کو "مجتہد العصر" اور لاعلمی و بے خبری کو "صاحب الامر" تسلیم کر لیا جائے اور بلا ضرورت دشمنوں کے مقابلے میں ایک ایسا اسلحہ اٹھایا جائے جس کا پہلا وار خود اپنی ہی گردن پہ پڑے۔

جبکہ ہم اصول و قواعد فن کے مطابق چل کر بعینہ وہی مقصد حاصل کر سکتے ہیں جو ان لوگوں کے پیشِ نظر ہے تو پھر اس کی کیا ضرورت ہے کہ محض اپنے فہم و قیاس شخصی کا نام "درایت و استخراج عقلی" رکھ کر ان علوم مسلمہ اسلامیہ کی تحقیر و تضعیف بلکہ انکار و انہدام کے درپے ہو جائیں جو خزانئ امت کا راس المال و اشرف ترین مصادر علوم دینیہ و سرچشمہ معارف و حقائق اسلامیہ و تاریخ صدر اول و سیرت حضرت ختم المرسلین ہے، اور جس کے لئے خود صحابہؓ و تابعین، ائمہ مہتدین اور تمام سلف صالح بالاجماع جمیع امتِ مرحومہ

من مبداية عهد هالى سن ماننا هذا قولاً وفعلاً ہمارے سامنے موجود ہے

درحقیقت ایسا کرنا اصول متفقہ امت اور مصادر شریعت و علوم شرعیہ میں ایک سخت اختلال و اغتشاش پیدا کرتا ہے جس کا نتیجہ مہلک اور جس کے عواقب فساد آلود ہیں۔

## اصل مسئلہ مسئولہ عنہا

یہاں تک تو صرف اس ٹکڑے کا جواب تھا جو جناب نے احادیث کے اعتماد و عدم اعتماد کی نسبت دریافت فرمایا تھا اور جو ضمناً اصول رد و دفاع منکرین اسلام کے متعلق ایک نہایت اہم اور وقت کی بحث تھی اب آپ کے اصل سوال کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

آپ کے نوجوان دوست کے مسیحی معلم نے جس واقعہ کو اپنی معاندانہ و ابلیسانہ تحریف و اضافہ کے ساتھ پیش کیا ہے وہ در اصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے اس واقعہ سے تعلق رکھتا ہے جو کتب سیرت و تفسیر میں واقعۂ ایلاء و تخییر کے نام سے مشہور ہے۔

۱۔ ایلاء اصطلاح فقہ میں شوہر اور بیوی کی اس علیحدگی کو کہتے ہیں جو بغیر طلاق کے عمل میں آئے۔ اور جس کی صورت یہ ہے کہ شوہر غصہ کی حالت میں کوئی قسم کھائے کہ میں اپنی بیوی کے پاس نہ جاؤں گا۔ اس کا ماخذ قرآن کریم کی یہ آیت ہے۔

> جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس جانے کی قسم کھا بیٹھیں۔ ان کے لئے چار مہینے کی مہلت ہے۔ اگر اس عرصہ میں رجوع کرلیں تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے اور اگر طلاق کا ارادہ کرلیں تو بھی اللہ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ (البقراۃ ۲۸)

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ جو لوگ ایلا کریں یعنی اپنی بیوی سے علیحدگی کی قسم کھا بیٹھیں۔ انہیں چار مہینے کے اندر ملاپ کر لینا چاہیے۔ اگر انھوں نے ایسا کیا تو ایلا ساقط ہو جائے گا۔ البتہ قسم کا کفارہ دینا پڑے گا۔ اس امر میں اختلاف ہے کہ اگر شوہر نے چار ماہ کے اندر رجوع نہ کیا تو محض ایلا کی مدت پر طلاق پڑ جائے گی یا نہیں۔ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ اس صورت میں بھی طلاق نہیں پڑتی اور عورت مرد سے نہیں چھوٹتی۔ اگر مرد عورت کو بالکل معلق چھوڑ دینا چاہے گا تو اسے قید رکھا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ عورت کی طرف رجوع کرے یا طلاق دے کر فیصلہ کرے۔ مگر فقہاء حنفیہ کے نزدیک محض انقضائے مدت ہی عورت کے حق میں طلاق بائنہ ہے۔

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی ایک مرتبہ ایلا کی صورت پیش آئی آپؐ نے عہد فرمایا تھا کہ ایک ماہ تک ازواج مطہرات سے کوئی تعلق نہ رکھیں گے۔ واقعہ ایلا سے یہی واقعہ مقصود ہے اور یہی شان نزول ہے آیات سورہ تحریم کا۔

۳۔ یہ واقعہ بہ تفصیل صحاح ستہ میں موجود ہے اور علی الخصوص صحیحین کے مختلف ابواب و کتب میں متعدد روایات و اسانید سے بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ اس واقعہ کی مختلف حیثیتیں تھیں اور مختلف قسم کے احکام ان سے نکلتے تھے۔ اس لئے حضرت امام بخاری رحمہ نے اپنی عادت کے مطابق مختلف ابواب میں اسے درج کیا ہے اور مختلف احکام نکالے ہیں۔ ابواب نکاح و طلاق و ایلا میں نو اصلی حیثیت سے آیا ہے مگر کتاب التفسیر میں بہ ضمن سورہ تحریم آیا ہے۔ میں نے ان تمام ابواب کی احادیث پیش نظر رکھی ہیں نیز صحیح مسلم۔ بقیہ کتب صحاح۔ تفسیر امام طبری۔ ابن کثیر اور در منثور بھی سامنے ہیں۔ صحیحین کی شروح میں سے فتح الباری عینی اور نووی شرح مسلم بھی پیش نظر ہیں۔ ان سب سے جو صحیح اور مشترک واقعہ ثابت ہوتا

ہے پہلے اسے بیان کرتا ہوں اس کے بعد آپ کے پیش کردہ واقعات کی نسبت معہ بعض اہم متعلقہ مباحث کے عرض کروں گا۔

## ازواج مطہرات کا مطالبہ

(۴) اگر کسی مدعی انسان کی زندگی کے واقعات اور حالات اس کی صداقت و تصدیق کے لیے معیار ہو سکتے ہیں تو اس آسمان کے نیچے فی الحقیقت ایک ہی انسانی زندگی ہے جس کے سوانح وحالات میں سے ہر شئے اس کی صداقت وحقانیت کے لیے معجزات قاہرہ و براہین قاطعہ ہیں یعنی محمد الرسول اللہ والذین معہ۔

جس وجود اقدس کے ظہور نے دنیا کی بڑی بڑی شہنشاہیوں کو نابود کر دیا جس کی ہیبت الٰہی اور سطوت ربانی کے آگے تاجدارانِ عالم کے تخت الٹ گئے جس کے غلاموں کے سامنے کسریٰ کا خزانہ آنے والا اور قیصر کا خراج پہنچنے والا تھا۔ جو اپنی حیاتِ طیبہ ہی کے اندر عرب ویمن کی شہنشاہی کو اپنے قدموں پر دیکھتا تھا اور فی الحقیقت جس کے لیے دنیا کے تمام خزانے وقف اور جس کی مرضی کے لیے رب السمٰوات والارض کی تمام پیدا کردہ قوتیں سربسجود تھیں ۔ بہ ایں ہمہ اس نے خود اپنے لیے جو دنیوی زندگی اختیار کی تھی ۔ اس کا حال یہ تھا کہ تمام عمر کبھی بھی دونوں وقت شکم سیر ہو کر غذا تناول نہ فرمائی اور دو دو دن تک آپ کے حجرۂ فقر میں غذا کی تیاری کے نشانات یکسر معدوم و مفقود رہے ۔ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہ وسلم

اس بارے میں تصریحات سیرت واحادیث اس درجہ مشہور ہیں کہ یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ۔ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ مہمان آجاتے تھے اور آپ کا

مطبخ کئی کئی وقتوں سے بالکل سرد ہوتا تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں مجھے یاد نہیں کہ کوئی دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسا گذرا ہو کہ صبح و شام دونوں وقت شکم سیر ہو کر غذا میسر آئی ہو۔

اس روحِ الٰہی اور پیکرِ صفاتِ ربانی کی غذا اس خاکدانِ ارضی پر نہ تھی جس کی اسے آرزو اور جستجو ہوتی۔ اس کا سفرۂ لذائذ و نعائم وہاں بچھتا تھا۔ جہاں سے بے جسم کی تشنگی آبِ زلال اور معدے کی بھوک غذائی حیات تھی۔

ابیت عند ربی یطعمنی ویسقینی (رواہ البخاری)

ابتدائی فتوحاتِ اسلامیہ کا دروازہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا تھا اور مالِ غنیمت اس کثرت و افراط سے آتا تھا کہ اس کا صرف ایک حصہ پا کر عام مسلمان خوش حالی اور صاحبِ مال بن جاتے تھے مگر خود اس سلطانِ کونین اور محبوبِ ربّ المشرقین کو ایک فقیر الحال زندگی کی بھی ضروریات و مایحتاج حاصل نہ تھیں

(۵) ان حالات کو صحابہ کرام دیکھتے تھے اور جوشِ محبت و جاں نثاری سے بے قرار ہو ہو جاتے تھے۔ سب سے زیادہ اس کا اثر ازواجِ مطہرات پر پڑتا تھا۔ جنہوں نے گو دنیوی جاہ و جلال پر اس محبوب رب العالمین کے حجرہ فقر و فاقہ کو ترجیح دی تھی تاہم وہ انسان تھیں انسانی خواہشیں اور ضرورتیں رکھتی تھیں۔ عیش و آرام کے ساز و سامان نہ سہی لیکن ایک فقیر زندگی کے لئے بھی کچھ نہ کچھ سامانِ حیات و منزل کی ضرورت ہوتی ہے اس کا خیال تو انہیں ضرور ہوتا تھا۔ ان میں سے اکثر بیبیاں ایسی تھیں جو امارت و ریاست کے گھروں میں پرورش پا چکی تھیں اور ان کے ماں باپ امراء و رؤسائے وقت میں محسوب تھے۔

حضرت صفیہؓ خیبر کے امیر اعظم کی صاحبزادی تھیں جو ایک طرح کا شاہی اقتدار

رکھتا تھا۔ حضرت اُم حبیبہؓ ابو سفیان کی صاحبزادی تھیں جو اپنے عہد میں جمہوریت حجاز کا پریسیڈنٹ تھا۔ اور قریش کی پوری ریاست رکھتا تھا۔ اسی طرح حضرت جویریہؓ ایک بڑے قبیلہ کے رئیس کی بیٹی تھیں جس کا نام غالبًا بنو المصطلق تھا۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ بھی ایسے گھروں میں پرورش پائی ہوئی تھیں جنہوں نے گو اپنے مال و متاع کو راہِ حبِ الٰہی میں لٹا دیا ہو۔ مگر صاحبِ جاہ و دارائے شوکت ضرور تھے یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ و حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما۔

یہ تمام خواتین محترمہ آنحضرت صلعم کے گھر میں آئیں اور اپنے قدیمی شان و شکوہ دنیوی کو ان کی عظمت و سطوتِ روحانی کے آگے بھول گئیں تاہم وہ بشر تھیں اور ضروریات رکھتی تھیں۔ ہر بیوی کو دوسری بیوی کے مقابلے میں اقتضائے طبیعت نسائیہ سے اپنی حالت کی بہتری و رفعت کا بھی خیال ہوتا تھا۔ عام مسلمانوں اور صحابہؓ کو مال و متاعِ غنیمت سے آسودہ حال دیکھتی تھیں اور مالِ غنیمت میں اپنے لئے کچھ نہ پاتی تھیں۔ ان تمام حالات کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ انہیں اپنی تنگدستی کا احساس ہوتا اور جو شاہنشاہ ایک دنیا کو سب کچھ دے رہا تھا۔ اس سے کچھ نہ کچھ اپنے لئے بھی مانگتیں علی الخصوص جبکہ اس محبت و عشق کا ان میں سے ہر ایک کو ناز تھا اور جو کچھ اپنے لیے مانگنے والی تھیں وہ بھی دراصل اسی کے لئے طلب کرنا تھا۔

(۶) چنانچہ ازواج مطہرات کی طرف سے آپ پر توسیع نفقہ کے لئے تقاضے شروع ہوئے اور ایک مرتبہ تمام بی بیوں نے مل کر زور ڈالا (۷) یہ مطالبہ اگرچہ تمام بی بیوں کی طرف سے تھا۔ مگر دو بی بیوں نے خاص طور پر باہم ایکا کر کے اصرار کیا تھا چنانچہ انہیں کی نسبت سورۂ تحریم کی یہ آیت نازل ہوئی۔

اگر تم دونوں خدا کی طرف رجوع کرو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ کیونکہ تمہارے دل مائل ہو چکے ہیں۔ اور اگر رسول اللہ کے مقابلے میں ایکا کرو گے تو جان لو کہ خدا ان کا مددگار ہے۔ جبریل اور نیک مسلمان بھی انہیں کے ساتھ ہیں۔ اور سب کے بعد ملائکۂ الٰہی بھی انہیں کے مددگار ہیں۔

اس بارے میں اختلافِ حدیث کا ذکر آگے آئے گا لیکن راجح خبر یہی ہے کہ وہ دو بی بیاں حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ تھیں جیسا کہ خود حضرت عمرؓ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا۔

(۸) سورۂ تحریم نازل ہونے کا سبب یہ تھا کہ ازواج مطہرات کا یہ مطالبہ آنحضرتؐ کے سکونِ خاطر اور حیاتِ فقر و استغنا پر بہت بار گذرا۔ آپ کی زندگی روحانی استغراق اور اصلاح عالم و انسانیت کے مہمات مقاصد سے اس طرح لبریز تھی کہ اس میں اس میں تکثر مال یا اسباب دنیوی کی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔

## شانِ نزول لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ

(۹) اسی اثنا میں ایک اور رنجیدہ واقعہ بھی پیش آیا جو گو ایک بالکل علیحدہ اور مستقل واقعہ ہے۔ مگر اس کے امتزاج و خلط نے واقعۂ "ایلا" میں پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں یعنی سورۂ تحریم کی ان ابتدائی آیات کا شانِ نزول۔

اے پیغمبر تم اپنی بی بیوں کی خوشی کے لئے اس چیز کو اپنے اوپر کیوں حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمہارے لئے حلال کر دی ہے۔ اللہ تو بخشنے والا مہربان ہے۔ بے شک اللہ نے تمہارے لیے یہ فرض کر دیا ہے کہ اپنی قسموں

کیونکہ خدا تمہارا دوست ہے اور سب باتوں کو جاننے والا اور ان کی حکمتوں پر نظر رکھنے والا ہے۔

ان آیاتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے کوئی ایسی چیز اپنے اوپر حرام کر لی تھی جو اللہ کی طرف سے حلال تھی اور اس کے لئے کوئی قسم بھی کھالی تھی۔ نیز یہ کہ صرف اپنی ازواج کی خوشی کے لئے ایسا کیا تھا۔

(۱۰) وہ کیا بات تھی۔ کس بات کے لئے قسم کھائی تھی۔ ازواج کی خوشی کو اس سے کیا تعلق تھا۔ ان سوالات کے جواب احادیث سے ملتے ہیں اور اسی کے متعلق وہ بعض روایات کتب تفسیر و سیر میں درج ہو گئی ہیں جن کو ایک مسخ و بدنما شکل میں اعداء اسلام نے بیان کیا ہے۔

بخاری و مسلم کے ابواب نکاح طلاق میں یہ واقعہ بالکل صاف اور غیر پیچیدہ موجود ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

آنحضرت صلعم کا یہ قاعدہ تھا۔ عصر کے بعد ازواج مطہرات کے یہاں تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے تشریف لایا کرتے تھے ایک بار آپ کئی دن تک حضرت زینبؓ کے یہاں معمول سے زائد بیٹھے۔ حضرت عائشہؓ نے اس کا سبب دریافت کیا۔ معلوم ہوا حضرت زینبؓ کے پاس کہیں سے شہد آ گیا ہے وہ آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا اس کے تناول فرمانے کے شغل میں معمول سے زیادہ دیر ہو جاتی ہے۔

رشک اور غیرت جنس اناث کا وہ فطری جذبہ ہے جس کے آگے کسی جذبہ کی نہیں چلتی حضرت عائشہؓ کو یہ معلوم کر کے باعتبار ضعف بشریت رشک ہوا وہ سمجھ گئیں کہ حضرت زینبؓ نے یہ تدبیر آنحضرتؐ کو زیادہ عرصہ تک ٹھہرانے کی نکالی ہے۔ پس کوئی

نہ کوئی تدبیر اس کے توڑ کی ہونا چاہیئے۔ انہوں نے ایک تدبیر سوچی اور حضرت حفصہؓ بھی اس میں شریک ہو گئیں۔ قرار پایا کہ آنحضرتؐ جب وہاں سے اُٹھ کر ہمارے یہاں آئیں تو کہا جائے کہ آپ کے دہن مبارک سے "مغافیر" کی بو آتی ہے ــ مغافیر ایک قسم کا درخت ہے جس کے پھولوں سے مکھیاں رس چوس کر شہد جمع کرتی ہیں اس کا پھل لوگ کھاتے ہیں مگر اس کی بو اچھی نہیں ہوتی ــ اس کے بعد اس تدبیر کی اور بی بیوں کو بھی خبر دے دی گئی اور وہ بھی اس میں شریک ہو گئیں۔ چنانچہ آنحضرتؐ حسبِ معمول جب حضرت حفصہؓ کے ہاں تشریف لائے تو انہوں نے کہا کیا آپ نے مغافیر کھایا ہے آپ نے فرمایا نہیں ــ اور بی بیوں نے بھی مغافیر کی بو کا آنا ظاہر کیا یہ تواتر دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ یہ دراصل شہد کی بو ہے آپ نے قسم کھالی کہ آئندہ شہد نہ کھاؤں گا۔ یہ واقعہ خود حضرت عائشہؓ کی روایت سے امام بخاری نے کتاب الطلاق اور کتاب التفسیر میں درج کیا ہے۔

> حضرت عائشہؓ کہتی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زینبؓ بنت جحش کے یہاں شہد نوش فرمانے اور دیر تک ٹھہرتے اس پر میں نے اور حفصہؓ نے یہ قرار داد کی کہ جب آنحضرتؐ ہم میں سے کسی کے ہاں اُٹھ کر آئیں تو کہا جائے کہ کیا آپ نے مغافیر کھایا ہے اس کی بو آپ کے منہ سے آرہی ہے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آنحضرتؐ نے یہ سن کر فرمایا کہ مغافیر تو میں نے نہیں کھایا البتہ زینبؓ کے ہاں شہد کھایا ہے اب میں قسم کھاتا ہوں کہ آئندہ کبھی نہ کھاؤں گا۔ مگر تم اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔

ساتھ ہی بخاری کے باب "الطلاق میں" ہشام بن عروہ عن ابیہ عن عائشہؓ کی روایت سے ایک دوسری حدیث بھی موجود ہے۔ جو اس سے زیادہ مفصل مگر بعض جزئیات میں اس سے مختلف ہے۔ مثلاً اس میں حضرت زینبؓ کی جگہ شہد کھانے کا واقعہ خود حضرت حفصہؓ کے ہاں بیان کیا گیا ہے۔ اور حضرت سودہؓ کی نسبت کہا ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے مغافیر کی بو کی نسبت کہا تھا۔

روایت بالا میں صرف حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کا ذکر ہے۔ لیکن اس میں بیان کیا گیا ہے کہ اور بی بیوں کو بھی ایسی خبر دے دی گئی تھی اور سب نے مغافیر کی بو کا ذکر کیا۔ ایسا ہونا در اصل بھی ضروری معلوم ہوتا ہے ورنہ صرف ایک بی بی کے کہنے سے قسم کھالینا مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے بعض ضروری جزئیات اس روایت سے بھی لے لی ہیں اور سب کا مشترک ماحصل بیان کر دیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس اختلاف پر نہایت عمدہ بحث کی ہے اور وجوہ تطبیق صاف کر دیئے ہیں۔

## واقعہ "وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ"

(۱) اسی اثناء میں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعض ازواج سے کوئی راز کی بات فرمائی اور تاکید کر دی کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا لیکن ان سے ضبط نہ ہو سکا اور ایک دوسری بیوی سے ذکر کر دیا۔ اسی کے متعلق سورۂ تحریم کی یہ آیت نازل ہوئی —

اور جبکہ پیغمبر نے اپنی بعض بیویوں سے راز کی بات کہی اور اس نے فاش کر دی اور خدا نے پیغمبر کو اس کی خبر دے دی۔ تو انہوں نے اس میں سے

کچھ حصہ بیان کیا اور کچھ چھوڑ دیا - یہ سن کر اس بی بی نے پوچھا کہ آپ کو
کس نے اس کی خبر دی، فرمایا کہ اس خدا نے جس کے علم اور خبر سے کوئی
بات پوشیدہ نہیں -

بخاری و مسلم کی تمام روایات کے جمع کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ "بعض الازواجہ" سے یہاں مقصود حفصہؓ ہیں، انہوں نے ہی حضرت عائشہؓ سے راز کہدیا تھا۔ اس میں بعض جزئی اختلاف بھی ہیں جن پہ حافظ ابن حجر نے مفصل بحث کی ہے لیکن محقق و راجح یہی ہے کہ حضرت حفصہؓ اور حضرت عائشہؓ ہی سے اسکا تعلق ہے -

(۲) غرضیکہ توسیع نفقہ کے لئے تمام ازواج نے متفق ہو کر اصرار کرنا شروع کر دیا۔ آنحضرؐ کے استغراقِ روحانی پر یہ طلب اتنی شاق گذری کہ آپ نے عہد کر لیا ایک ماہ تک تمام بیویوں سے کوئی تعلق نہ رکھوں گا - جب کچھ زمانہ اس علیحدگی پہ گذر گیا تو صحابہؓ کرام کو سخت تشویش ہوئی - ان میں سے اکثر کو خیال آیا کہ عجب نہیں آپ نے تمام ازواج کو طلاق دے دی ہو مگر ہیبتِ نبوت و سطوتِ رسالت اجازت نہیں دیتی تھی کہ اس بارے میں آپ سے سوال کیا جائے -

(۳) سوء اتفاق یہ کہ آپؐ اس زمانے میں مجروح ہو گئے ساقِ مبارک پر زخم آ گیا زخم کی تکلیف چلنے پھرنے سے مانع تھی اس لئے کئی روز آپ بالاخانے سے اتر کر مسجد میں بھی تشریف نہ لا سکے۔ صحابہؓ دریافت خیریت مزاج کو آئے تو وہیں بیٹھ کر نماز پڑھائی -

جب ایک مہینے کے قریب اسی حالت میں گذر گیا تو صحابہؓ کی تشویش اور زیادہ بڑھ گئی اور ان حالات کو دیکھ کر اکثروں کو یقین ہو گیا کہ آپ نے طلاق دے دی ہے -

(۴) یہ حالت کیونکر ختم ہوئی۔ کس کی جرأت محبت و نیاز نے اس کشمکش کا خاتمہ کیا اور کیونکر آیتِ تخییر نازل ہوئی ان تمام سوالوں کا جواب اسی مشرح و مطول روایت

ہیں ہے جو حضرت عمر فاروقؓ سے صحیحین میں منقول ہے۔

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ پوری حدیث یہاں نقل کر دیں۔ یہ روایت صحیح بخاری میں مختلف طریقوں سے مروی ہے اور مختلف ابواب میں اس سے استخراج نتائج و معارف کیا گیا ہے امام مسلم نے بھی چار مختلف طریقوں سے اسے کتاب الطلاق میں درج کیا ہے۔ بالاتفاق اسکے راوی اول حضرت عبداللہ ابن عباس ہیں اور ان سے عبید ابن حنین۔ سماک ابو زمیل اور عبید اللہ بن ابی ثور وغیرہ نے روایت کی ہے ان روایات میں ایک متفق علیہ روایت عبید اللہ ابن حنین کی ہے جو حضرت عباسؓ کے غلام تھے لیکن اسی واقعہ کو امام بخاری نے کتاب العلم میں عبید اللہ ابن ابی ثور کی روایت سے بھی درج کیا ہے وہ جزئیات بیان میں زیادہ مشرح اور مفصل ہے۔ علی الخصوص حضرت عمرؓ اور آنحضرت صلعم کا مکالمہ زیادہ تفصیل سے اس میں بیان کیا گیا ہے۔ امام مسلم کی روایات میں بھی بعض زیادہ تفصیلات ہیں۔ ہم ان تمام روایات کو سامنے رکھ کر ان کا مشترک اور مربوط اور مرتب خلاصہ بہ احتیاط درج کر دیتے ہیں بہ نسبت ایک ہی روایت کے ترجمہ کر دینے کے یہ زیادہ مفید ہوگا۔

علاوہ اصل واقعہ کے جو ضمنی روشنی اس روایت سے آنحضرت صلعم کی سیرت طیبہ فقر و استغنا۔ عورتوں کے حقوق۔ اسلام کی حمایت نسواں۔ زنان عرب کی حالت میں انقلاب صحابہؓ کا عشقِ رسول۔ حضرت عمرؓ کے مدارج علیہ اور راہِ محبت رسول میں بیخودانہ سرشاری اور اسی طرح کے بے شمار امور و مسائل پر پڑتی ہے۔ اس کے لحاظ سے بھی اس کا مفصل اور جامع خلاصہ درج کرنا ضروری تھا۔

## خلاصۂ حدیث مذکورہ

حضرت عبداللہ ابن عباس کہتے ہیں کہ میں سال بھر تک ارادہ کرتا رہا حضرت عمرؓ

سے قرآنِ کریم کی ایک آیت کی نسبت پوچھوں لیکن ان کی ہیبت و رعب سے میری ہمت پست ہو جاتی تھی - اور پوچھنے کی نوبت نہ آتی تھی - ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ حضرت عمرؓ حج کے لئے نکلے اور میں بھی ان کے ہمراہ روانہ ہوا۔ جب حج سے فارغ ہو کر ہم لوگ واپس آ رہے تھے تو راستے میں ایک اچھا موقع گفتگو کا ہاتھ آ گیا اور میں نے اس مہلت کو غنیمت سمجھ کر اپنے قدیمی ارادے کو پورا کرنا چاہا -

میں نے عرض کیا کہ امیر المومنین آنحضرت صلعم کی وہ کون دو بیویاں تھیں جنہوں نے اپنے مطالبات کے لئے ایکا کر کے آنحضرت صلعم پر زور ڈالا تھا اور جس کا ذکر خدا تعالےٰ نے وَاِن تَظَاهَرَا عَلَيْهِ میں کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا عائشہؓ اور حفصہؓ اس پر میں نے کہا کہ واللہ ایک سال سے ارادہ کر رہا تھا کہ اس بارے میں آپ سے پوچھوں مگر آپ کے رُعب سے میری زبان نہیں کھلتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس کا کچھ خیال نہ کرو جو بات مجھے معلوم ہے میں بیان کرنے کے لئے موجود ہوں -

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے اس واقعہ پر ایک مفصل و مشرح تقریر کی — انہوں نے کہا کہ ایامِ جاہلیت میں ہم لوگوں کا عورتوں کے ساتھ یہ سلوک تھا کہ کسی طرح کے حقوق انہیں حاصل نہ تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ عورتیں کوئی چیز نہیں ہیں۔ لیکن جب اسلام آیا اور اللہ تعالےٰ نے ان کے حقوق کے متعلق آیات نازل کیں اور ان کا حق ہم پر قرار دیا تو ہماری عورتوں کی حالت بالکل بدل گئی اور اپنا حق مانگنے میں وہ نہایت جری ہو گئیں - ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ کسی بات پر حسبِ عادتِ قدیمی میں نے اپنی بیوی کو ڈانٹا اور باہم تکرار سی ہو گئی اس نے الٹ کر ویسا ہی جواب دیا اور سختی سے بات کی میں نے کہا تمہیں کیا ہو

گیا ہے میری بات کا اس طرح جواب دیتی ہو۔ وہ بولی کہ سبحان اللہ تم کیا ہو کہ تمہیں جواب نہ دوں۔ تمہاری بیٹی تو خود رسول اللہ کو برابر کا جواب دیتی ہے حتیٰ کہ دن دن بھر ان سے روٹھی رہتی ہے ۔ یہ سن کر میں نے اپنے دل میں کہا یہ تو عجیب بات ہوئی۔ فوراً حفصہؓ کے پاس پہنچا اور پوچھا بیٹی کیا یہ سچ ہے کہ تم آنحضرتؐ صلعم سے سوال جواب کرتی ہو اور کیا اور بی بیاں بھی ایسا ہی کرتی ہیں۔ حفصہؓ نے کہا ہاں بیشک ہم ایسا کرتے ہیں۔ مجھے سخت غصہ آیا اور میں نے کہا کہ تجھے اللہ کی سزا اور رسولؐ کے غضب سے ڈرنا چاہیئے۔ رسول اللہ کی ناراضی عین خدا کی ناراضی ہے تجھے حضرت عائشہؓ کی کوئی نظیر دیکھ کر یہ بھول نہ جانا چاہیئے کہ ان سے آنحضرت صلعم بہت محبت کرتے ہیں۔ واللہ اگر انہیں میرا خیال نہ ہوتا تو وہ تجھے طلاق دے چکے ہوتے۔ تجھ کو جو مانگنا ہو مجھ سے مانگ آنحضرت صلعم کو کیوں تکلیف دیتی ہے۔ اس کے بعد میں ام سلمہ کے ہاں آیا۔ میں نے ان سے بھی وہ تمام باتیں کہیں جو اپنی بیٹی سے کہی تھیں۔ انہوں نے سنتے ہی جواب دیا اے ابن خطاب تمہاری حالت تو بڑی عجیب ہے تم ہر معاملہ میں دخیل ہو گئے ہو۔ اور اب یہ نوبت آگئی کہ رسول اللہ اور ان کی بیویوں کے معاملہ میں بھی دخل دینے لگے ہو ۔ انہوں نے یہ بات اس زور سے کہی کہ مجھ سے کوئی جواب نہ دیا گیا اور میں خاموش اٹھ کر چلا آیا۔

اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ میرے ہمسایہ میں ایک انصاری رہتا تھا ہم اور وہ دونوں باری باری ایک دن درمیان دے کر آنحضرتؐ

کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور ایک دوسرے کو اپنی حاضری کے حالات سنا دیا کرتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ مدینہ میں دشمنوں کے حملے کی ہر وقت توقع کی جاتی تھی اور خود مجھے ملوک غسان میں سے ایک بادشاہ کی طرف سے کھٹکا تھا۔۔ ایک رات کو میرے انصاری ہمسائے نے یکایک ناوقت دروازے پر دستک دی اور پکارا کہ دروازہ کھولو۔ میں گھبرایا ہوا گیا اور پوچھا خیر ہے کیا غسانی مدینہ پر چڑھ آئے۔ اس نے کہا نہیں مگر اس سے بھی بڑھ کر حادثہ ہوا۔ یعنی رسول اللہ صلعم نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی۔ میں نے کہا یہ سب کچھ حفصہؓ و عائشہؓ کی انہیں باتوں سے ہوا ہوگا۔ جو وہ آنحضرت صلعم کے ساتھ کیا کرتی تھیں۔ میں نے کپڑے پہنے اور سیدھا مدینے پہنچا۔ آنحضرت صلعم نماز صبح کے بعد بالاخانے پر تشریف لے گئے۔ مسجد میں لوگ بیٹھے تھے اور غمگین تھے مجھے صبر نہ ہوا بالاخانے کے نیچے آیا اور آنحضرت صلعم کے حبشی غلام سے کہا کہ میری اطلاع دو مگر باریابی کی اجازت نہ آئی کچھ وقفہ کے بعد دوبارہ آیا اور غلام سے کہا کہ میری حاضری کے لئے اجازت طلب کر۔ جب کچھ جواب نہ آیا تو مجھے صبر نہ ہو سکا بے اختیار پکار اٹھا کہ شاید رسول اللہ خیال فرماتے ہیں۔ میں اپنی لڑکی حفصہؓ کی سفارش کرنے آیا ہوں۔ خدا کی قسم میں تو رسول اللہ کی رضا کا بندہ ہوں اور اگر وہ حکم دیں تو خود اپنے ہاتھ سے حفصہؓ کی گردن اڑا دوں۔ غرض اس بار اذن مل گیا اور میں بالاخانے پر پہنچا کیا دیکھتا ہوں کہ سرور کائنات ایک کھری چارپائی پر لیٹے ہیں اور آپ نے جسم

اقدس پر بانوں کے نشان پڑ گئے ہیں گھر کے ساز و سامان کا یہ حال ہے کہ ایک طرف مٹھی بھر جَو کے دانے پڑے ہیں ایک کونے میں کسی جانور کی کھال رکھی ہے دوسری کھال ایک طرف لٹک رہی ہے۔ یہ حالت دیکھ کر میرا دل بے قابو ہو گیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا اے عمرؓ تم روتے کیوں ہو۔ عرض کی کہ رونے کی کہ اس سے زیادہ بات کیا ہو گی۔ آج قیصر و کسریٰ عیش و راحت کے مزے لوٹ رہے ہیں حالانکہ خدا کی بندگی سے غافل ہیں۔ مگر آپ سرورِ دو جہاں ہو کر اس حالت میں ہیں کہ گھر میں ایک چیز بھی آرام کی میسر نہیں۔ اور کھری چارپائی کے نشان جسم مبارک پہ نمایاں ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ قیصر و کسریٰ دنیا لیں اور ہمیں آخرت نصیب ہو۔ میں نے پوچھا کیا حضورؐ نے ازواج کو طلاق دے دی۔ فرمایا نہیں۔ یہ سنتے ہی میں اس قدر خوش ہوا کہ میری زبان سے اللہ اکبر کا نعرہ نکل گیا۔ پھر میں نے آپ کی تفریحِ خاطر کے لئے عرض کیا کہ ہم قریش کے لوگ عورتوں پہ غالب تھے لیکن یہاں آ کر دیکھا کہ رنگ دوسرا ہے۔ اس پہ آپؐ متبسم ہوئے پھر میں نے اپنی وہ سرگذشت عرض کی جو حفصہؓ اور اُمِّ سلمہؓ سے پیش آئی تھی اس پہ آپ دوبارہ متبسم ہوئے آخر میں عرض کی کہ مسجد میں لوگ مغموم بیٹھے ہیں اجازت ہے کہ انہیں بھی جا کر خبر دے دوں کہ طلاق کا خیال غلط ہے۔

اس کے بعد آنحضرت صلعم حضرت عائشہؓ کے ہاں تشریف لے گئے۔ انہوں

نے کہا آپ نے ایک مہینے تک "ایلاء" کا عہد کیا تھا ابھی اس میں ایک دن باقی ہے آپ نے فرمایا کہ انتیس دن کا بھی تو مہینہ ہوتا ہے۔

## بعض نتائج وبصائر

اس حدیث طویل کے نقل کرنے سے مقصود اصلی واقعہ ایلاء وتخییر کے متعلق معلومات صحیحہ کا حصول تھا لیکن ضمناً جن امور ومسائل پر اس سے روشنی پڑتی ہے نہایت مختصر لفظوں میں ان کی طرف اشارہ کروں گا۔

شارحین بخاری نے اس حدیث سے بے شمار باتیں پیدا کی ہیں، خود امام بخاری نے تحصیل علم تحقیق وسوال احکام نکاح۔ احکام طلاق۔ نصیحت والدین وغیرہ وغیرہ متعدد مسائل میں اسی ایک روایت سے حسب عادت تبویب کی ہے۔

(۱) حضرت عباس رضؓ کی اس شوق تحقیق وتلاش علم استاد کو دیکھئے کہ صرف اس ایک آیت کے متعلق تحقیق کرنے کے لئے کامل سال بھر تک کوشش کرتے رہے۔ اس سے فن تفسیر کے متعلق بھی ان کی جد وجہد کا حال معلوم ہوتا ہے۔ جب ایک آیت کے شان نزول کے لئے یہ حال تھا تو پورے قرآن کریم کے معارف کو کس سعی وجد وجہد سے حاصل کیا ہوگا۔

(۲) اللہ اکبر یہ کیا چیز تھی کہ خلفائے راشدین رہتے تھے تو اس مساوات وفقر وزہد کے ساتھ کہ کوئی تمیز اعلیٰ وادنیٰ کی نہیں تھی مگر پھر بھی ہیبت وصولت ربانی کی یہ کیفیت تھی کہ عمر فاروق رضؓ کے آگے خود صحابہ رضؓ کی زبانیں نہیں کھلتی تھیں ۔

ہیبتِ حق است ایں از خلق نیست  ہیبت ایں مرد صاحب دلق نیست

(۳) اس حدیث سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ باپ کا اپنی بیٹی کے مکان میں بلا اجازت

شوہر جانا درست ہے ؟

(۴) ایک اہم نکتہ یہ حل ہوتا ہے کہ اس وقت مدینہ کس طرح دشمنوں کے زغہ میں تھا۔ جب انصاری ہمسائے نے کہا کہ دروازہ کھولو تو حضرت عمر بیساختہ پوچھ اٹھے کہ کیا دشمن آگئے ؟ پھر جو لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ قیام مدینہ کے زمانے میں خود حملے کئے یہ کس قدر غلط اور خلاف واقعہ ہے۔

(۵) آنحضرتؐ کی منزلی زندگی کی شفقت و نرمی تحمل و درگذر۔ رفق و لینت اور بیبیوں کے ساتھ صبر و برداشت کا سلوک۔ اس سے جہاں آپ "خلق عظیم" کی زندگی سامنے آتی ہے وہاں ان کا "اسوۂ حسنہ" ہم سے بھی مطالبہ کرتا ہے کہ اپنی بیویوں سے محبت اور نرمی کریں اور ہمیشہ شفقت و سلوک اور درگذر و رفق سے پیش آئیں کہ یہ آب گینہ بہت ہی نازک ہے۔

(۶) اور حضرت سرور کائناتؐ کی وہ حیات مقدسہ جو ایک طرف تو دو جہاں کی بادشاہت اپنے پاؤں کے نیچے دیکھتی تھی دوسری طرف چارپائی پر بچھانے کے لئے ایک کمبل بھی نہ تھا۔

مقام اس برزخ کبریٰ میں تھا حرف مشدّد کا !

(۷) یہ کہ جس روشن زندگی کے گھریلو معاملات تک کی اس درجہ چھان بین ہوتی رہتی ہو کہ ایک ایک معمولی واقعہ سے بڑے بڑے مہم مسائل پیدا ہوں اور فقہی قوانین ترتیب دیئے جائیں۔

پس محدثین و محققین یعنی سیرت نبوی کے یہ پروانے کیا اس دامن میں کوئی دھبّہ دیکھ کر بھی بدستور معتقد و جاں نثار رہ سکتے تھے۔

آیتِ تخییر : غرض اس کے بعد ہی سورۂ احزاب کی آیتِ تخییر نازل ہوئی۔

اے پیغمبر اپنی بیویوں کو کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتی ہو تو صاف صاف کہہ دو۔ میں تمہیں اچھے طریقے سے رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کی طالب ہو تو پھر اسی کی ہو رہو۔ اللہ نے تم میں سے نیکی کرنے والی عورتوں کے لئے بہت ہی بڑا اجر تیار کر رکھا۔

ازواج مطہرات کے متعلق یہ آخری اور الٰہی فیصلہ تھا چونکہ توسیع نفقہ اور طلب اسباب آرام و راحت کے لئے انہوں نے آنحضرت پر زور ڈالا تھا اور سب متفق ہو گئی تھیں حتیٰ کہ آنحضرتؐ نے ایلاء کر کے ایک ماہ کے لئے ان سے کنارہ کشی کر لی تھی اس لئے اللہ تعالےٰ نے چاہا کہ ایک مرتبہ ہمیشہ کے لئے اس کا فیصلہ ہو جائے اور دونوں راستے ان کے آگے پیش کر دیئے جائیں یا تو اللہ اور اس کے رسول کی راہ میں آرام و راحت دنیوی کو بالکل خیر باد کہیں یا دنیا اور اس کے نعائم و لذائذ کے لئے اللہ کے رسول کی رفاقت ترک کر دیں۔

اس حکم کے نزول میں فی الحقیقت بہت سی عظیم الشان مصلحتیں پوشیدہ تھیں۔ یہ ازواج مطہرات کے لئے بہت بڑی آزمائش تھی۔ دنیا کو دکھلانا تھا کہ جن لوگوں کو خدا کے رسول نے اپنی زندگی میں شریک کیا ہے ان کے تزکیہ باطنی اور خدا پرستی کا کیا حال ہے۔ اگر اس طرح کے واقعات پیش نہ آتے تو ازواج مطہرات کا تزکیہ نفس اور ان کے دلوں کی محبت الٰہی کیونکر دنیا کے سامنے واضح ہوتی۔

چونکہ توسیع نفقہ کی خواہش میں حضرت حفصہؓ اور حضرت عائشہ نے سب سے زیادہ حصہ لیا تھا۔ اس لئے آنحضرت سب سے پہلے حضرت عائشہؓ کے ہاں تشریف لائے اور اسی

آیت کے حکم سے مطلع کیا ساتھ ہی فرمایا کہ اس معاملہ میں جلدی نہ کرو بہتر ہوگا کہ اپنے والد سے بھی مشورہ کر لو۔ حضرت عائشہ بے اختیار بول اٹھیں کہ بھلا اس میں مشورہ کرنے کی کیا بات ہے جب خدا نے دو راہیں میرے سامنے کر دی ہیں تو اس کا جواب ہر حال میں صرف ایک ہی ہے۔ دنیا اور دنیا کی نعمتیں آپ کی رفاقت کے سامنے کیا شئے ہیں میں سب کچھ چھوڑ کر اللہ اور اس کے رسول کی محبت اختیار کرتی ہوں — اس کے بعد اور تمام بی بیوں سے آپ نے پوچھا اور سب نے یہی جواب دیا (صحیح نسائی کتاب النکاح ص ۱۵)

یہ حکم اگرچہ صرف ازواج مطہرات کے متعلق تھا مگر در اصل اس میں اس راہ کے لئے ایک عام بصیرت بھی پوشیدہ ہے۔ اس واقعہ کے ضمن میں خدا تعالےٰ نے ظاہر کیا ہے کہ دو چیزیں ایک دل میں جمع نہیں ہوسکتیں جو دل خدا اور اس کے رسول کی محبت اور مرضیات کے طالب ہوں انہیں چاہیئے کہ پہلی ہی نظر میں دنیا اور اہل دنیا کی طرف سے دست بردار ہو جائیں یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک طرف تو خدا کی محبت کا بھی دعوےٰ ہے۔ دوسری طرف ذخائر دنیوی کے پیچھے بھی سرگرداں رہیں۔

## قصۂ ماریۂ قبطیہ اور روایاتِ موضوعہ

یہاں تک تو ہم نے ایلاء تخییر کا اصلی واقعہ بیان کر دیا جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ اب ہم ان روایات کی جانب متوجہ ہوتے ہیں جن کی آمیزش سے اس صاف واقعہ کو مکدر و مشتبہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور جن کی ایک محرف و مسخ صورت آپ کے مسیحی علم نے پیش کی ہے۔

ان روایات سے تمام صحاح ستہ خالی ہیں البتہ ابن سعد۔ ابن مردویہ۔ واقدی

ابن جریر۔ طبری۔ طبرانی۔ بزار اور ہیثم بن حبیب وغیرہ نے درج کیا ہے اور ان سے عام مفسرین وارباب سیرت نے نقل کر دیا ہے۔ ان روایات کا تعلق واقعہ تحریم سے ہے۔ اگر تسلیم بھی کر لیا جائے جب بھی واقعہ ایلاء پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا البتہ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ کا شانِ نزول شہد کا واقعہ نہ تھا بلکہ ماریہ قبطیہ سے اس کا تعلق ہے جو آپ کی لونڈی تھی اور آپؐ نے ازواج کی خاطر اسے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔

ہم ان روایات کے لئے امام طبری کی تفسیر کو سامنے رکھ لینا کافی سمجھتے ہیں کیونکہ سورۂ تحریم کی تفسیر میں حسب عادت تمام روایتوں کو جمع کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

اہل علم نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ وہ کونسی بات تھی جو خدا نے اپنے رسول کے لئے حلال کی تھی اور انہوں نے اپنی بیویوں کی خوشی کے لئے اپنے اوپر حرام کر لی۔ ان میں سے بعض کا یہ بیان ہے کہ وہ ماریہ قبطیہ لونڈی تھی اسے آپ نے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ ایک قسم کھا کر کہ کبھی ان کے پاس نہ جاؤں گا اور ایسا حفصہؓ بنت عمرؓ کی خوشی کے لئے کیا تھا۔ جو آپؐ کی زوج مطہرہ تھیں۔

لیکن امام موصوف نے جن بعض اہل علم کی یہ رائے نقل کی ہے اکثر ائمہ حدیث مثل امام بخاری و مسلم بل جمیع مصنفین کتب صحاح کے مقابلے میں ان کی کیا وقعت ہو سکتی ہے اور انہوں نے سرے سے اس واقع کو نقل ہی نہیں کیا ہے۔

بہرحال ان سب روایتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دن حضرت حفصہؓ نے دیکھا کہ انہیں کے مکان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ماریہ کے ساتھ خلوت میں ہیں۔ آپ اس پر آزردہ خاطر ہوئیں اور کہا کہ میرے ہی مکان میں اور میری ہی باری کے دن! آنحضرتؐ نے فرمایا

ہے کہ آئندہ میں قسم کھاتا ہوں کہ ماریہ سے کوئی تعلق نہ رکھوں گا۔ لیکن اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ حضرت حفصہؓ اور حضرت عائشہؓ تمام ازواج مطہرہ میں باہم رازدار اور دوست تھیں ان سے صبر نہ ہوسکا۔ انہوں نے حضرت عائشہؓ سے کہہ دیا اس پر یہ دونوں آیتیں نازل ہوئیں۔

## تحقیق و نقد روایات

ماریہ قبطیہ کا یہی واقعہ ہے جس کی نسبت امام طبری نے متعدد روائتیں درج کی ہیں جن میں باہم سخت اختلاف ہے اور ایک ہی واقعہ کو مختلف صورتوں میں بیان کیا گیا ہے لیکن جب سرے سے ان کی اسناد ہی قابلِ قبول نہیں تو اضطراب و اختلاف متون پر کیا بحث کی جائے۔

ہم پورے وثوق سے اور زور کے ساتھ ان روایات کی صحت سے قطعاً انکار کرتے ہیں۔ بالاختصار اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ کی تقسیم و مدارج حدیث بہ شرائط صحت، شہرت اور قبول کی رو سے قصہ ماریہ قبطیہ کی جتنی روائتیں ہیں وہ نہ تو پہلے درجہ کی کتابوں میں ہیں نہ دوسرے درجہ کی بلکہ تمام تر تیسرے اور چوتھے کتب حدیث میں ہیں پھر صرف یہی نہیں کہ اول درجہ کی صحیح کتب حدیث میں ان کا اندراج نہیں بلکہ کتب صحاح اور علی الخصوص صحیحین کی روایات ان کے صریح مخالف بھی ہیں۔

(۲) یہ تمام روائتیں طبرانی۔ ابن سعد۔ ابن جریر۔ طبری وغیرہ کی ہیں۔ ان مصنفوں کے متعلق لکھ چکا ہوں کہ ان کا مقصود صرف روایات کو جمع کر دینا اور ہر طرح کے ذخیرہ احادیث و آثار کو ضائع ہونے سے محفوظ کر دینا تھا۔ نہ تو انہوں نے کبھی یہ دعویٰ کیا کہ

ان کی تمام مرویات صحیح ہیں نہ محققین نے انہیں یہ درجہ دیا۔

(۳) البتہ صرف ایک مبہم و مجمل روایت ہے جس سے ان روایات کی تقویت کا کام لیا جاتا ہے۔ اس کے اور مختلف طریقوں کی بعض محدثین نے توثیق کرنا چاہی ہے اور صرف یہی روایت ہے جو قصہ ماریہ قبطیہ میں نسبتاً بہترین اسناد سے سمجھی جاتی ہے ہم صرف اسی پہ نظر ڈالیں گے اور اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ جب بہترین اور اقوی روایت کا یہ حال ہے تو پھر ان روایتوں اور ان کے اسناد کا کیا حال ہو گا جن کو خود ان کے حامیوں نے بھی پیش کرنے کے قابل نہ سمجھا۔

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

حافظ ابن حجر عسقلانی نے کتاب التفسیر کی شرح میں ان تمام روایتوں پر بحث کی ہے۔ اور جتنے مختلف اسناد سے مروی ہیں سب کو پیش نظر رکھا ہے۔

• سعید ابن منصور نے سند صحیح سے جو مسروق تک پہنچی ہے روایت کیا ہے کہ اس کا سبب وہ قسم تھی جو آنحضرتؐ نے حفصہؓ کے لئے کھائی تھی کہ اپنی لونڈی کے پاس نہ جاؤں گا۔ اور وہ مجھ پہ حرام ہے۔

حافظ موصوف نے ان تمام روایات میں سے صرف ایک ہی روایت کی توثیق کی ہے۔ اور اسے سند صحیح سے قرار دیا ہے۔ باقی روایتیں جو ابن مردویہ وغیرہ سے مروی ہیں اور عموماً قرطبی اور واحدی وغیرہ نے اپنی اپنی تفسیروں میں درج کر دی ہیں۔ ان کو انہوں نے صرف اس خیال سے نقل کیا ہے کہ جب مسروق والی حدیث معتبر قرار دے لی گئی تو ان روایتوں سے اس کی تقویت کا کام لیا جا سکتا ہے گو فی نفسہ ان میں سے کسی کی سند بھی قابل اعتنا نہ ہو۔ پس اس بارے میں عروۃ الوثقی صرف مسروق ہی کی روایت ہوئی۔

اس روایت کے ایک دوسرے طریق کی حافظ ابن کثیر نے بھی اپنی تفسیر میں توثیق کی ہے اگرچہ وہ خود بھی اس واقعہ کا شان نزول سورۂ تحریم ہونا تسلیم نہیں کرتے ۔

## روایت مسروق ورقاشی کی حقیقت

اب آئیے اس روایت پر نظر ڈالیں کہ اصولِ فن کے لحاظ سے یہ کہاں تک قابلِ اعتبار و تسلیم ہے اور اس کا اثر اصل واقعہ پر کہاں تک پڑ سکتا ہے ۔

سب سے پہلے اس پر غور کرنا چاہیئے کہ اس روایت میں نہ تو ماریہ قبطیہ کا ذکر ہے اور نہ واقعہ کے وہ تمام اہم قصے منقول ہیں جو امام طبری وغیرہ نے اپنی روایات میں درج کئے ہیں ۔ صرف اس قدر بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے حضرت حفصہؓ سے فرمایا کہ میں اپنی لونڈی کے پاس نہ جاؤں گا ۔ اس کے لئے قسم کھاتا ہوں پس اگر یہ روایت تسلیم کر بھی لی جائے تب بھی ان تفصیلات کی تصدیق کے لیے قیاس محض کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا ۔

ثانیاً اس روایت کا پہلا سلسلہ مسروق تک منتہی ہوتا ہے ۔ مسروق صحابی نہ تھے تابعی تھے یعنی انہوں نے آنحضرت صلعم کو دیکھا نہ تھا اور وہ یہ تک نہیں بتاتے کہ انہوں نے یہ واقعہ کس صحابی سے سنا اور جس سے سنا وہ کس حیثیت سے بیان کرتا ہے ۔ صرف ان کا بیان ہے جو بعد کے راویوں نے بیان کر دیا ایسے بیان کو اصطلاحِ حدیث میں "منقطع" کہتے ہیں ۔

سوال یہ ہے کہ ایسی ایک منقطع روایت کو بخاری و مسلم و کتب صحاح کی متصل اور کثیر الطرق روایات صحیحہ کے مقابلے میں کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے ۔

رہا اس روایت کا دوسرا طریقہ جس کی حافظ ابن کثیر نے توثیق کی ہے تو وہ بھی اپنے اندر کوئی ایسی قوت نہیں رکھتا جو اسے اس حالت میں مضبوط کر سکے جبکہ امام بخاری و مسلم کی

صحیح روایتیں سورۂ تحریم کا شانِ نزول دوسرے واقعہ کو بیان کر رہی ہیں اور تمام کتب صحاح اس کی مؤید ہیں۔

روایت مسروق کی اسناد میں سب سے پہلے جو راوی ہمارے سامنے آتے ہیں وہ قلابہ عبدالملک بن محمد الرقاشی ہیں حافظ ابنِ حجر نے تہذیب میں ان کا ترجمہ لکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ متعدد ثقات نے ان کی توثیق کی ہے بایں ہمہ دارقطنی جیسے شخص کی ان کے اسناد کے متعلق یہ رائے تھی کہ وہ روایت کی سندوں اور حدیث کے اصل الفاظ میں کثرت سے غلطیاں کر جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر بعض محدثین نے ان کی اس حدیث سے بھی انکار کر دیا ہے جو ابو قلابہ رقاشی نے ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے جیسا کہ حافظ موصوف نے "تہذیب" میں تصریح کی ہے۔

پس ان تمام تصریحات سے ثابت ہے کہ ابو قلابہ کی اسناد میں کثرتِ خطا، او ہام و اغلاط تینوں کی اربابِ جرح و تعدیل نے صاف صاف شکایت کی ہے اور ظاہر ہے کہ راوی کی شخصی ثقاہت اور موصوف بالخیر والصلاح ہونا کچھ مفید روایت کے لیے نہیں ہو سکتا۔ خصوصًا ایسے موقع پر کہ صرف اسناد کی قوت ہی مطلوب ہے کیونکہ دیگر اسناد معتبرہ و مرفوعہ و متصلہ اس کے مخالف ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شانِ نزول حضرت عائشہؓ نے بیان کیا ہے اور جس کو بالاتفاق ائمۂ حدیث و اساطین فن نے درج اسنادِ معتبرہ و صحیحہ کیا ہے وہی اصلی واقعہ ہے اس لئے صرف وہی قابل قبول — چنانچہ خود حافظ ابنِ کثیر باوجود رقاشی کی روایت کی توثیق کرنے کے آگے چل کر اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے۔

"صحیح یہ ہے کہ سورۂ تحریم کی پہلی آیت شہد ہی کے بارے میں نازل ہوئی"

جیسا کہ امام بخاری نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے"۔

صرف حافظ موصوف ہی پر منحصر نہیں دیگر ارباب نظر و تحقیق نے بھی صاف صاف لکھ دیا ہے۔ کہ ماریہ قبطیہ کے اس واقعہ کے متعلق کوئی صحیح روایت ثابت نہیں ہے علامہ عینی شرح بخاری میں اس شہد والی روایت کی تائید کرتے ہیں۔ یہی رائے قاضی عیاض کی بھی ہے۔ امام نووی نے شرح صحیح مسلم میں ان کی رائے انہیں کے الفاظ میں نقل کی ہے اور خود امام موصوف کی بھی یہی رائے ہے۔

ایسی صریح اور صاف تشریحات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ ماریہ قبطیہ کا قصہ صحیح ہے اور کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ اس کی بناء پر معترضین اسلام اپنی معاندانہ تلبیس اور ابلیسانہ فریب کاری کے ساتھ اس واقعہ کو ہمارے سامنے بطور حجت اور دلیل کے پیش کریں

## تطبیق و توجیہ

رہی یہ بات کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ آیت تحریم کی شان نزول میں یہ دونوں واقعات جمع کئے جا سکیں اور کوئی وجہ تطبیق پیدا کی جائے۔

حافظ ابن حجر نے اس کی خفیف سی کوشش کی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا کرنے کی ہمیں ضرورت کیا ہے۔

ایک واقعہ کے متعلق صاف صاف اور صحیح اور مستند روایتیں ان کتابوں میں موجود ہیں۔ جن سے زیادہ صحیح اس آسمان کے نیچے کوئی انسانی کتاب نہیں اس کے خلاف دوسری طرف جو روایتیں پیش کی جاتی ہیں وہ نہ تو صحاح ستہ میں مروی ہیں نہ اصول فن کے اعتبار سے انہیں کوئی وقعت حاصل ہے صرف ایک روایت ہے۔ جس کی اسناد کو صحیح کہا جاتا ہے لیکن اول

تو اس میں ماریہ قبطیہ کا قصہ بیان نہیں کیا گیا ہے۔ پھر اس کی سند بھی منقطع ہے اس کے دوسرے طریق کا بھی یہی حال ہے۔ اس کا راوی کثیر الخطائی الاسانید والمتون ہے۔

پس ایسی حالت میں ہمارے لیے کونسی مجبوری ہے کہ ہم ان روایات کے تحفظ کے لئے توجیہ وتطبیق باردہ و رکیکہ کی زحمت اٹھائیں۔ اور بے فائدہ احتمالات پیدا کریں صاف بات یہ ہے کہ جب صحیح وغیر صحیح میں تعارض ہے تو غیر صحیح کو بلا تامل ساقط کیجئے اس میں تکلف کیوں ہے یہ تو بڑی ہی عجیب بات ہوگی کہ جو تخالف وتعارض ان روایات کے ناقابل قبول ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے اسی کو ان کے تحفظ کے لیے محرک تطبیق وتوجیہ بنایا جائے۔

صحیح بخاری ومسلم وغیرہ کی روایات میں صاف صاف تصریح ہے کہ آیت تحریم شہد کے واقعہ کے متعلق اتری۔ خود حضرت عائشہؓ جن کا اس واقعہ سے حقیقی تعلق ہے اور جو خود اعلم الناس ہو سکتی ہیں صاف صاف فرماتی ہیں کہ آیت کا شان نزول واقعہ شہد ہے کہیں اس کا اشارہ نہیں کہ اس کا سبب ماریہ قبطیہ بھی تھیں۔ اگر اسے بھی آیت سے تعلق ہوتا تو ظاہر ہے کہ حضرت عائشہؓ ایک ایسے سبب نزول آیت کو بالکل چھوڑ کر محض شہد کے واقعہ کو کیوں بلاوجہ مقدم رکھتیں۔ پھر امام بخاری ومسلم وجامعین صحاح نے اس آیت کے شان نزول کے لئے خاص ابواب قرار دیئے اور ان میں صرف ایک اسی سبب کو درج کیا کونسی وجہ بیان کی جاسکتی ہے کہ ان تمام اساطین فن وائمہ حدیث نے یکسر اس دوسرے سبب کو چھوڑ دیا۔

اگر کہا جائے کہ کسی وجہ سے یہ واقعہ ان تک نہیں پہنچا یا جو روایتیں اس واقعہ کے متعلق انہیں ملیں وہ ان کے شروط پر نہ اتریں اس لئے ترک کردیں تو یہ خود ہی تضعیف کا ثبوت ہے۔ یہ واقعہ ایک نہایت اہم واقعہ تھا کیونکر تسلیم کیا جاسکتا تھا کہ ایک ایسے اہم واقعہ کو جس کا قرآن حکیم کی ایک آیت سے تعلق ہے امام بخاری ومسلم ومؤلفین صحاح نے چھوڑ دیا ہو۔

گذشتہ ازاں، ایک ہی آیت کا دو مختلف واقعات کے متعلق نازل ہونا ایک ایسا دعویٰ ہے جو محض احتمالات کی بنا پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

## خلطِ مبحث

اصل یہ ہے کہ اس واقعہ میں ساری پیچیدگی ایک طرح کے خلطِ مبحث سے پیدا ہوگئی ہے۔ مختلف واقعات کو جو بالکل الگ الگ واقع ہوئے ایک ہی واقعہ کے سلسلہ میں ملا دیا گیا ہے۔

سورۂ تحریم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سرورِ کائنات ؐ کو کئی واقعات پیش آئے۔

(۱) ازواجِ مطہرات اور علی الخصوص دو بیبیوں کا طلب نفقہ کے لئے مظاہرہ کرنا۔

(۲) افشاءِ راز (واذا اسر النبی ؐ)

(۳) کسی حلال چیز کا اپنے اوپر حرام کر لینا۔

یہ تین واقعات ہیں اور آنحضرت ؐ کا ایلا کرنا اور بیبیوں سے کنارہ کش ہونا صرف پہلے ہی واقعہ کا نتیجہ ہے افشاءِ راز کے واقعہ سے اور کسی حلال شئ کو اپنے اوپر حرام کر لینے سے ایلاء کو کوئی تعلق نہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت خود سورۂ تحریم ہے۔ احادیث سے بالاتفاق ثابت ہے کہ جب ایلا کی مدت ختم ہوئی تو آیتِ تخییر نازل ہوئی پس اب چاہیئے کہ اسی آیت میں ایلاء کے سبب کو ڈھونڈیں کہ وہ کیا تھا۔ جو سبب اس سے معلوم ہوگا وہ ایلاء کے متعلق قرآن کی ایک ایسی داخلی و محکم شہادت ہوگی جس کے بعد کوئی گنجائش ایں و آں کی باقی نہ رہے گی۔

پس دیکھو کہ اسی آیت میں حق سبحانہٗ نے ازواجِ مطہرات سے فرمایا کہ تمہارے سامنے دنیا و آخرت دونوں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک چیز کی ہو رہو، اس سے معلوم ہوگیا

کہ ایلاء کا سبب قطعاً دنیا طلبی ہی تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو ازواجِ مطہرات کے سامنے اُخوت کو کیوں پیش کیا جاتا۔ روایتاً اور درایتاً بھی ایک ایسی کنارہ کشی اور علیحدگی کے لئے یہی سبب اصلی اور حقیقی ہو سکتا ہے۔

## واقعۂ تحریم شہد کی اہمیّت

ایک معترض یہ شبہہ پیدا کر سکتا ہے کہ محض بوئے مغافیر کی شکایت کرنے سے شہد نہ کھانے کی قسم کھا لینا یہ تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے اور اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز یہ کہ ایک معمولی کھانے پینے کی چیز کو خداوند تعالےٰ نے اتنی اہمیت دی کہ اس پہ ایک خاص آیت نازل فرمائی

لیکن یہ شبہات صرف اسی دماغ میں جگہ پا سکتے ہیں جو سیرتِ حضرت سید المرسلینؐ و خصائص نبوتِ عظمیہ و اسرارِ شریعت و وجوہ تنزیل کلام الٰہی و احکام دینیہ سے واقف نہ ہو۔

ورنہ ظاہر ہے کہ جب آنحضرت صلعم نے حضرت زینب رضؓ کے یہاں شہد کھایا اور وہاں معمول سے زیادہ دیر لگی اور ازواج مطہرات نے باہم ایکا کرکے ایک ہی چیز کے متعلق ایک ہی زمانہ میں ایک ہی انداز سے شکایت کی۔ تو آپ تو بہم نبوت سے سمجھ گئے۔ کہ اس شکایت کی تہ میں رقابت کا جذبۂ محبت مخفی ہے۔ پس آپ نے یہ حالت دیکھ کر ان کی خوشی کے لئے آئندہ شہد نہ کھانے کی قسم کھا لی — اس میں تعجب کی کیا بات ہے جبکہ ازواجِ مطہرات کے ساتھ آپ کا کمال محبت و شفقت اور عورتوں اور مظلوموں کے ساتھ عموماً آپ کا سلوک و تسامح ظاہر ہے۔

رہی یہ بات کہ اتنی سی بات کے لئے ایک آیت نازل ہوئی اور لِمَ تُحَرِّمُ مَا

اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ کے الفاظ میں آپ کو متنبہ کیا گیا سو یہ شبہ احکام شریعت کے اصول و مصالح جاننے والوں کی زبان سے تو کبھی نکل نہیں سکتا۔

شریعت الٰہی ایک قانون ہے جو بہت سے کاموں کا حکم دیتا اور بہت سی چیزوں سے روکتا ہے۔ قانون کا تمام تر دارومدار اصول (پرنسپل) پر ہے اور اس کی ہر فرعی اور ہر جزئی بات کا اثر اس کے اصل اصول پر پڑتا ہے۔ مانا کہ شہد فی نفسہ کوئی اہم چیز نہ تھی لیکن کیا قانونِ الٰہی کی حلال کردہ شئے کو کسی انسان کی خوشی کے لئے اپنے اوپر حرام کر لینے کی نظیر بھی اہم اور وقیع نہ تھی۔ اللہ سبحانہ نے دیکھا کہ آپ نے ایک حلال شئے کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہے۔ اس نظیر کا اثر شریعت کے عام قانونِ حلت و حرمت پر پڑے گی آپ کا وجود شریعت کا عملی پیکر اور اسوۂ حسنہ ہے۔ اس نظیر کی وجہ سے احکامِ الٰہی کی قطعیت مشتبہ ہو جائے گی اور لوگ حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا کریں گے پس نہایت ضروری تھا کہ فوراً امت پر واضح کر دیا جاتا کہ کوئی انسان خدا کی حلال کردہ شئی کو اپنے اوپر حرام نہیں کر سکتا اور جو کھانے پینے کی چیزیں اس نے اپنے بندوں کے لئے حلال کر دی ہیں وہ ہر حال میں حلال ہیں۔

پھر اس واقعہ سے یہ سوال بھی پیدا ہو گیا تھا کہ اگر کوئی شخص ایسا کر بیٹھے تو اس کے لئے شریعت کا کیا حکم ہوگا۔ کیا واقعی اس کے حرام کر لینے سے وہ حلال کردہ شئی اس پر حرام ہو جائے گی اس کو بھی صاف کر دینا قانون کی تکمیل و حفظ کے لئے ضروری تھا پس خدا نے صاف کر دیا کہ ہر معاہدہ ہر قسم اور ہر وعدہ جو قانون شریعت کے خلاف ہو شریعت کے نزدیک کوئی چیز نہیں ہے۔ تم ہزار کسی حلال شئی کو اپنے اوپر حرام کر لو۔ لیکن چونکہ قانون الٰہی نے تم پر حرام نہیں کیا ہے اس لئے وہ کبھی حرام نہ ہوگی — اس میں ضمناً یہ پہلو ملحوظ تھا کہ اسلام نے انسان کے لئے جائز اور غیر مضر لذتوں اور راحتوں کا دروازہ کھلا رکھا

ہے اس نے دوسری قوموں اور مذہبوں کی اس غلطی کو جائز نہ رکھا جو خدا کی پیدا کردہ جائز لذتوں کو حرام کر لیتے تھے اور اسے اس کی جناب میں وسیلۂ تقرب و عبادت سمجھتے تھے۔

اے پیغمبر! کہہ دے کہ یہ جو جوگیوں اور راہبوں نے خدا کی پیدا کردہ نعمتوں کو اور لذتوں اور عمدہ غذاؤں کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہے تو کون ہے جو ان لذتوں اور نعمتوں کو حرام کر سکتا ہے جنہیں خدا نے اپنے بندوں ہی کے برتنے اور تمتع اٹھانے کے لئے پیدا کیا ہے۔ (۷ ۔ ۱۳۱)

یہ اسلام کا ایک بڑا اصولی کارنامہ ہے پس چونکہ اس واقعہ میں بھی ایک اچھی جائز و حلال و مفید و نافع غذا کو اپنے اوپر حرام کر لیا گیا تھا جو خدا نے انسانوں کے لئے حلال کر دی ہے۔ اس کا ضمناً اسلام کے اس رہبانیت شکن قانون پر بھی پڑتا تھا۔ پس ضروری تھا کہ اس کی تصحیح کر دی جاتی۔

## حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ

ایک اعتراض یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ازواج مطہرات کے لئے یہ مناسب تھا کہ وہ آنحضرت صلعم کو حضرت زینبؓ کے ہاں زیادہ بیٹھنے سے باز رکھنے کے لئے اس طرح کی سازش نہ کرتیں اور جھوٹ موٹ مغافیر کی بو کا قصہ نہ گھڑتیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جذبۂ رقابت و غبطہ و رشک عورتوں کی طبیعت میں داخل ہے۔ اور جہاں محبت ہوتی ہے وہاں رشک کا قدم ضرور ہی آتا ہے ؎ با سایۂ ترا نمی پسندم۔ عورتوں کو اس بارے میں خود شریعت نے معذور رکھا ہے۔

ازواج مطہرات صحابہ کرام کے خاندان میں رہنے اور صحبت دو فاقت نبوت کی

وجہ سے یقیناً اپنے تمام اعمال و افعال میں مزکی و مطہر تھیں تاہم عورت تھیں۔

علامہ عینی کی نظر بھی اس خدشہ پہ پڑی تھی چنانچہ شرح صحیح بخاری میں لکھتے ہیں اگر کوئی کہے کہ حضرت عائشہؓ کے لیے یہ کیونکر جائز تھا کہ وہ جھوٹ بولیں اور آنحضرتؐ صلعم کے خلاف ایک اس طرح کی سازش کریں کہ آپؐ کو تکلیف پہنچے تو میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ اول تو حضرت عائشہؓ کم سن تھیں کم سنی میں انسان بہت سی ایسی باتیں کر بیٹھتا ہے۔ پھر ان کا مقصود اس سے کچھ آنحضرتؐ کو اذیت پہنچانا نہ تھا صرف دوسری بی بیوں کے مقابلے میں ایک تدبیر تھی جیسا کہ عورتیں اپنی سوکنوں کے ساتھ رشک و غیرت میں آکر کیا کرتی ہیں۔

# دولت بنی امیہ

[ الہلال نمبر ۱ جلد ۲ میں "بنی امیہؓ کا استبداد اور امر بالمعروف کے سدِّباب کا پہلا دن" کے عنوان سے مولینا کے خیالات سے اختلاف کرتے ہوئے مولوی عبداللہ صاحب نے اجمیر سے ایک سخت صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ مندرجہ ذیل اسی کی آوازِ بازگشت ہے۔ ]

(۱) میرا عقیدہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس سمارِ دنیا کے نیچے وہ ایک ہی جماعت قدسیہ ہے جو انبیار کرام علیٰ انبینا و علیہم السلام کے بعد تکمیل انسانیت اور اخلاق و اعمال الٰہیہ کا اکمل و اجمل ترین نمونہ و اسوہ تھی اور نہ صرف تاریخ اسلام میں بلکہ جمیع تاریخ ازمنۂ ماضیہ میں انبیاء کرام کے مستثنیٰ کر دینے کے بعد انسانوں کا کوئی گروہ اور انسانیت کا کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ ظہور بھی ان کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جا سکتا بلکہ انہیں میں وہ نفوس ذکیہ و عظیمہ تھے جو اپنے مظاہر اعمال کے اندر بعض الوالعزم انبیاء اللہ بنی اسرائیل سے زیادہ ظہور صفاتِ الٰہیہ کے تشبّہ و تخلّق کا رکھتے تھے اور جن کی زبانِ حال

چنانچہ اوقف الانبیاء علی ساحلہ کی صدائے حقیقت سے غلغلہ انداز عالم ملکوت تھی کیونکہ لَقَدْ کَانَ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ ان کا دستور العمل و محور جمیع اعمال وافعال تھا اور اسی لئے وہ سرچشمۂ "مقام محمدی" کے فیضان سے بہرہ یاب تھے ـــــــ پس اس مقام اور مقامات انبیاء گذشتہ میں جو فرق تھا وہ ان کے اندر بھی نمایاں تھا۔

جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد    وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

یہی وہ لوگ تھے یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ ان کا مرتبۂ اختصاص تھا۔ اور رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ" کے مقام محبت ومحبوبی وعشق و عاشقی سے فائز المرام تھے۔ اللہ اللہ ان کے مقامات عالیہ جن کے وصف وتمجید پہ کلام الٰہی نے شہادت دی۔ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (۲۹:۴۸)

یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے شمع نبوت سے براہ راست اپنے دلوں کو روشن کیا جو خلوت و جلوت میں صحبت اندوز حضرت رسالت ہوئے۔ یہ وہ خوش نصیب تھے کہ جس آب حیات کا ایک قطرہ ہزاروں قبور و اموات کو زندہ کر دینے کے لئے کافی ہے اس کی بارش ان کے سروں پہ ہوئی اور جس آب زلال کے ایک جرعہ کے لئے تشنگان عالم مضطر و منتظر ہیں اس کے دریائے بیکراں کے کنارے انہوں نے مدتوں زندگیاں بسر کیں۔ وہ اس وجود الٰہی کے جلیس تھے جو خلوت ابیت عند ربی ھو یطعمنی ویسقینی کا شب گذار اور درس گاہ ادبنی ربی فاحسن تادیبی کا درس آموز لیل و نہار تھا۔

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بوتراب میں

سبحان اللہ یہ کون لوگ تھے کہ غزاو جہاد فی سبیل اللہ و دعوتِ حق و اعلان معروف ہی میں شریک کار اور معین راہ نہ تھے بلکہ اس مخاطبِ ندائے محبت "یا ایہا المزمل" کی راتوں کی خود فروشانہ عبادت گذاریوں و عاشقانہ و والہانہ اعمالِ مخصوصہ میں بھی شریکِ خلوت تھے۔

اے پیغمبر تمہارا پروردگار واقف ہے کہ تم راتوں کو اللہ کی یاد اور ذکر کے لئے جاگتے ہو کبھی دو تہائی رات کے قریب کبھی آدھی رات اور کبھی ایک تہائی اور ایک جماعت تمہارے ساتھیوں کی تمہارے ساتھ اس شب بیدارانہ عبادت میں شریک رہتی ہے۔ رات اور دن کے (تمام اشغال و اعمال) کا اللہ ہی اندازہ کر سکتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ تم (توجہ انہماک عبادت اور کمالِ محویت و خود فروشی اوقات کو محفوظ نہیں کر سکتے اس لئے اس نے تمہارے حال پر ازراہِ لطف رحم کیا اور وقت کی قید اٹھا دی پس اب جس قدر بہ آسانی قرآن پڑھ سکتے ہو پڑھ لیا کرو۔ اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ تم میں بعض آدمی بیمار پڑیں گے۔ بعض تلاشِ معاش و تجارت میں سیر و سیاحت کر رہے ہوں گے۔ اور بعض خدا کی راہ میں دشمنانِ اسلام سے لڑتے ہوں۔ بہر حال ایسی صورت میں اب صرف یہی حکم ہے کہ شب کو جس قدر قرآن (تہجد کی نماز میں) بہ آسانی پڑھا جا سکتا ہے پڑھو اور اپنے نفس و جسم پر بہت زیادہ بار نہ ڈالو (۷۳:۱)

انصاف فرمایئے کہ جس شخص کا اعتقاد صحابہ کرامؓ کی نسبت یہ ہو کیسی عجیب بات ہے کہ جناب اس کو صحابہؓ کے فضائل سنانے کے لئے مخاطب بناتے ہیں اور ان کے سب وشتم سے روکتے ہیں اور پھر تلاشِ احادیث و جمع مرویات کی زحمت لاحاصل گوارا فرماتے ہیں۔

(۷) جناب کا یہ ارشاد نہایت تعجب انگیز ہے کہ میں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی زمرۂ ظالمین میں شمار کیا میں نے ملوک و امراء بنی امیہ کی نسبت اپنا خیال ظاہر کیا تھا نہ کہ خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی نسبت حضرت عثمانؓ گو خاندان بنی امیہ سے تھے مگر ان کا شمار خلفاء اربعہ میں ہے نہ کہ خلافتِ مروانی کے بانیوں اور اس سلسلہ کے بادشاہوں میں — پھر بنی امیہ کے ذکر سے یقیناً ان کے مخصوص اعمال مراد ہیں اور وہ ہر شخص اس سے مستثنیٰ ہے جس کے اعمال ان کے سے نہ تھے یہ امر اس درجہ ظاہر و بین ہے کہ جناب کا اس سے تغافل موجب کمالِ تحیر ہے۔

(۸) پھر کیوں نہ وہ لوگ مستثنیٰ ہوں کہ ایسے ہی مستثنیٰ لوگوں میں سے وہ بزرگِ حق، مجددِ شریعت الٰہیہ، محی السنۃ السنیہ، قامع بدعاتِ مروانیہ و بنی امیہ یعنی حضرت عمر ابن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے جن کو حکومت الٰہیہ نے اسی خاندان میں پیدا کیا تاکہ ان کے دستِ حق پرست پر شریعت اسلامیہ کا احیاء ہو اور ملک عضوض کے اباطیل و محدثات کا استیصال فرمائیں۔

پس اس وجود گرامی نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تجدید کی اور ایک ایک کرکے بنی امیہ و آل مروان کی پیدا کی ہوئی بدعات و منکرات شنیعہ کا انسداد کیا جنہوں نے

خیر القرون کی شریعتِ خالص کو آلودہ و مکدر بہ فسق و معاصی کر دیا تھا اور اس طرح سنتِ شیخین جلیلین کی کہ سنتِ رسولِ اکرم تھی حیات بعد الممات ہوئی نور اللہ مضجعہ وشکر اللہ مساعیہ۔

(۳) از انجملہ بنی امیہ وآل مروان کی ایک سب سے بڑی ہادم شریعت اور پُر معصیت و فسق و عدوان بدعت شنیعہ وہ تھی جس کا انتقامانہ اتباع برادران شیعہ نے شروع کیا۔ اور افسوس ہے کہ بدبختانہ شاید آج تک کرتے ہیں۔ یعنی سب سے پہلے سرزمین اسلام میں جو رحم و محبت اور صلح و اخوتِ باہمی کی تخم ریزی کے لئے بنی تھی سب و شتم اور لعن و تبرے کی ایجاد انہوں ہی نے کی۔ مقدس مساجد اسلام میں جو صرف عبادات و طاعاتِ الٰہی و اذکار و اشغال مقدسہ کے لئے بنائی گئی تھیں اپنے اغراض نفسانیہ منکرہ سیاسیہ سے اہل بیت نبوت اور حضرت امیر علیہ السلام پر علانیہ لعنت بھیجنی شروع کی اور جمعہ کے خطبہ ثانیہ میں اس فعل شنیع و منکر کو داخل کر دیا۔ چنانچہ تکبیر و تسبیح کی صداؤں میں خطیب منبر پر چڑھتے تھے اور تمجید و تقدیس و صلوٰۃ و تسلیم کے بعد آخر میں حضرت علی علیہ السلام پر علانیہ لعنت بھیجتے تھے۔ اور پھر شمشیر ظلم سے لوگوں کی زبانوں کو اس طرح ترساں و لرزاں رکھتے تھے کہ کسی کو اس صریح فسق عظیم و معصیت کبریٰ و ہتک شریعتِ الٰہیہ کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ الا ماشاء اللہ۔

لیکن تاریخ اسلام حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کی ہمیشہ رہین منت رہے گی جنہوں نے تختِ خلافت پر قدم رکھتے ہی اس بدعت کا انسداد کیا اور مساجد اسلام کو ان کی چھنی ہوئی عزت و حرمت واپس دلا دی اور لعنت و تبرے کی جگہ خطبہ ثانیہ میں اِنَّ اللّٰہَ یَامُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ داخل کیا۔ چنانچہ یہ آیتِ کریمہ آج تک خطبہ جمعہ

کا جزو آخری ہے اور ہر صفحہ سیئات بنی امیہ اور حسنات عمر ابن عبدالعزیز رض کی گواہی دیتی ہے۔

اس بزرگ جلیل اموی کا یہ ایک ایسا عمل عظیم تھا کہ سادات عظام اور دو وہاں حضرت خیر الانام نے بھی اس کا اعتراف کیا۔

(۵) بنی امیہ کا سب سے بڑا ظلم جو انہوں نے اسلام پر کیا تھا کہ خلافت راشدہ اسلامیہ کو جس کی بنا اجماع و مشورۂ مسلمین پر تھی حکومت شخصی و مستبدہ و سلطنت ملکیہ و سیاسیہ میں تبدیل کر دیا۔ اور حکومت کی بنیاد شریعت پر نہیں رکھی بلکہ قوت اور سیاست پر اور تاریخ اسلام کے تمام ضعفاء و کبار و اعالی و ادانی اس پر متفق ہیں اور تمام اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ ایک سخت بدعت تھی۔ اور مطابق ارشاد صادق و مصدوق علیہ الصلوٰۃ والسلام "ملک عضوض" کا آغاز تھا۔ یہی ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے سد باب کا پہلا دن ہے اور یہی دن ہے کہ تاریخ اسلام ہمیشہ اس پر ماتم و فریاد کرے گی۔

محسنات جلیلہ عمر ابن عبدالعزیز میں ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے سنت خلفاء اربعہ کو زندہ کیا اور اپنے اولین خطبۂ خلافت میں فرمایا۔

لوگو! میں اس حکمرانی میں مبتلا ہو گیا بذریعہ جانشینی اور بیعت فوری کے اور اس میں نہ حسب شریعت و سنت خلفاء راشدین مشورہ ہوا اور نہ مسلمانوں کی رائیں لی گئیں اور یہ نہ میری خواہش تھی نہ اس کا آرزو مند تھا پس میری گذشتہ بیعت کا جو بار تمہاری گردنوں پر ہے اس سے میں تمہیں رہا کئے دیتا ہوں اور اس مقام سے اپنے تئیں الگ کر دیتا ہوں۔ پس اس وقت تم جمع ہو اپنے لئے باہمی مشورہ اور اجماع

سے کسی کو خلیفہ منتخب کرلو۔

(۶) جناب ارقام فرماتے ہیں کہ آپ بلا استثناء بنی امیہ کو ظالمین کے الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں اور انتہائے غصہ میں رسول صلعم کی قرابت داریوں کو بھی بھول جاتے ہیں۔

استثناء بربنائے اعمالِ صالحہ ہر حال میں قدرتی طور پر موجود ہے اور حکم اکثر پر ہوتا ہوتا ہے۔ حضرت عثمان خود بخود مستثنیٰ ہو گئے جبکہ خلفائے راشدین سے الگ بنی امیہ کا ذکر کیا گیا اور حضرت عمر ابن عبدالعزیز اپنے اعمال غیر امویہ و اتباع سنتِ شیخین جلیلین کی بنا پر — یہ امر ایسا نہ تھا کہ موجب اعتراض ہوتا۔

اور حضرت رسول اللہ صلعم کی قرابت داری کی نسبت جو فرمایا تو اگر آپ کے حکم سے اس کا ہر حال میں لحاظ رکھوں اور اسی کو محور منقبت و منقصت قرار دوں تو ان مشکلات کا کون ذمہ دار ہوگا جو دو چار قدم کے بعد ہی پیش آنا شروع ہو جائیں گی۔ شاید اس کا جناب کو خیال نہ رہا۔

حسن ز بصرہ، بلال از حبش، صہیب از روم — ز خاکِ مکہ ابوجہل، ایں چہ بوالعجبیست

(۷) لَا يَأْتِيْ عَلَيْكُمْ زَمَانٌ الخ کا اگر مطلب یہی ہے تو آپ عمر ابن عبدالعزیز پر بلحاظ تقدم زمانی مروان بن الحکم اور شمر و یزید کو ترجیح دیں۔ میں تو اس حدیث کا مطلب حفظ تقدم فضیلت اعمال و اتباع شریعت و عمل بالقرآن والسنۃ کی تطبیق کے بعد قرار دیتا ہوں اور در اصل قرار دیا جا چکا ہے۔

وَإِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ

(۸) بنی امیہ کے حسنات سیئہ و ملکیہ سے کسی کو انکار نہیں مثلاً فتوحات ممالک و اشاعت تمدن و علوم و تاسیس برید و تدوین دفاتر و دیوان وغیرہ۔

وکان لہم من الوزراء والابطال الجند والاعوان، من تغلبوا بہم علی الزمان
وافتحوا السبیو فیہم البلدان، وحفظوا لہم الملک من الاعداء بعد الحسام
فصفوة القول فیہم انہا اولاء الملوک مع ما کانوا فیہم من الترف
والانصراف الی الملذات والشہوات وعدم اتباع شریعت والانحراف
عن جادتہ السنۃ السنیہ واعمال الدینیہ کانوا علی جانب عظیم من الذکاء
والدہاء والدرایت والحزم وعن العزیمت وفضل السیاستہ۔ وکذ
لک لم یحل اشتغالہم بنفوسہم عن النظر فی شئون الحکومت وترقیتہا۔ والعمل
علی زیادۃ نموہا وعمرانہا والتوسع فی املاکہا ورد غارات الاعداء عنہا۔

ہم ان کے حسنات ملکیہ وسیاسیہ کے اعتراف میں بخیل نہیں ہیں لیکن یہ نہیں ہو سکتا
کہ زید کے ذہین و طباع ہونے کے صلہ میں اس کے شربِ خمر وظلم وفسق کی بھی ہم تعریف کریں
مقصدِ اصلی یہ ہے کہ بنی امیہ نے خلافتِ دینی کو جس کا عمود کار اتباع شریعت
تھا۔ محض حکومت وسیاستہ کی صورت میں بدل دیا۔ اور جو بنیاد خلفاء راشدین نے رکھی
تھی اس کو اپنے اغراض نفسانیہ ہوائے شخصیہ پہ قربان کر کے منہدم کر دیا۔ ظلم و منکرات
کا بازار گرم ہو گیا۔ مشورہ کا سدِ باب ہو گیا۔ آزادی رائے کو بزور شمشیر بند کر نا چاہا اور علی الخصوص
سب سے پہلے تاریخ اسلام میں احکامِ شریعت پر اپنے اغراض نفسانیہ وسیاسیہ کو
مقدم کرنے اور حسبِ ضرورت اس میں تحریف توجیہ نما کرنے کی بنیاد رکھی۔ یہی بنیاد تھی
جس پہ بعد کو آنے والوں نے بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کیں اور ہمیشہ کے لیے تاریخ اسلام اپنے
ابتدائی سی سالہ عہد اصلی کو ماتم وحسرت کے ساتھ یاد کرتی رہی۔

(۹) آپ متعجب ہیں کہ میں نے اس ابتدائی عہد کو دورِ محدثات وبدعات کہا لیکن

شدتِ تعجب و وفورِ حیرانی سے ہیں اس کے جواب پر قادر نہیں فیا للعجب! یہ جملہ لکھ کر آپ نے تاریخ اسلام کے نہیں معلوم کتنے ضخیم ابواب و فصول کو دنیا سے نابود کر دینا چاہا یہ آپ کہاں ہیں اور کیا فرما رہے ہیں۔ عہد بنی امیہ سے بھی بلند تر دیکھئے کیا شہادت حضرت عثمانؓ کا فتنہ ایک اشد ترین بدعت نہ تھی۔ پھر کیا زیاد ابن سمیہ کا استحقاق اور اس کے لئے مجلس شہادت منعقد کرنی ایک اولین بدعت نہ تھی۔ حالانکہ یہی زیادہ تھا کہ جب اس نے حضرت فاروقؓ کے زمانے میں بشارت فتح پر خطبۂ فصیح دیا تو ابوسفیان نے حضرت فاروقؓ کی طرف اشارہ کیا اور کہا یہ شخص جو منبر پر بیٹھا ہے ڈرتا ہوں کہ اس ادعائے خلافت شریعت پر برہم ہوگا۔

یہ ایک مشہور اور تفصیل طلب واقعہ ہے عام ناظرین کی واقفیت کے لئے اس قدر لکھ دیتا ہوں کہ سمیہ جاہلیت کی ایک زانیہ فاحشہ عورت تھی ابوسفیان اس کے پاس رہا کرتا تھا اور اسی سے زیاد پیدا ہوا تھا۔

لیکن اغراض سیاسیہ سے اس کا پھر استحقاق پیدا کیا اور اس کو اپنا بھائی قرار دیا۔ اس کے لئے ایک خاص مجلس شہادت بھی منعقد ہوئی تھی جس میں گواہوں کے اظہار لئے گئے تھے از انجملہ ایک گواہ ابومریم الخمار تھا جس نے ابوسفیان کے لئے سمیہ کو مہیا کیا تھا۔ ایسی شہادتوں سے جا کر آخر زیاد بھی شرما گیا۔

پھر کیا آپ اس سے انکار کریں گے کہ یہ ایک بدعت نہ تھی۔ خیر یہ تو ایک خاص واقعہ تھا اور اس زمانے میں لوگوں نے اس کی تاویلیں بھی کیں لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا خلافت علیٰ منہاج النبوت کو حکومت میں بدل دینا بھی بدعت نہ تھی کیا مسلمانوں پر جنگ میں پانی روک دینا بھی بدعت نہ تھا۔ کیا خفیہ وسائس سے

مسئلہ حکمین کا فیصلہ کرنا۔ اپنے اغراض سیاسیہ کے لئے لوگوں کو خفیہ و اعلانیہ بیت المال سے روپیہ دینا۔ شخصی طور پر بزور و جبر اپنے لڑکے کو ولیعہد بنانا۔ عجمی شان و شکوہ اور علو و رفعت سے دربار آرائی کی اساس اولین قائم کرنا مسجد میں اپنے لئے عام مسلمانوں سے الگ مقصورہ بناکر نماز پڑھنا اور شمشیر برہنہ نگہبانوں کے حصار کے اندر سجدہ کرنا اور اسی طرح کی دوسری بیسیوں محدثات کو بھی کیا بدعت تسلیم نہ کیا جائے گا۔ اور پھر یہ تو خود امیر معاویہؓ کے زمانے کے حالات ہیں آگے چل کر جو کچھ ہوا اس پر نظر ڈالئے۔

(۱۰) آپ فرماتے ہیں "بنی امیہ کی فتوحات کو دیکھئے تو خود حضرت علیؓ کے زمانے میں مفقود نظر آئیں گے۔

فتوحاتِ ممالک و بلدان و توسیع حکومت اسلام یقیناً ایک ایسی شئی ہے کہ اس تیرہ سو برس میں جن جن ہاتھوں پر اس کا ظہور ہوا ان کی خدمات کا اعتراف کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن میں تو اپنے مضمون میں امر بالمعروف کی تاریخ لکھ رہا ہوں نہ کہ تاریخ فتوحاتِ الکلیہ! رہا حضرت امیرؓ کے زمانے میں فتوحاتِ خارجیہ کا نہ ہونا تو میں نہایت رنج و غم سے اس غلط فہمی کو دیکھ رہا ہوں جو آج کل کے نئے مذاقِ سیاسی نے پیدا کر دی ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ حضرت امیر کا زمانہ ایک نہایت ناکام زمانہ تھا۔ حکومت و سیاست کے لئے وہ بالکل موزوں نہ تھے۔ ان کے زمانے میں اسلام کے لئے کوئی نئی فتح اور کوئی نئی ملکی و ارضی توسیع نہیں ہوئی اور پھر اس کو اصول و معیار بحث قرار دے کر نہایت شدید غلطیاں اس بارے میں کی جاتی ہیں۔ مگر یقین فرمایئے کہ یہ خیال بالکل غلط اور اصلاً حقیقت نہیں رکھتا اور نہایت افسوسناک سطح بینی اور تاریخ کی بے خبری پر دلالت کرتا ہے۔ وقت اور موقع تشریح کا نہیں ہے۔ نہایت ضروری ہے کہ ایک بسوط و جامع سوانح حضرت امیر علیہ السلام

لکھی جائے اور اس غلط فہمی سے لوگوں کو نجات ملے۔ اگر اللہ نے توفیق دی تو انشاء اللہ یہ ایک اہم خدمت تاریخ اسلام ہے جس کو انجام دینا ہے۔ یہاں اس بارے میں اختصار ممکن نہیں اور تفصیل متعذر۔

(۱۱) آپ لکھتے ہیں "اگر نسل بنی امیہ کا کوئی فرد ان صفوف فساق و فجار کے قائد ہونے کا فخر بنی ہاشم کو بخش دے"۔ گذارش ہے کہ جناب نے یہ مفت کا شرف مجھ کو عطا فرمایا۔ اگر کوئی فخر دودمانِ مروان و ولید آج بنی ہاشم کو اس صف میں قرار دے تو میں کیوں چیں بہ جبیں ہونے لگا۔ اگر چیں بجبیں ہوں گے تو اشرف ترین خاندانِ بنی ہاشم محمدؐ ابن عبداللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور پھر جس کو ایسا کہنا ہے کرے معاملہ مجھ میں اور اس میں نہیں ہے ــــ غالباً یہ جملہ جناب جلدی میں لکھ گئے اور خیال نہ فرمایا کہ بات کہاں سے کہاں پہنچتی ہے۔

طبری نے حضرت فاروقؓ اور حضرت ابن عباسؓ کا مسئلہ خلافت کے بارے میں ایک مکالمہ نقل کیا ہے اس میں ایک موقع پر حضرت فاروقؓ نے ضمن کلام میں افسوس کیا تھا کہ بنی ہاشم کے دلوں سے پرانے رنج نہیں گئے۔ اور یہ جس لحاظ سے کہا تھا بالکل صحیح تھا مگر حضرت ابن عباسؓ بول اٹھے کہ رسول اللہ بھی تو ہاشمی ہی تھے حضرت فاروقؓ نے یہ سنتے ہی فرمایا اب اس بحث کو جانے دو۔

حضرت ابن عباسؓ نے تو بنی ہاشم کی نسبت اتنی سی بات پر اس طرف توجہ دلائی تھی اور حضرت فاروقؓ نے اس سے متاثر ہو کر ترکِ سخن کو ترجیح دی تھی۔ لیکن آج بنی ہاشم کو بہ انتقام بنی امیہ صفوف فجار و فساق میں جگہ دی جا رہی ہے

(۱۲) تمام ارشادات سابقہ سے عجیب تر بلکہ اعجب العجائب قول جناب کا

اس دور کی "خیریت و افضلیت" کی نسبت ہے آپ نے اس کے ساتھ ہی صحیحین و سنن کا حوالہ بھی دیا ہے۔ کاش اگر وہ حدیث آپ نقل فرما دیتے تو اعتراض کے ساتھ میری جانب سے جواب کا فرض بھی ادا ہو جاتا۔

براہ کرم مجھ کو ان احادیث سے اطلاع دیجئے جن میں دور بنی امیہ اور قرون مروانیہ کی "خیریت و افضلیت" کی شہادت دی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ میری معلومات حدیث اس بارے میں مجھے کچھ مدد نہیں دے سکتیں بلکہ افسوس ہے کہ اس دور کی خیریت و افضلیت کی جگہ محدثات و منکرات جبر و تسلط اور فساد و فتن کی خبر دینے والی احادیث کو اپنے سامنے پاتا ہوں۔

آپ نے چونکہ قرونِ اولیٰ کا لفظ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً وہی مشہور حدیث مراد ہے جس کو امام مسلم اور ترمذی نے عمران بن حصین سے بہ اختلاف بعض الفاظ روایت کیا ہے کہ

خیر الناس قرنی، ثم الذین یلونھم، ثم الذین یلونھم

قرن کے مفہوم کے تعین میں محدثین نے غور و خوض کیا ہے لیکن چونکہ دوسری حدیث موجود ہے

"خلافت میرے بعد صرف تیس برس تک ہے"

اس لئے یقیناً اس حدیث میں "قرن" سے مراد دس برس کا زمانہ ہے۔ اور مقصود یہ ہے کہ بہترین وہ سالہ دور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ اس کے بعد دوسرا عشرہ اور اس کے بعد تیسرا، جس کے بقیہ چھ مہینے حسنؓ بن علیؓ کی خلافت سے پورے ہو گئے اور پھر شر و فتن کا زمانہ شروع ہو گیا پس گذارش ہے کہ جس زمانے کی نسبت میں

نے محدثات و بدعت کی ابتداء لکھی ہے اس سے خیر القرون کی شہادت کو کیا تعلق؟ آپ مجھے اس طرح کے غلط بیان سے کیوں تعجب و تحیر میں مبتلا کرتے ہیں کہاں خیر القرون کا عہد میمون تو بنی امیہ کی حکومت سے پیشتر ہی ختم ہوگیا تھا اور فی الحقیقت وہی دورِ اسلام کی تعلیم کا اصلی نمونہ اور اس کی عمر کا حاصل تھا۔

میں یقیناً اس زمانے کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سدِّ باب کا پہلا دن اور محدثات و بدعات کی گرم بازاری کا آغازِ عہد قرار دیتا ہوں جس کی نسبت اس حدیث کے بقیہ ٹکڑے ہیں سرورِ کائنات نے پیش آنے والے امور کی خبر دی تھی اور جس کو جناب نے غالباً بخیال ایجاز و اختصار چھوڑ دیا۔ مگر کہ باوجود ارادۂ وسعی اختصار مبتلائے اطناب ہو چکا ہوں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ چنانچہ جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے فرمایا کہ بہترین زمانہ میرا اور اس کے بعد اور اس کے بعد کا ہے ــــ مگر اس کے بعد

"ایک قوم آئے گی جو محض کثرتِ مال و جاہ و اکل و شرب اور عیش نفس اور ادعا و نمائش میں مبتلا ہو جائے گی"۔

اس حدیث کا راوی اول عمران بن حصین ہے اور آگے مختلف رواۃ نے مختلف الفاظ میں روایت کی ہے۔ چنانچہ ایک دوسری روایت میں بعض الفاظ اس سے بھی زائد ہیں۔ ترمذی نے اپنی اصطلاح میں اسے "حسن صحیح" لکھا ہے۔

پس یہی جماعت ہے جو خیر القرون کے سی سالہ عہد کے بعد نمودار ہوئی اور یہی دورِ بنی امیہ ہے جو امر بالمعروف کے سدِّ باب کا پہلا دن تھا اور یہی وہ دورِ محدثات و بدعات و فتن و قلاقل و شرور و فسادِ امور کا ہے جس کی حضرت صادق و مصدوق (روحی فداہ) نے اس حدیث میں جو جناب کے استشہاد و استدلال کا عُروۃ الوثقیٰ

ہے صاف صاف الفاظ میں اطلاع دے دی تھی۔

## اخبارِ ظہور و فتن و منکرات

اصل یہ ہے کہ اخبارِ ظہور و فتن و تجدید ازمنۂ خیر و فضیلت کی نسبت اگر شرح و بسط سے لکھا جائے تو اتنا وافر ذخیرہ ہے اور اس کے متعلق بعض ایسے اہم مباحث ہیں کہ ایک پورا رسالہ چاہیے، مختصر یہ کہ اس بارے میں جو احادیث صحاح اور دیگر اسفار حدیث میں مروی ہیں اور آثارِ صحابہ و تابعین ہیں اس کی جو تصدیق و تطبیق کی گئی ہے ان سب پر نظر ڈال کر علماء سلف نے اس مسئلہ کو تقریباً حل کر دیا ہے۔

چنانچہ خیر القرون والی حدیث کے بعد ذرا اس حدیث کو دیکھئے جس کو صاحبِ مشکوٰۃ نے باب "الانذار و التحذیر" کی تیسری فصل میں درج کیا ہے۔

یہ وہ حدیث ہے جس کی نسبت "حبیب" کہتے ہیں کہ جب عمر ابن عبد العزیز تخت پر بیٹھے ہیں تو میں نے یہ حدیث ان کو لکھ کر بھیج دی اور لکھا مجھے امید ہے کہ آپ اسی خبر کے مطابق محض بادشاہ ہی نہیں بلکہ "امیر المومنین" ہوں گے۔

اس حدیث میں زمانہ کی قید نہیں ہے مگر ترمذی کی حدیث ہی جس میں "سفینہ" نے "ازرقاکی اولاد" کی کذب بیانی کی تردید کی ہے زیادہ تصریح ہے۔

ان تمام احادیث کی تطبیق سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ دورِ بنی امیہ ہی امر بالمعروف کے سدِ باب کا پہلا دن ہے۔

پھر یہ تو مشہور ترین احادیث تھیں جن کو مشکوٰۃ وغیرہ میں ہر شخص آسانی سے دیکھ سکتا ہے لیکن کیا وہ حدیث بھی جناب کو یاد ہے جس کو ترمذی ابواب الفتن کے

ما جاء فی الشام میں لائے ہیں اور جس کو ابن قرہ نے روایت کیا ہے اور نیز یہ کہ ان احادیث کے محامل، تابعین و تبع تابعین محدثین نے قرار دیئے ہیں جن میں ظہور فتن و فساد کی بکثرت خبر دے دی گئی ہے۔ براہ کرم اس بارے میں کنز العمال یا کتب دلائل و خصائص سیوطی وغیرہ کے ابواب اخبار پر ایک نظر ڈال لیجئے اور خدارا اس پر تعجب نہ کیجئے کہ بدعات و محدثات کی گرم بازاری دور بنی امیہ میں کیونکر تسلیم کی جاسکتی ہے۔

اگر طبرانی و حاکم و بیہقی اور ابو نعیم اصفہانی وغیرہ کی مرویات پر بھی نظر ڈالی جائے تو دور بنی امیہ حتیٰ کہ بعد از شہادت حضرت فاروق رضی اللہ عنہ فتنہ و فساد و منکرات و بدعات کے متعلق ایک ذخیرہ دفاتر و مواد مجلدات کثیرہ موجود ہے۔

حافظ سیوطی نے خصائص کبریٰ اور جمع الجوامع میں ایک خاص باب اس عنوان سے باندھا ہے کہ آنحضرت نے خبر دی فتنہ کی نسبت اور یہ کہ اس کا مبدا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا شہید ہونا ہے۔ اس باب کی بنیاد تو بخاری و مسلم کی حذیفہ والی حدیث ہے جو مشہور ہے لیکن اس کے علاوہ دیگر سنن و مسانید و معاجم کی حدیثیں بھی بکثرت جمع کی گئی ہیں۔ جن سے گویا استدلال کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہی فتنہ شروع ہوگا اور ان کا وجود ایک دیوار درمیان امن و فتنہ کے ہے۔ غور کیجئے تو شہادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور پھر جنگ صفین وغیرہ کے وہ مقاتلات جن کی دس کم سو لڑائیاں میں بروایت مشہور ستر ہزار صحابہ و مسلمین شہید ہوئے اور جن میں بیس سے زیادہ صحابہ بدر کا بدلہ تھے۔ در حقیقت اسلام کے ابتدائی خروج کے لئے یہ ایک ایسا شدید فتنہ تھا جس سے بڑھ کر ہو نہیں سکتا۔ یورپ کے مورخ حیران ہیں کہ باوجود ایسے قتل عام کے کیونکر اپنے عہد تنزلی میں اسلام کی فاتحانہ قوت قائم و باقی رہی۔

انہیں نہیں معلوم کہ یہ صرف تائیدالٰہی و نصرت غیبی کا اعجاز تھا۔

پس اگر اب بھی اعمال مروانیہ و بنوامیہ کو ظلم وجور کے لفظ سے تعبیر کرنا "رفض" ہے تو میں بکمال مسرت و ابتہاج وہی کہوں گا جو امام شافعی کی طرف منسوب ہے ؂

فلیشتھد الثقلان انی "رافضی"

اور خوش ہوں گا کہ یہ ایک ایسا "رفض محبوب و مطلوب" ہے جس میں الحمدللہ میرے ساتھ وہ لوگ شریک ہیں جن کا نام آج دنیائے اسلام بغیر دعا و تحیہ کے نہیں لیتی ؂

نازم بکفر خود کہ بہ ایماں برابر است

(۱۷) جناب نے آخر میں الہلال کے مضمون زیر نقد کے ایک جملہ کی نسبت ارشاد فرمایا ہے اور لکھا ہے "ستم تو یہ ہے کہ آپ ایک ساٹھ برس کی بڑھیا عورت کے ہفوات سے اپنے فرط تحمل و حلم کی بنا پر امیر معاویہؓ کے درگذر فرما جانے کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے"۔

اب اس وقت یاد نہیں آتا کہ اس مضمون میں کس عورت کی جرأت و دلیری و حق گوئی کی طرف اشارہ کیا گیا تھا جو جناب کے لفظوں میں "ہفوات" سے ملقب ہونے کی مستحق قرار پائی ہے۔ امیر معاویہؓ کے سامنے اس طرح کی محب اہل بیت اور صداقت پرست جرأت فرما عورتوں کے آنے، سوال و جواب میں خطبات بلیغہ و موثر دینے اور اپنے اشعار مدحیہ حضرت امیر سنانے کے متعدد واقعات تاریخ و مختارات ادبیہ میں منقول ہیں اور فی الحقیقت عرب کی آزادی۔ اسلام کی تعلیم حریت اور قرون اولیٰ کی تعمیل امر بالمعروف کی تاریخ میں ان میں سے ہر عورت شرف و احترام اور عظمت و کمال کا ایک درجہ مخصوص و ممتاز رکھتی ہے۔

صاحب عقد الفرید وغیرہ اور امام ابوالفضل ابن طاہر نے "بلاغات النسا" 

میں سودہ بنت عمارہ اذفار بنت عدی۔ بکارت الہلالیہ۔ عکرشہ بنت الاطش اور ام البرار بنت صفوان کا ذکر کیا ہے جنہوں نے جنگِ صفین میں شرکت کی تھی اور حضرت اور حضرت امیر کی نصرت و حمایت میں جانبازانہ حصہ لیا تھا پھر امیر معاویہؓ کے تسلّط کے بعد یہ لوگ مختلف تقریبات میں ان کے سامنے پیش ہوئے ہیں۔ اور جب ان کو امیر معاویہ نے وہ زمانہ یاد دلایا ہے تو اس پر انہوں نے نہایت بیباکانہ وحق گویانہ اس وقت بھی حضرت امیرؑ ہی کے فضائل بیان کئے ہیں اور تمام اہلِ دربار کو اپنی عظمتِ حق گوئی سے متحیر و متعجب بنا دیا ہے۔

از انجملہ بکارت الہلالیہ کے وفد کا واقعہ نہایت مؤثر ہے۔

صاحب بلاغت النہار نے لکھا ہے کہ بکارت الہلالیہ بالکل بڑھاپے اور ضعف و ناتوانی کے عالم میں ایک مرتبہ امیر معاویہ کے دربار میں گئی۔ وہ اس قدر ضعیف تھی کہ دو عورتیں دو طرف سے اسے تھام کر لائی تھیں وہاں مروان ابن حکم اور عمر بن عاص بھی موجود تھے۔ انہوں نے امیر معاویہ سے کہا کہ آپ نے اسے پہچانا۔ یہ وہ عورت ہے جس نے جنگِ صفین میں ہم لوگوں سے مقابلہ کیا تھا اور اشعار پڑھ پڑھ کر لوگوں کو سناتی تھی۔ سعید بھی موجود تھا اس نے کہا اتنا ہی نہیں بلکہ یہ اشعار بھی اسی کے ہیں۔

میری آرزو تھی کہ مجھے موت آجائے مگر اس وقت کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھوں جبکہ بنی امیہ کا کوئی فرد منبر پر خطیب نظر آئے۔ مگر افسوس کہ یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ اور اللہ نے میری موت کے وقت کو بڑھا دیا یہاں تک کہ آج میں زمانے کے انقلابات کے عجیب عجیب رنگ دیکھ رہی ہوں۔ مسجدوں کے ممبروں پر بنی امیہ کے خطیب چڑھتے ہیں اور آلِ محمدؐ

پر علانیہ لعن وطعن کرتے ہیں۔

بکارت نے ان بیانات کو سن کر امیر معاویہ سے کہا تیرے یہ کتے مجھ پر حملہ کر رہے ہیں اور میرا انحصار و دفاع ضعیف ہے کہ ان کو ہنکا نہیں سکتی۔ بیشک ان اشعار کی میں ہی مصنف ہوں۔ میں پسند نہیں کرتی کہ اس سے انکار کروں اب میں واپس جاتی ہوں سچ یہ ہے کہ امیر المومنین حضرت علیؓ کے بعد زندگی میں کوئی خوشی نہیں۔

اسی طرح سودہ بنت عمارہ رحمہا اللہ کا واقعہ بھی مسلمانوں کے لئے حق گوئی اور صدقِ لہجہ کی ایک مثالِ عظیم اور اسوۂ حسنہ ہے۔

یہ جب امیر معاویہ کی تخت نشینی کے بعد ان کے سامنے آئی تو امیر نے پوچھا، کیا تو وہی عورت نہیں ہے جس نے ایامِ جنگِ صفین میں اشعار کہے تھے۔ سودہ نے کہا اے واللہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو حق سے وقت پر پھر جاتے ہیں اور کذب گوئی کے لئے حیلہ طرازیاں کرتے ہیں بیشک میں ہی ہوں جس نے یوم صفین میں یہ اشعار کہے تھے۔

امیر نے کہا کیا شئی تھی جس نے ان اشعار کے کہنے پر تجھ کو آمادہ کیا۔

سودہ نے بیباکانہ و مسلمانہ کہا، حُبِ علی علیہ السلام و اتباعِ حق۔

بہرحال اس مضمون میں یا سودہ کی طرف اشارہ تھا یا بکارۃ الہلالیہ رحمہا اللہ تعالیٰ کی طرف۔ آپ اس کو ایک بڑھیا کی "ہفوات" سے تعبیر کر کے شاید کوئی خوشی حاصل فرماتے ہوں گے مگر یقین کیجئے کہ آپ کے الفاظ پڑھ کر میری آنکھوں سے تو آنسو نکل پڑے فسبحان من لا یتغیر ایک زمانہ تھا کہ ہم میں سے بڑھیا عورتوں کے اندر اسلام کا ایسا سچا اتباعِ حق اور حریت کے ایسے گرانمایا امثال۔ امر بالمعروف کا ایسا سچا ولولہ اور آزادی و صداقت کی ایک غیر متزلزل محبت تھی اور ایک زمانہ آج کا ہے جبکہ

مردانِ اسلام اور رجالِ علم و فضل ایسی مثالوں کا پیش کرنا ایک طرف رہا ان کو ہفوات کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

اللہ اللہ اس مقدس مسلمہ کا مرتبۂ عالی اور اس مومنہ کا مقام ارفع جس کے دل کو خدا نے خاندانِ نبوت کی محبت و عشق کا کاشانہ بنایا جس کو حق کی محبت کی توفیقِ عظیم ملی جس نے اہل بیت محمدؐ کی حمایت و نصرت میں اپنے سیف اللسان کے جوہر دکھلائے اور جس کی حریت، آزادی اور حق پرستی و صداقت پژوہی کو تختِ دمشق کی شوکتِ قیصری اور ابہت بھی مرعوب نہ کر سکی۔ آپ اس کے کارنامۂ حق پرستی کو ہفوات و ترہات کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں کیجئے لیکن مجھ کو تو اگر اپنی تمام زندگی میں ان ہفوات کی ایک مرتبہ پیروی کرنے کی سچی توفیق مل جائے تو اپنی قسمت پر ناز کروں اور یقین کروں کہ میری بخشش کا سامان ہو گیا ہے

تو و طوبیٰ و ما و قامتِ دوست          فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

(۴) آخر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے مباحث و مذاکرہ کی نسبت اربابِ عصر کی مختلف رائیں ہیں بعض حضرات ان کو اس درجہ اہم اور اقدم سمجھتے ہیں کہ دین و دنیا کا کوئی خیال اور اسلام اور مسلمین کی کوئی مصلحت ان کی نظروں میں ان سے اہم تر نظر نہیں آتی اور ان کے عقیدے میں اب مسلمانوں کے لئے اس کے سوا دنیا میں کوئی کام باقی نہیں رہا ہے کہ گذشتہ متنازعات و مناقشات کی نسبت تصنیف و تالیف و جرح و تعدیل کا بازار گرم رہے اور قوم و ملت اپنی زندگی کو اس کے مطالعہ کے لئے وقف کر دے۔

ان بزرگوں کے ساتھ ایک دوسرا روشن خیال، اتحاد دوست اور "مصلحت" فرما طبقہ

ہے جس کا خیال ہے کہ اس طرح کے تمام مباحث چونکہ اس کی مصطلحہ "مصلحتِ وقت" کے خلاف ہیں اس لئے بہتر ہے کہ ہمیشہ کے لئے ان کو مدفونِ مقبرۂ ذہول و نسیان کر دیا جائے اور کبھی ان کی طرف اشارہ بھی نہ ہو۔

گویا اس خیال کے بزرگوں کے نزدیک سیاہ و سفید، حق و باطل، صدق و کذب، نور و ظلمت اور معروف و منکر کی بنیاد حقیقت نہیں بلکہ مصلحت ہے اور تمام تاریخی اسفار اور مجلدات آثار دنیا سے نابود کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ وہ مصلحتِ وقت کے خلاف ہیں۔

لیکن اس عاجز کا مسلک ان دونوں مذاہب سے مختلف ہے۔ میں دونوں جماعتوں کو افراط و تفریط میں دیکھتا ہوں اپنی تمام قوتِ علم و دین کو محض تاراج مجادلہ و مکابرہ کرنا اور امور متنازعہ کو خواہ نخواہ زندہ کر کے امن و اتحاد و جمعیت کلمہ میں خلل انداز ہونا عقل و صریح دونوں کے لحاظ سے مضر ہے۔ لیکن ساتھ ہی میں اس مصلحت اندیشی کا بھی قائل نہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ تاریخی مباحث و تنقیدات کا سدِ باب کر دیا جائے۔ تصحیح خیال و تعدیل اعتقاد و تمجید اعمالِ حسنہ و ذمِ افعالِ سیئہ کو روک دیا جائے اور دفاتر اخبار و اسفار آثار کے دروازوں پر یک قلم قفل چڑھا دیا جائے۔ تاہم بحالتِ موجودہ میں اس کی بالکل ضرورت نہیں سمجھتا کہ ان مباحث میں اپنا اور ناظرین کا وقت صرف کروں وہ وقت کہ ہماری فرصتیں قلیل اور ضرورتیں لاتعد و لاتحصیٰ ہیں۔ اور پھر یہ بحثیں تو ہماری زندگی سے وابستہ ہیں لیکن پیش آنے والے حالات تو وہ ہیں کہ ہماری زندگی ہی کو مشکوک اور ہماری ہستی ہی کو مفقود کر دینے والے ہیں۔ اب امویہ و عباسیہ کا مبحث نہیں بلکہ اسلام کا سوال در پیش ہے۔ اور تاریخ اسلام کی حفاظت کی مہم سامنے ہے۔ اب اس وقت "صفین" اور "جمل" کے واقعات پر غور کرنے کی مہلت کہاں سے لائیں کہ یوم "بدر" و "احزاب" کے

واقعات تازہ ہو رہے ہیں۔

مرحوم غالب نے اس بحث کا کیا خوب فیصلہ کر دیا ہے ؎

بحث و جدل بجائے ماں میکدہ جوے کاندراں
کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست

---

# امر بالمعروف ونہی عن المنکر

خلفائے عباسیہ میں مامون الرشید ایک عجیب وغریب حکمران گذرا ہے۔ وہ علوم عربیہ کا ماہر اور فلسفہ و حکمت کا عاشق تھا۔ مگر ساتھ ہی مذہب کے معاملہ میں بہت آزاد خیال بھی تھا۔ جس کی وجہ سے ہر طرف الحاد کا دور دورہ تھا خود اسلام کی بھی یہ حالت تھی کہ اس کے بنیادی عقاید میں معتزلہ نے ریشہ دوانیاں شروع کر دی تھیں منجملہ ان کے خلق قرآن کا فتنہ تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ قرآنِ حکیم آنحضرتؐ پہ نازل ہوا اس سے پہلے نہ تھا۔ اس کے علاوہ اللہ ہر شئے کا خالق ہے اس لئے قرآن بھی اشیاء میں داخل ہے۔

مامون الرشید نے نہ صرف اس مسلک کو قبول کر لیا تھا بلکہ اپنی حکومت کے جبر و قہر سے لوگوں کو مجبور کرنا چاہتا تھا کہ وہ بھی اس کا اقرار کریں۔ چنانچہ کئی علماء و محدثین سخت آزمائش میں مبتلا ہو گئے۔ بہتوں نے بغداد سے ہجرت کی، بہت سے گوشہ نشینی اختیار کرنے پہ مجبور ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ہر طرف ایسی ہی خبریں چھپنے لگیں بالآخر مکہ سے ایک عالم رفت

اور محدث شیخ عبدالعزیز کنانی روحِ ایمانی سے سرشار ہو کر بغداد پہنچے اور کلمۂ حق کا اعلان کیا۔ اپنی بیباکانہ جرأت عزم بالجزم اور توفیق الٰہی سے اس بے بنیاد نظریئے کی دھجیاں خود مامون اور اس کے حواریوں کے سامنے بکھیر دیں۔

اس مسئلہ کو فلسفہ اور فلسفہ دان اقوام کے اختلاط نے پیدا کیا تھا۔ اسلام کی اصلی سرزمین ان لاحاصل اور قوائے عملیہ کو بیکار کرنے والی کاوشوں سے بالکل پاک تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ ان سوالات سے صحابہؓ کو روکا جو ان کی زندگی اور نصب العین سے اُن کو ہٹانے والے تھے۔ اسلام نے عمل و سعادت کی ایک ہی سیدھی راہ کھول دی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ مسلمان صرف اسی کی راہ روی میں مشغول رہیں۔ آپؐ کے بعد تمام عہدِ صحابہ بھی اسی حال میں بسر ہوا۔ لیکن اس کے بعد نئے نئے فتنوں اور ہلاکتوں کا دروازہ کھل گیا ایک بڑا فتنہ علومِ عقلیۂ قدیمہ اور مذہب کا غیر صالح اختلاط تھا ایک طرف "نو مسلم" عجمی اقوام اپنی تمام پُرانی بحثوں اور کاوشوں کو اپنے ساتھ لائے دوسری طرف اہلِ کتاب اور مجوسی علمار حکومت کی تمام شاخوں اور محکموں پر حاوی ہو گئے۔ ان لوگوں نے جہاں اپنی مذہبی روایتیں مسلمانوں میں پھیلائیں وہاں فلسفیانہ مباحث قدیمہ کا وہ دفتر پارینہ بھی کھول دیا جو اسکندریہ وسوریہ کے کھنڈروں اور جندیسیہ و مدائن کے اطلال و آثار کے اندر مدفون ہو چکے تھے۔

دراصل اس سوال کو پیدا کرنا ہی ایک سخت ضلالت اور مسلکِ شریعت سے انحراف تھا۔ قرآن اللہ کا کلام ہے جس کو خدا کے رسول نے ہم تک پہنچایا۔ ہماری معلومات اس کی نسبت

صرف اسی قدر ہیں۔ اور اس سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے اتنا علم کافی ہے وہ مخلوق ہے یا قدیم یہ سوال نہ تو خود قرآن نے ہمارے سامنے کیا نہ اللہ کے رسول نے نہ تربیت یافتگانِ عہدِ نبوت نے پس جو کچھ ضروری تھا وہ وہی تھا جو تبلایا گیا اور جو نہیں تبلایا گیا وہ ضروری ہی نہیں ہے اور اس کی فکر و کاوش میں ہمارے لئے کوئی سعادت نہیں۔ سلف صالح اور محدثین کرام کا یہی مسلک تھا اور صرف اسی راہ میں امن تھا۔

پھر قدم و حدوث کے اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو مسئلہ بالکل واضح تھا اور اس کی حقیقت ایک ہی تھی۔ اللہ اور اس کی تمام صفات کاملہ قدیم ہیں اس کی ایک صفت "کلام" بھی ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ پس حروف و اصوات و الفاظ کی جس مرتبہ و منتظمہ شکل میں وہ موجود ہے اس کی حقیقت نظمی و ترتیبی کو بھی قدیم ہی ہونا چاہیئے ــــ لیکن فلسفیانہ کاوشوں نے ایک صاف بات کو پیچیدہ بنا کر نظر و بحث کی اور راہیں بھی کھول دیں۔ فرقۂ معتزلہ نے جو فلسفۂ و معقولات یونانی سے متاثر ہو چکا تھا اس مسئلہ کو بالکل دوسری نظر سے دیکھا انہوں نے کہا کہ قرآنِ حکیم آنحضرتؐ پر نازل ہوا اس سے پہلے نہ تھا۔ وہ ایک بامعنی عبارت ہے عبارت جملوں سے مرکب ہے جملے الفاظ سے اور الفاظ حروف سے۔ یہ حرف اور یہ الفاظ جب ہماری زبان سے نکلتے ہیں تو ہماری آواز ہوتے ہیں جو اس سے پہلے نہ تھی اور جس کا حدوث ہماری ہی حلق و زبان سے ہوا پس ان اعتبارات سے قرآن مخلوق ہے قدیم نہیں ہو سکتا۔ علاوہ بریں اللہ ہر شئے کا خالق ہے قرآن بھی اشیاء میں داخل ہے اسے بھی مخلوق ہونا چاہیئے ــــ پس ان خیالات سے معتزلہ نے دعویٰ کر دیا کہ قرآن مخلوق ہے اور اسطرح گمراہی و فساد کا ایک بڑا دروازہ امت پر کھول دیا انکی ہدایت فلسفیانہ کاوشوں کے اندر گم ہو گئی وہ یہ نہ سمجھے کہ اصواتِ حروف کا مخلوق ہونا جو انسان کا فعل ہے دوسری چیز ہے اور قرآن کا مخلوق ہونا جو ایک حقیقت نظمی و ترتیبی کا نام ہے بالکل دوسری۔ قرآن حکیم کو کسی اعتبار سے بھی مخلوق و

حادث نہیں کہہ سکتے وہ نہ تو حرفوں کا نام ہے اور نہ ان آوازوں کا جو انسان کے حلق سے نکلتی ہیں۔ الحمدللہ رب العالمین کا ہر حرف اور ہر لفظ اپنی انفرادی حالت میں جو آواز پیدا کرتا ہے اور ان کی حرکات صوتیہ سے جو تموج ہوا کے ذرات میں ہوتا ہے یقیناً حادث ہے لیکن ساتھ ہی وہ قرآن بھی نہیں۔ قرآن تو اس حقیقت نظمی کا نام ہے جو ان حرفوں کی ایک خاص الٰہی ترتیب و تنظیم سے متشکل ہوئی اور الحمدللہ رب العالمین بشکل لسان وحی پر جاری ہوئی پس وہ قدیم ہے اس لئے کہ خدا بھی قدیم ہے۔ گلستان کا ہر حرف اور ہر لفظ سعدی کا کلام نہیں ہے لیکن گلستان سعدی کی ہے اس لئے وہ حقیقت جو انفراد حروف و اصوات کے علاوہ ہے۔ اس کا نام گلستان ہوگا۔ اور وہی سعدی کی تصنیف ہے۔ پس قرآن جس کتاب کا نام ہے وہ کسی اعتبار سے بھی مخلوق نہیں ہو سکتی۔ معتزلہ نے اسے مخلوق قرار دے کر ایک طرف تو ان بحثوں کا دروازہ کھولا جو اسلام کے لئے سب سے بڑا فتنہ تھا دوسری طرف قرآن کی الٰہی عظمت و قدوسیت کے اعتقادی اساس کو بھی سخت صدمہ پہنچنے کا امکان پیدا کر دیا۔ قرآن کی ربانی و الٰہی عظمت کا اعتقاد اسلام کی تمام کائنات زندگی کی اصل روح تھی۔ پس اگر آغاز عہد ہی میں اس کا پورا تحفظ نہ کیا جاتا تو بہت جلد وہ وقت آجاتا جب لوگ تورات اور انجیل کی طرح قرآنِ حکیم کی عزت الٰہی کو بھی غارت کر دیتے اللہ تعالیٰ نے فرزندانِ اسلام کی سب سے مقدس اور حامل شریعت جماعت یعنی محدثین کرام کو اس بدعت مضلّہ کے انسداد کے لئے کھڑا کر دیا۔ اور انہوں نے اپنا خون بہا کر اس مسئلہ کے دست برد سے قرآنِ حکیم کی حفاظت کی۔ اگر اس وقت اللہ تعالیٰ فرزندانِ اسلام کی اس سب سے زیادہ برگزیدہ جماعت کے دلوں کو اپنے الہام سے معمور نہ کر دیتا اور وہ ایک داخلی جہاد عظیم کر کے ان تمام فتنوں کا سدِّ باب نہ کر دیتے تو آج دنیا میں اسلام کی بھی وہی حالت ہوتی جو دنیا کے تمام محرف و مسخ مذاہب کی نظر آرہی ہے۔

قرآن حکیم کی جس حفاظت و عظمت پر تم آج ناز کرتے ہو یہ در اصل انہیں محدثین کرام کی حق پرستیوں کا نتیجہ ہے جنہوں نے اس کو بھی گوارا نہ کیا کہ کوئی نئی آواز قرآن کے لئے اٹھائی جائے اور کوئی بات ایسی اس کی نسبت کہی جائے جو اس کی غیر انسانی عظمت کی تنزیہہ و تقدیس کو بٹہ لگائے۔

پھر اس سے بھی قطع نظر کہ یہ مسئلہ محض ایک لفظی نزاع ہی کیوں نہ تھا۔ معتزلہ قرآن کے لئے ایک ایسی بات کا اقرار کرانا چاہتے تھے جس کا اقرار نہ تو خود قرآن نے کرایا اور نہ رسول نے پھر کیا یہ ایک سخت فتنہ نہ تھا جو نئی نئی اعتقادی بدعتوں کا ابلیسی دروازہ کھولتا تھا اور کیا یہ شریعت پر اضافہ کرنا اور اسلامی اعتقاد کی ترمیم کرنا نہ تھا؟

محدثین کرام کے دلوں کو اللہ نے اپنی حفاظت میں لے لیا نہ انقلاب علمی کے مؤثرات ان کی استقامت حق پر غالب آسکے اور نہ انسانی اوہام و افکار کی دل کشیاں ان کے دلوں کو جمالِ قرآن و سنت کے عشق سے پھیر سکیں۔ فی الحقیقت یہی وہ پاک جمعیت تھی جس کی نسبت زبانِ نبوت نے اول روز ہی حکم سنا دیا تھا لا یزال طائفة من امتی قائمین علی الحق حتیٰ یاتی امر اللہ وھم غالبون۔

اگر یہ مسئلہ صرف علماءِ معتزلہ تک محدود رہتا تو پیروان سواد اعظم کے لئے کوئی مصیبت نہ تھی۔ یہ صرف بحث و دلائل کا میدان ہوتا اور زبان و قلم کا جہاد اس کے لئے کافی تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ حکومتِ وقت نے اس مذہب کا ساتھ دیا اور بعض خلفاءِ عباسیہ نے معتزلہ کے ساتھ ہو کر خلقِ قرآن کے مسئلہ کو بجبر پھیلانا چاہا انہوں نے حکومت کے زور سزاؤں کے اعلان، قید خانہ کی زنجیروں اور جلاد کی تلواروں کو حرکت دی۔ اس لئے یہ علمی مسئلہ علمی نہ رہا بلکہ اربابِ حق کے لئے ابتلاد آزمائش کی ایک ہیبت ناک ہولناکی بن گیا۔

## مامون الرشید

خلفاءِ عباسیہ میں مامون الرشید عباسی ایک عجیب وغریب حکمران گذرا ہے اس کی زندگی میں بعض چیزیں بالکل متضاد جمع ہو گئی تھیں وہ ایک طرف علوم اسلامیہ کا ماہر تھا عربیت کا کامل الفن تھا علم وحکمت کا عاشق اور حریت وآزادی کا حامی تھا۔ اس کی حریت پسندی نے دنیا کے تمام مذاہب کو مطلق العنان چھوڑ دیا تھا۔ الحاد آزاد تھا۔ ثنویت کی پرستش نہ تھی مانویت علانیہ ظاہر کی جاتی تھی۔ مزدکیت کے لئے کوئی دُرّہ نہ تھا۔ یونان وایران کے جن ملحدانہ مذاہب کو کہیں پناہ نہ ملی تھی وہ بغداد کے گلی کوچوں میں پرورش پا رہے تھے۔ لیکن دوسری طرف اسلام کے اندرونی مذاہب واختلافات کے میدان میں آکر دیکھئے تو اس کے ہاتھ میں استبداد کی بے پناہ تلوار اور زبان پر جبر وقہر کے سخت سے سخت احکام نظر آتے ہیں۔

مامون الرشید کے اس استبداد داخلی کے سلسلے میں مسئلہ خلق قرآن کا فتنہ عظیم بھی تھا۔ جس نے تیسری صدی ہجری میں علمارِ حق کے لئے ابتلار وامتحان کا ایک نہایت نازک وقت پیدا کر دیا تھا۔ اس نے معتزلہ کا مذہب خلقِ قرآن قبول کر لیا اور اسی کو حق و باطل اور اسلام وکفر کا معیار قرار دیا اس نے چاہا کہ اپنی حکومت کے جبر وقہر سے لوگوں کو مجبور کرے اور اس چیز کا اقرار کرائے جس کے لئے شریعت نے انہیں کوئی حکم نہیں دیا ہے۔

بلا شبہ وہ اپنے بھائی امین الرشید کو قید خانے کی کوٹھری میں قتل کرا سکتا تھا اور یقیناً اس کے بھیجے ہوئے جلادوں کی تلواروں میں یہ قدرت تھی کہ مسکین امین کے تکیہ کی ڈھال پر غالب آجائیں لیکن اس کی پوری حکومت اور حکومت کی تمام طاقتیں بھی اس سے عاجز تھیں کہ حاملانِ شریعت اور علمارِ حق کے استقامت وثبات پر غالب آسکیں۔ تاہم یہ فتنۂ عظیم

تھا اور اس کے قہارانہ نتائج نے وہ سب کچھ کیا جو ایسے مواقع پر ہمیشہ ہوتا ہے۔ بہت سے علمار حق قید ہوئے۔ بہت سے جلاوطن کئے گئے۔ بعض خاک وخون میں بھی تڑپے اور بہتوں کے قدم جادۂ ثبات سے ڈگمگا بھی گئے۔

مامون نے ۲۱۸ھ میں ایک فرمان اسحٰق ابن ابراہیم گورنر بغداد کے نام بھیجا کہ تمام علمار شہر کو جمع کرو۔ جو لوگ خلقِ قرآن کا اقرار کریں ان کی نسبت خبر دو، پھر دوسرا فرمان بھیجا کہ بشر ابن ولید الکندی قاضی القضاۃ اور ابراہیم ابن مہدی اگر انکار کریں تو قتل کر دیئے جائیں۔ لیکن ان کے علاوہ دیگر منکرین خلق قرآن صرف قید کئے جائیں۔

ابراہیم ابن مہدی کے قتل کا تو پولیٹیکل اسباب سے وہ خواستگار تھا ہی۔ لیکن بشر ابن ولید کے لئے قتل کی سختی اس لئے تھی کہ وہ قاضی القضات تھے۔ افسوس کہ ان دونوں کا ثبات اس پہلی آزمائش ہی میں ہلاک ہو گیا اور انہوں نے خلقِ قرآن کا اقرار کر کے اپنی جان بچائی۔ بہت سی دوسری کمزور روحوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ لیکن علمار حق کی ایک مقدس جماعت ایسی بھی تھی جس کے لئے حکومت کی تلواروں اور دنیوی عقوبتوں کے فرمانوں سے بڑھ کر خدا کا حکم ہیبت و سطوت رکھتا تھا۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا اور قید خانے کی بیڑیاں خوشی خوشی پہن لیں اسی جماعتِ حق کا سرتاج وہ مقدس و مبارک وجود تھا جس کو شریعت کے احیار، تجدید اور کتاب وسنت کے مسلکِ قدیم کے اعلان و حفاظت کی خدمت درگاہِ الٰہی کے سپرد ہوئی تھی اور جس کی قربانی کو خدا نے اس فتنہ کے استیصال کے لئے روز اول ہی سے چن لیا تھا۔ یعنی حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جو فی الحقیقت تمام ائمۂ سلف میں اپنی مخصوص فضیلتوں کی بنا پر ایک ہی شخص ہیں جن کو "امام اہلِ سنت والجماعت" کے لقب سے پکارا جا سکتا ہے۔

ہاں تو اس واقعہ کے بعد ہی مصائب و محن کا ایک سیلاب امنڈ آیا اور تمام بغداد کانپ اٹھا بہتوں نے بغداد سے ہجرت کی۔ بہتوں نے گھر سے نکلنا بند کر دیا۔ بہتوں کی عزلت نشینی یہاں تک بڑھی کہ جمعہ کی شرکت بھی ترک کر دی۔ لیکن کسی کو اس کی جرأت نہ ہوتی تھی کہ ماموں الرشید کی سطوت و جلال کے آگے اٹھے اور اس جبر و قہر اور تسلط غیر شرعی سے اسے روکے۔

ماموں الرشید نے گذشتہ واقعات ہی پر قناعت نہ کی بلکہ استبداد و جبر کا ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ بغداد کی سب سے بڑی مسجد "جامع رصافہ" تھی جس کا صحن ہمیشہ علمار کے درس و مواعظ کی مجلسوں سے پُر رہتا تھا۔ ماموں نے حکم دیا کہ فقہار و محدثین میں سے کوئی عالم مسجد میں درس نہ دے اور نہ لوگوں کے مجمع میں بیٹھے صرف بشر مرلیسی اور محمد بن جہم کے لئے یہ منصب مخصوص تھا جو اکابر معتزلہ اور خلق قرآن کے دعاۃ میں سے تھے۔ انہیں دونوں کے ہاتھ میں تمام فقہار و محدثین کی موت و حیات کا رشتہ دے دیا گیا تھا۔ علمار کا ایک بڑا گروہ جو اپنے اندر سچائی کے لئے دکھ اٹھانے کی قوت نہیں رکھتا تھا۔ بظاہر ان کا ہم زبان بن گیا اور نفاق کی سپر پہ اُن کی تلوار کو روکتا تھا۔

رفتہ رفتہ یہ متوحش خبریں بہت جلد تمام عالم اسلامی میں پھیل گئیں اور ہر شہر میں اسی فتنہ کا چرچا ہونے لگا۔

## شیخ عبدالعزیز الکنانی

مکہ معظمہ میں اس وقت ایک عالم حق اور محدث عصر شیخ عبدالعزیز بن یحیی الکنانی تھے انہوں نے جب اس فتنہ کا حال سنا تو غیرت حق کے جوش اور امر بالمعروف کی روح ایمانی کے اضطراب سے بیقرار ہو گئے اور عزم بالجزم کر لیا کہ اس فتنہ کے انسداد کی راہ میں اپنی زندگی قربان

کر دیں گے۔ وہ اپنے رسالے میں جس کا قلمی نسخہ جامع اموی دمشق کے کتب خانہ میں موجود ہے لکھتے ہیں:۔

میں مکہ میں تھا جب مجھ کو بغداد کے واقعات معلوم ہوئے کہ کس طرح مسلمان ایک سخت مصیبت میں مبتلا ہو گئے ہیں اور کس طرح بشر مریسی ان پر سختیاں کر رہا ہے اور کس طرح امیر المومنین اور ارکان سلطنت پر اس کا داؤ چل گیا پس میں غفلت سے چونکا اور اپنے شہر سے نکلا۔ اللہ کی طرف میری نظر تھی اور اس کے فضل و نصرت سے اپنی سلامتی کا خواستگار تھا۔ یہاں تک کہ بغداد پہنچ گیا اور اپنی آنکھوں سے تمام حالت دیکھی۔ مجھ پر روشن ہوا کہ معاملہ اس سے بدرجہا زیادہ سخت و پر مصیبت ہے جتنا میں نے سنا تھا۔

بغداد پہنچنے کے بعد سب سے بڑا مرحلہ یہ تھا کہ وہ کس طرح مامون الرشید کے دربار تک پہنچیں اور اس مسئلہ کے متعلق امر بالمعروف کا حق ادا کریں ہر قدم پر اس کا خوف لگا تھا کہ کہیں مامون کے مقابلہ سے پہلے ہی نہ گرفتار ہو جائیں۔ وہ اللہ کی طرف جھکے اس کی نصرت غیبی سے مدد چاہی اور ایک خاص تدبیر کر کے جمعہ کے دن جامع رصافہ میں پہنچے ان کا چھوٹا سا لڑکا بھی ان کے ساتھ تھا۔

## جامع رصافہ میں کلمۂ حق کا اعلان

نماز جمعہ ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ لوگوں نے حیرت و تعجب کے ساتھ ایک عجیب واقعہ دیکھا ایک شخص جو اپنی صورت و لباس سے مکہ کا باشندہ معلوم ہوتا تھا پہلی صف میں کھڑا ہو گیا ہے ایک چھوٹا سا بچہ اس کے بالمقابل ایک ستون سے پیٹھ لگائے اس کی طرف نگراں ہے اور بہ آواز بلند باہم سوال و جواب ہو رہے ہیں۔

اجنبی نے پکار کر پوچھا، میرے بیٹے قرآن کی نسبت تو کیا کہتا ہے۔

بچے نے جواب دیا، کلام اللہ، منزل، غیر مخلوق!

آہ یہ چند لفظ تھے جو ایک بچے کی زبان سے نکلے لیکن فی الحقیقت انہیں کے اندر دعوت حق اور امر بالمعروف کی ایک کائنات ایمان مخفی تھی۔ یہ وہ صدا تھی جس کے لیے اس وقت بغداد کا ایک ایک ذرہ پیاسا تھا کہ صرف ایک بار اس جملہ کو کہہ دینا ہی وہ جہاد اعظم تھا۔ جس کی فضیلت کے آگے ایک ہزار برس کی شب ہائے عبادت اور روز ہائے صیام بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتے تھے۔

اس لئے نہیں کہ خلق قرآن کا مسئلہ دعوت حق کی قوتوں کے خروج کرنے کا سب سے بڑا مصرف تھا اور اس لیے بھی نہیں کہ اس صدا کے ایک بار بلند ہو جانے سے وہ جیلخانے کھل جا سکتے تھے جن کے اندر علماء حق محبوس تھے اور وہ زنجیریں ٹوٹ جا سکتی تھیں جو امام احمد ابن حنبل اور محمد ابن نوح کے پاؤں میں پڑی تھیں بلکہ صرف اس لئے کہ جبر و استبداد غیر شرعی سے ایک کلمۂ حق کو کہنا جرم قرار دیا گیا تھا اور انسان کا ہاتھ بڑھا ہوا تھا کہ خدا کی کھولی ہوئی زبانوں کو بند کر دے۔ پس اس وقت زمین کے ہر بسنے والے پر جو خدا کو جانتا اور خدا کے رشتے کو اپنے دل میں رکھتا تھا۔ فرض ہو گیا تھا کہ اس انسانی جبر کو توڑے اور خدا کی وفاداری کے لیے انسانی اطاعت سے سرکش ہو جائے۔

اس وقت برسوں کے کاموں اور صدیوں کے ارادوں کی ضرورت نہ تھی بلکہ صرف ایک ہی مقدس لمحہ کی ضرورت تھی جس کے اندر صدائے حق کی ایک نڈر آواز بلند کر دینا ہی اس وقت اصلی کام تھا اگر شیخ عبدالعزیز کنانی اس کے بعد فوراً ہی قتل کر دیا جاتا۔ جب بھی اس کے کام کی عظمت کامل تھی۔

اس سوال و جواب کی ایک ہی صدا نے تمام مسجد کے اندر ایک تہلکہ مچا دیا لوگ حیرت

سے دم بخود ہو گئے اور حیران ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے ، بہت سے لوگ بھاگے ۔ اب کوئی بڑی ہی مصیبت آنے والی ہے لیکن شیخ عبدالعزیز بے خوف و ہراس اپنی جگہ پر کھڑے تھے اور ان کا لڑکا سامنے کے ستون سے ٹیک لگائے دوبارہ منتظر سوال تھا ۔۔۔ اتنے میں کوتوال شہر سپاہیوں کی ایک جماعت لے کر مسجد میں پہنچ گیا ۔ اور شیخ اور ان کے لڑکے کو گرفتار کر کے اپنے محکمہ کے رئیس اعلیٰ کے دفتر میں لے گیا جس کو آج کل کی اصطلاح میں پولیس کمشنر کہنا چاہیئے اس وقت بغداد کا پولیس کمشنر عمرو ابن مسعدہ تھا ۔ عمرو ابن مسعدہ نے کوتوال سے کہا کہ اسے پوری نگرانی و حفاظت کے ساتھ میرے مکان پر پہنچا دو ۔ شیخ جب پولیس کمشنر کے مکان میں داخل ہوئے تو کمشنر پولیس ان سے پہلے ہی مکان پر پہنچ گیا تھا ۔ اور صحن میں ایک آہنی کرسی پر بیٹھا تھا ۔ ایک نہایت ہی مکلّف و مطلّا "سواد" (پولیس کی سرکاری وردی) اس کے جسم پر تھی ۔ شیخ کو اپنے سامنے کھڑا کر کے اس نے تحقیق شروع کی ۔ دوسرے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے شیخ نے کہا کہ میں امیر المومنین کے حضور تک پہنچ کر ان کی موجودگی میں مدعیان خلق قرآن سے مناظرہ کرنے کی آرزو رکھتا ہوں ۔ یہ سن کر عمرو نے اس سلسلہ میں اپنا کامل اطمینان کر کے کہا اچھی بات ہے ، تم امیر المومنین کے دربار تک پہنچا دیئے جاؤ گے اس کے بعد اس نے اپنا گھوڑا طلب کیا اور کوتوال سے کہا میں آگے چلتا ہوں تم شیخ اور اس کے لڑکے کو لے کر پیچھے آؤ ۔

شہر کی تمام خلقت ان عجیب و غریب باپ بیٹوں کو حیرت اور افسوس کی نظروں سے دیکھ رہی تھی جنہوں نے موت کی تلاش میں بغداد کا سفر کیا تھا اور اب اس کے منہ میں بے خوف و خطر جا رہے تھے ۔

قصر شاہی بغداد کے شرقی حصے میں تھا یہ لوگ دجلہ کو عبور کر کے ایوان خلافت تک پہنچے اور عمرو ابن مسعدہ شیخ کو کوتوال کی حفاظت میں چھوڑ کر خود اندر گیا اور کچھ عرصے کے بعد واپس

آ کر کہا، میں نے تمہارا حال اور خیال امیر المومنین کی خدمت میں عرض کر دیا۔ امیر المومنین نے اسے منظور فرمایا۔ پیر کے دن مجلسِ مناظرہ منعقد ہو گی اگر پیر تک کسی شخص کو اپنی ضمانت میں پیش کرو تو تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔ شیخ نے مسافرت اور شاہی مجرم ہونے کا عذر پیش کیا۔ آخر عمرو نے کہا خیر ہم تم پر اعتماد کرتے ہیں۔ تم جاؤ اور اپنے معاملہ پر غور کرو اگر اب بھی تم اس جنون سے باز آ گئے تو امید ہے کہ امیر المومنین تمہاری پہلی جرأت کو معاف کر دیں گے۔

## مناظرہ کا دن

شیخ عبدالعزیز پیر کے دن قصرِ شاہی میں حاضر ہوئے تو کوتوال کو اپنا منتظر پایا وہ عمرو بن مسعدہ کے سامنے لے گیا۔ عمرو نے دیکھتے ہی کہا، امید ہے کہ اب تمہیں عقل آ گئی ہو گی اور تم اس جنون سے باز آ گئے ہو گے۔ جس کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ہے اگر اب بھی اس حماقت سے باز آ جاؤ تو معافی پا جاؤ گے اور میں امید کرتا ہوں کہ شاہی انعام و اکرام اور جاگیر و ریاست سے بھی تم مالامال کر دیئے جاؤ گے کیونکہ تمہارے اندر شجاعت کا جوہر موجود ہے۔ لیکن شیخ عبدالعزیز کے لیے یہ تمام باتیں بے سود تھیں۔ انہوں نے کہا حق مظلوم ہو رہا ہے۔ میں اسے پھر قائم کرنا چاہتا ہوں مجھے جب زندگی کی پرواہ نہیں تو مال و جاگیر کا کیا ذکر کرتے ہو۔

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ — کہ عنقا را بلند است آشیانہ

عمرو جوشِ تاسف سے کھڑا ہو گیا اور کہا افسوس تمہاری غربت پر اور صد افسوس تمہارے بچوں کی یتیمی اور تمہاری بیوہ کی بیوگی پر۔ میں تمہیں ہلاکت سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر تم ہلاکت کے عشق میں دیوانے ہو رہے ہو۔ مگر عمرو نے جب دیکھا کہ سمجھانا بیکار ہے؟

تو صحبت ختم کر دی اور مامون الرشید کو اس کے آنے اور آمادۂ مناظرہ ہونے کی اطلاع دی اور شیخ کو ایک ایسی جگہ بٹھا دیا جہاں سے وہ تمام آنے والے لوگوں کو دیکھ سکے۔ اور کہا کہ اجتماع کی تکمیل کے بعد تم حضرت شاہی میں طلب کئے جاؤ گے۔

مامون الرشید نے مناظرہ کی تیاری کے لئے غیر معمولی احکام جاری کر دیے تھے اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ ایک عجیب و غریب مناظرہ تھا۔ تمام امراء و رؤساء، علماء و فقہاء۔ ارکان و افسران فوجی و ملکی اپنے ساز و سامان جاہ و جلال کے ساتھ اس میں شریک ہونے کے لئے نکلے۔

عبدالعزیز کنانی نے ڈیوڑھی میں بیٹھے ہوئے دیکھا کہ انسانی سطوت و ہیبت کے بڑے بڑے مناظر یکے بعد دیگرے ان کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ سب سے پہلے امراء بنی ہاشم کا گروہ نمودار ہوا جن کے سیاہ عماموں کے طلائی شملے ہوا میں اڑ رہے تھے اور آفتاب کی روشنی میں ان کا سنہری رنگ اس طرح درخشاں تھا کہ نگاہیں زیادہ دیر تک نظارہ کی تاب نہیں لا سکتی تھیں ان کی عبائیں بھی سیاہ جن کو خلفائے عباسیہ نے اپنا قومی لباس قرار دیا تھا۔ اور عباؤں کی سیاہی کے اندر سنہری ساز و یراق اور طلائی قبضہ و میان شمشیر کی متحرک چمک اس طرح نظر آتی تھی گویا ابر آلود آسمان پہ بجلیوں کی مضطرب لہریں کوند رہی ہیں۔

اس کے بعد علماء و فضلاء دار الخلافت کا مقدس جلوس تھا جن کے لباس اور ساز و سامان میں اگرچہ سونے چاندی کے تکلفات نہ تھے اور ہر چیز سے سادگی اور بے تکلفی نمایاں تھی تاہم ان کا عظیم الشان گروہ۔ غلاموں کے حلقے خدام کا جاہ و حشم۔ مذہبی زندگی کا مقدس جاہ و جلال اور پرہیبت و وقار چہرے بجائے خود ایک ایسی عظمت

رکھتے تھے جو مصنوعی تکلفات و آرائش کے ساز و سامان سے بے نیاز تھی۔ اس جلوس میں سب سے پہلے بشر مریسی کی سواری تھی جو اس وقت فرقہ معتزلہ کا سب سے بڑا رئیس تھا۔ اس کے بعد دارالخلافت کا قاضی القضاۃ اپنے جاہ و حشم و ریاست کے ساتھ جلوہ آرا تھا پھر تمام قضاۃ و ارباب افتاء کی جماعت تھی۔ ان کے بعد متکلمین و فقہا اور ارباب درس و علم کا سلسلہ لیکن ان سب میں زیادہ نمایاں حصہ فرقہ معتزلہ کے علماء کا تھا اور جو علماء معتزلہ میں سے نہ تھے وہ بھی مسئلۂ خلقِ قرآن میں سرکاری حکم کے آگے سرِ اطاعت جھکا چکے تھے۔ اس نظارہ کی تقدیس کے بعد وزراء و ارکان سلطنت کا پُرعظمت نظارہ تھا۔ ان کے عمامے بھی سیاہ تھے مگر طلائی شملوں کی جگہ عماموں کے بالائی پیچ پر ایک مطلّا حاشیہ لگا تھا اور وہ اس احتیاط سے لپیٹا گیا تھا کہ عمامہ کا نصف زیریں قطر طراز شعاعیں کا ایک سنہری دائرہ بن گیا تھا۔ ان کے گھوڑوں کے ساز و یراق بھی مطلّا تھا۔ اور سنہری وردیوں سے ملبوس غلاموں کا شاندار حلقہ ہر سوار کے گرد و پیش جلوہ فروش عظمت و اجلال تھا —— اعیان حکومت کے بعد افسران فوج کی سب سے زیادہ مؤثر اور ہولناک ہیبت تھی جو اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ محلِ شاہی کی طرف آرہے تھے اور ان کی برہنہ تلواریں۔ روبہ آسمان نیزے اور طرح طرح کے اسلحہ جنگ ایک آہنی سمندر کی طرح متلاطم نظر آتے تھے۔

شیخ عبدالعزیز اس فوجی نظارۂ وحشت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں، مسلح فوج کی نمائش اس لئے کی گئی تاکہ میرے دل پر وحشت و ہیبت طاری ہو جائے نیز اس خیال سے کہ میں نے حکم سلطانی کو ٹھکرا کر اگر عام رعایا کے اندر کوئی مفسدانہ جوش پیدا کر دیا تو وہ بھی اس فوجی نمائش سے مرعوب ہو کر دب جائے۔ لیکن افسوس کہ وہ انسانی جاہ و جلال کے جلوے دکھا کر ایک ایسے شخص کی آنکھوں میں ڈر اور ہیبت پیدا کرنا چاہتے تھے جس کی

نگاہوں کے سامنے ربّ السمٰوٰت والارض کا لازوال جاہ و جلال موجود تھا۔

مبیں حقیر گدایانِ عشق را کیں قوم
شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کُلہ اند

اللہ اللہ ایک مسافر غریب الوطن اجنبی کی طرف ایک ہی صدائے حق نے مامون الرشید اعظم کی اس حکومت کو جو قیصرِ قسطنطنیہ کو "روم کا کتا" کہہ کر خطاب کرتی تھی اور کتے کی طرح عاجزی کی زمین پر لٹا دینے کی طاقت بھی رکھتی تھی کس طرح لرزا دیا تھا —— ایک تنہا مسافر جس کو بغداد میں آئے چوتھا دن تھا۔ ایک اجنبی محض جس کے جسم پر مسکینی کے لباس اور غربت کی فقر نمائی کے سوا اور کچھ نہ تھا مگر ہاں اس کے پاس ایک ایسی طاقت تھی جس کی فرمانروائی و ملوکی کے آگے مامون الرشید کی پوری سلطنت بھی ہیچ تھی اور جس کے جاہ و جلال کے آگے اس کی وہ سطوت و ہیبت بھی کچھ نہ تھی جس سے "شاہِ فرانس" بھی ڈرتا تھا۔

یہ طاقت نہ تو تختِ شہنشاہی کے اوپر پیدا ہوتی ہے اور نہ قیاصرہ کے قصروں میں اس کا گھر ہے ۔ وہ انسان کا ٹوٹا ہوا دل ہے ۔ اور اس کا محل ایمان باللہ کی زخمی روح !

## داخلہ

جب تمام ارکان و شرکائے مجلس مناظرہ آچکے تو شیخ عبد العزیز کی بھی طلبی ہوئی

ایک کے بعد ایک متعدد دہلیزیں تھیں جن سے شیخ کو گذرنا پڑا۔ سلطانی دہلیزوں کے مرحلے کے بعد ایوان ہائے خلافت کا ایک سلسلہ شروع ہوا جن میں سے ہر ایوان ایک پوری شہنشاہی کے ساز و سامان شوکت و ابہت سے معمور تھا اور ہر ایوان کے خاتمہ پہ اس کا پہلا رہنما رخصت ہو جاتا اور نیا ہاتھ اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا تھا اس کے بعد اور بھی بہت سے مرحلے آئے جن کی تمام جزئیات شیخ نے لکھی ہیں اور ان سے زیادہ خطیب بغدادی وغیرہ مورخین عہد عباسیہ کی روایتوں سے واضح ہوتی ہیں۔ غرض سرگذشت کا یہ تمام حصہ دولت عباسیہ کے جاہ و جلال سلطنت کے کارخانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اور ہم اس وقت مضطرب ہیں کہ مجلس مناظرہ تک جلد سے جلد پہنچیں اور انسانی حکومتوں کے جاہ و جلال کی جگہ ایک داعی حق کے جاہ و جلال خداوندی کا جلوہ دیکھیں۔

یہاں تک کہ "صاحب الستر" یعنی رئیس حجاب کا ایوان خاص آگیا! یعنی شاہی ملاقات و حضور کا متوسط وسیلہ اس کو "حاجب" بھی کہتے تھے۔ اور یہ قصر شاہی کا وہ آخری برزخ ہوتا تھا جس کے بعد "خلیفہ" کے حضور میں کوئی شخص پہنچ سکتا تھا۔

حاجب صحن دربار تک لے گیا۔ صحن کے دونوں جانب کمروں کا ایک سلسلہ تھا جس میں مخصوص وزراء و مدارا ذن حضور تک ٹھہرتے اور انتظار کرتے تھے یہاں پہنچ کہ شیخ سے حاجب نے پوچھا آپ کو وضو کی تجدید کی ضرورت ہے۔ شیخ نے کہا نہیں۔ حاجب نے کہا تو قبل اس کے کہ آپ امیر المومنین کے حضور میں پہنچیں دو رکعت نماز نفل پڑھ لیجئے۔ شیخ نے نماز پڑھی اور جب نماز پڑھی تو یہ کہا غیر ضروری ہے کہ کس عالم میں پڑھی اور اپنے اس خداوند قدوس کے حضور میں کیونکر کھڑے ہوئے جس کے کلمہ حق کے لیے عنقریب ایک انسانی شہنشاہی کے حضور میں جانے والے تھے۔

بجرم عشق توام می کشند غوغائیست      تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائے ست

اب پردہ اٹھا اور شیخ نے یکایک دیکھا کہ کرۂ ارض کے موجودہ عہد کا سب سے بڑا انسان شہنشاہ مامون اعظم اس کے سامنے ہے۔ یہ نگاہوں کو خیرہ کر دینے والا آفتاب نصف النہار تھا جو یکایک ابر کے نقاب سے باہر نکل آیا۔

تمام خدام و متعلقین دربار کو چونکہ شیخ کے متعلق معلوم تھا کہ یہ شاہی مجرم ہے اس لئے انہوں نے چاہا کہ مامون کے حضور میں جس قدر سختی اور بے احترامی اس کے ساتھ کر سکتے ہیں کریں - چنانچہ اس موقع کے متعلق شیخ خود لکھتے ہیں۔

"پردہ اٹھا اور خدام بارگاہ نے میرے بازوؤں کو پکڑ لیا وہ اس طرح مجھ پر ٹوٹ پڑے کہ ان کا ایک ہاتھ میرے سینے پر تھا اور ایک ہاتھ کاندھے پر۔ انہوں نے اسی طرح مجھے اندر لے جانا چاہا مگر اسی وقت مامون الرشید کی نگاہیں مجھ پر پڑیں اور میں نے اس کو یہ کہتے ہوئے سنا اسے چھوڑ دو۔ حکم شاہی پاتے ہی خدام و حجاب نے مجھے چھوڑ دیا۔ لیکن دربار شاہی کے اچانک نظارے نے میرے ہوش و حواس پر نہایت اثر ڈالا۔ اور قریب ہوا کہ شدت ہراس اور ہیبت نظارہ سے میری عقل متغیر ہو جائے۔

علمائے حق کے اس صدق بیان کو دیکھو کہ شیخ کس طرح صاف صاف خود اپنے قلم سے اپنی کمزوری کی سرگذشت لکھ رہے ہیں جبکہ وہ اس دربار میں پہنچے جس کے جلووں نے قیصر روم کے ایلچی کو اپنے عہد تنزل میں بھی مبہوت و لایعقل کر دیا تھا۔

المقتدر باللہ عباسی کے زمانے میں قیصر روم نے بعض معاملات کے انجام دینے کے لئے ایک سفیر بھیجا تھا جس سے خلیفہ موصوف نے "قصر حسنی" میں ملاقات کی تھی۔ اس ملاقات کی تفصیلی حالت خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں درج کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سفیر دہلیز پر قدم رکھتے ہی بالکل

مبہوت ہوگیا۔ سازو سامان سلطنت دیکھ کر اس کے ہوش و حواس بجا نہ رہے اس نے "حجاب" سے کہا کہ کچھ دیر کے لئے مجھے تنہا چھوڑ دیا جائے تاکہ اپنے حواس میں آجاؤں۔

اللہ اللہ انقلاب زمانہ کی نیرنگیاں! ایک زمانہ وہ تھا کہ روم کا سفیر ہمارے دربار میں آتا تھا اور ہماری عظمتوں کو دیکھ کر بے ہوش ہو جاتا تھا آج ہم خود غیروں کے سازو سامان دیکھ کر مرعوب ہو رہے ہیں

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

بہر حال شیخ کو حجاب کے جبر و قہر سے نجات ملی اور دربار کے دروازے سے چند قدم آگے بڑھے وہ لکھتے ہیں کہ مامون الرشید کی آواز برابر میرے کانوں میں آرہی تھی ادخلوہ قربوہ چنانچہ وہ بلاتامل آگے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ "خلیفہ" کو اپنے سامنے دیکھا اور بغیر کسی عجز و اغماض کے بہ آواز بلند کہا السلام علیک۔ یا امیر المومنین مامون نے جواب دیا وعلیکم السلام ورحمتہ وبرکاتہ۔

صاحب الستر برابر بتدریج ان کو آگے بڑھاتا جاتا تھا یہاں تک کہ ان کی جگہ آگئی اور یہ اپنا مقام پا کر بیٹھ گئے۔ اب تک ان کے دل میں ہیبت و رعب کے اثرات باقی تھے۔

مامون صدر ایوان میں تخت کے بجائے فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہارون رشید سے لے کر معتضد باللہ تک خلفاء عباسیہ کا یہ قاعدہ رہا ہے کہ علمی مجالس میں ہمیشہ مثل اور شرکاءِ مجلس کے وہ بھی فرش پر بیٹھتے تھے۔ ڈاکٹر جی سیلمان نے ابوبکر خطیب بغدادی کی تاریخ "مدینۃ الاسلام" کا جو ٹکڑا ایڈٹ کر کے چھاپا ہے اس میں خاص عنوان خلفائے عباسیہ کی مجالس علمیہ کے متعلق بھی تھے اس میں تشریح کر دی ہے کہ یہ خلفاء جب "بیت الحکما" میں آتے تھے تو عام علماء و حکما کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ بلکہ مامون تو بسا اوقات اپنے معتمد علماء کو صدر میں جگہ دے دیتا تھا۔

## صاعقۂ حق کی پہلی گرج

شیخ جونہی اپنی جگہ پر بیٹھے ایک طرف سے صدا آئی قبح اللہ وجھک خدا کی قسم میں نے

اپنی پوری عمر میں اس قدر بدصورت آدمی نہیں دیکھا. شیخ لکھتے ہیں اب تک میرے دل میں ہیبت وسہراس کا اثر باقی تھا. میں نے اس آواز کو سنا مگر خاموش رہا. حتیٰ کہ کہنے والے کی طرف میں نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا.

اتنے میں مامون الرشید شیخ کی طرف متوجہ ہوا اور شیخ کا نام. خاندان. ابوبیت. جدیت. قبیلہ محلہ - وطن. مکہ معظمہ میں بنو ہاشم کے حالات اور اس قسم کی اور بہت سی باتیں دریافت کی اس کے بعد کہا "تمہارا بغداد میں آنا اور جامع رصافہ میں کھڑے ہو کر میرے ایک حکم دینی دستری کو توڑنا اور خدا کی صفات میں دوسری چیزوں کو شریک کرنا"

شیخ لکھتے ہیں مجھ پر دربار کی ہیبت کا اثر اب تک باقی تھا مگر مامون الرشید کا یہ جملہ میرے لئے رحمتِ الٰہی ہو گیا. مسئلہ خلقِ قرآن کی نسبت جب یہ قول باطل میں نے سنا تو مقادل کے اندر ایک آگ بھڑک اٹھی دعوتِ حق کی غیرت سے میں معمور ہو گیا.

مامون کے جملے ابھی پورے ختم بھی نہیں ہوئے تھے کہ شیخ کی آواز بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک کی طرح ایوانِ دربار میں گونج اٹھی اور جس طرح ایک معمولی اور حقیر انسان سے کوئی خطاب کرتا ہے کڑکتی ہوئی آواز میں تقریر شروع کی.

یا امیر المومنین، میں ایک فقیر الحال طالب علم ہوں اپنے وطن اور خانۂ خدا کے مقدس جوار میں تھا کہ میں نے خلیفۂ وقت کے مظالم و جبر کی دردانگیز سرگذشت سنی. مجھے معلوم ہوا کہ حق مظلوم ہو گیا ہے سنت کی روشنی بجھ گئی ہے حق کا کہنا جرم ہو گیا ہے. اور باطل پرستی کے صلے میں جاہ و عزت کی بخشش ہو رہی ہے. جس چیز کا اقرار خدا تعالیٰ نے امتِ مرحومہ سے نہیں کرایا جس کی گواہی اس کے رسول نے نہیں دی. جس کا اعلان خلفائے راشدین نے نہیں کیا. اس چیز کے اقرار کو آج ایک انسان ہر مومن کیلئے شرط قرار دے رہا ہے وہ انسان جو ہارون رشید کے گھر میں پیدا ہوا اور وہ مہدی کا لڑکا تھا. اس نے نہ تو

تابعین کو پایہ نہ اصحاب رسول اللہ کو دیکھا نہ عہدِ نبوت کی برکتوں میں اس کا کوئی حصہ ہے تاہم وہ شریعتِ الٰہی کے اس مخفی راز کو جانتا ہے۔ شیخ نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ شیخ عبدالعزیز اب وہ عبدالعزیز نہ تھا جسکو عمر ابن مسعدہ نے کوتوالی میں کھڑا کیا تھا اور جو دربارِ مامونی کے دروازے میں قدم رکھتے ہی اسکی ہیبت و جلال سے لرز اٹھا تھا اب وہ ایک دوسری ہی روحِ حق تھی جو دنیا کی تمام جسمانی طاقتوں اور عظمتوں سے ارفع و اعلیٰ ہو کر صرف ربّ السمٰوٰتِ والارض کی قدوسیت سے فیضیابِ جلال و قہاریت تھی۔

آہ تم ہوا کا وہ جھونکا ہو جس سے شریعت کی آگ تو نہ روشن ہو سکی مگر اس نے سنت کے چراغوں کو گُل کر دیا۔ تم سیلابِ خلافت کی وہ رَو ہو جو بدعات و محدثات کی خس و خاشاک کو تو نہ بہا سکی مگر اس نے حق پرستی کے تناور درختوں کو گرا دیا تم عمارت و دیانت کی وہ تلوار ہو جو بطلان و حق کوشی کی فوجوں کو تو نہ قتل کر سکی پر اس نے اربابِ حق کے سروں کو اپنی برش و روانی کا تختۂ مشق بنایا۔ ابتک تمہارا منصب رسول کی جانشینی کا رہا تھا مگر اے مامون ابن ہارون اب رسول کی جانشینی ہی کا نہیں بلکہ حقِ رسالت کا مدعی ہو گیا ہے خدا کے رسول نے ذمیوں کو امان دی مگر تیری خلافت میں مسلمانوں کے لئے امان نہیں ہے اے مامون اللہ سے ڈر اس کے عذاب کی پکڑ سے کانپ جس میں بہت ڈھیل ہے مگر جس سے کبھی چھٹکارا نہیں۔ تم سے پہلے دمشق کے آئمہ جور نے مسلمانوں کا خون مباح کیا مگر تمہارے ہاتھوں ان کا خون بھی مباح کیا گیا تم ان کے تخت کے وارث ہوئے ہو مگر ان کے جور و طغیان کی وراثت نہ لو۔

جوں جوں وقت گذرتا جاتا تھا شیخ کا جوش و خروش بڑھتا جاتا تھا۔ سارے دربار پر ایک بیخودانہ ہیبت طاری تھی۔ گو بغداد کے تخت پر مامون کی جگہ انکو بٹھا دیا گیا تھا اور ایوان دربار کے اندر اور باہر جو کچھ تھا وہ مامون اعظم کے لئے نہیں بلکہ عبدالعزیز ابن یحییٰ الکنانی کے لئے تھا۔

تقریر کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا۔

اے امیرالمومنین، گمراہوں اور بدعتیوں کا یہ تمام گروہ جو تیرے گرد جمع ہو گئے اور تجھ کو [illegible]

صراط مستقیم سے بھٹکا رہا ہے۔ کیا تیری نظر میں انکی دلیلوں کی اس سے زیادہ وقعت ہے جو رسول اللہ اور اس کے اصحاب کو خدا نے دی ہے اگر توحید اور عدل یہی ہے اور خدا کی تمام صفتوں سے انکار کئے بغیر کوئی مومن مومن نہیں ہو سکتا تو کیا وہ سب کے سب مومن نہ تھے ـــــ اس کے بعد انہوں نے جہم ابن صفوان کا ذکر کیا جس نے سب سے پہلے خلق قرآن اور نفی صفات کی بدعت ایجاد کی اور اپنے اساتذہ کے سلسلہ روایت سے بیان کیا کہ بعض بقیہ صحابہ نے کس طرح اس قول پر اظہار خشم کیا اور اس کو ایک بہت بڑا فتنہ قرار دیکر مسلمانوں کو اجتناب و احتراز کی وصیت کی۔ پھر کہا صرف امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض جس نے مجھے یہاں تک پہنچایا اور الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ جو حق کا رفیق اور خدام حق کا ولی ہے مجھے تیری مجلس میں پہنچنے اور فرض حق ادا کرنیکی توفیق دی۔ میں نے جو کچھ کہا اگر حق ہے تو اس کی تصدیق کر ورنہ بطلان پر کتاب و سنت سے دلیل لا۔ یہ حضرت ابراہیم ؑ کی سنت ہے اور انکا طریق ہے کہ انہوں نے حجت بحث کی اور منکرین سے حجت طلب کی اور اے امیر المومنین ایک سنت ان لوگوں کی بھی جنہوں نے راہ حجت و برہان میں اپنے کو ناکام پاکر جور و قہر کے دامن میں پناہ لی تھی اور کہا تھا کہ ابراہیم ؑ کو آگ میں جلا دو پس تو سنت ابراہیمی پر عمل کریگا یا سنت نمرودی کا اتباع کریگا؟ پیروان ابراہیمی اس کیلئے بھی تیار ہیں ورنہ تو دیکھ رہا ہے کہ میں یہاں موجود ہوں۔

اے امیر المومنین میری کمزوری اور بدصورتی پر نہ جا اور حق کو بے جمال پائے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جمال جسم عطا فرمایا تھا لیکن بادشاہ مصر نے جب انکو قید خانے سے نکالا ہے تو انہوں نے کہا اے بادشاہ اپنی سلطنت میرے سپرد کر دے میں حفاظت کرنے والا اور صاحب علم ہوں یہ نہیں کہا کہ مجھے سلطنت دیدے کیونکہ میں حسین و جمیل ہوں۔

شیخ لکھتے ہیں، میں جب تک تقریر کرتا رہا مامون اسطرح ٹکٹکی لگائے میری جانب نگران تھا گویا پتھر ہے جس میں نہ تو ارادہ ہے اور نہ روح۔ اثناء تقریر میں کئی بار میں نے دیکھا کہ اسکی آنکھیں تر ہو گئی تھیں اور قریب تھا کہ ان سے آنسو بہہ نکلیں تمام اہل دربار متحیر تھے اور جبکہ وہ مامون سے حکم قتال کے منتظر تھے تو

تو انہوں نے دیکھا کہ شدتِ تاثر و محویت سے وہ خود ہی بے حال ہو رہا ہے۔

شیخ جب تقریر ختم کر چکے تو مامون کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر کہا۔

**مامون کی تقریر** ۔ اے عبدالعزیز! اللہ تجھ پر رحم کرے تو نے جو کچھ کہا میں نے سنا اور جن جن چیزوں کو تو نے میری طرف نسبت دی ان کے لئے میں نے اپنے نفس کا احتساب کیا الحمدللہ کہ میں ان سے بری ہوں میں بندگانِ خدا پر ظلم نہیں کرنا چاہتا بلکہ ان کو حق اور توحید کی طرف بلاتا ہوں جس کو دلیل و برہان اور کتاب اللہ نے مجھ پر ظاہر کیا ہے بہ ایں ہمہ یقین کر کہ میرا حلم میرے غضب پر غالب آئیگا اور خدا کی قسم میں تیری سختی اور درشتی کا انتقام تجھ سے نہ لونگا۔ بلکہ تیری دلیلوں کو سنونگا اور تیرے براہین کو وزن کرونگا مجھ پر ظاہر ہو گیا ہے کہ تو حق کی غیرت رکھتا ہے اور اسکے لئے بیباک ہے تیری حمیت حق اسکی مستحق ہے کہ تیری عزت کی جائے اور تیری کوئی سختی مجھکو اس اعتراف سے نہیں روک سکتی۔ میرا تیرا معاملہ اب صرف حق و باطل کا ہے اگر تیرے پاس حجت ابراہیمی ہے تو پیش کر۔ حجت ابراہیمی یہ تھی کہ جب منکر خدا نے اس سے جھگڑا کیا تو انہوں نے کہا اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے اگر تجھ کو اس سے انکار ہے تو مغرب سے نکال دیکھ۔ یہ حجت ایسی تھی جس کو عقل نے پہچانا اور مشاہدہ و حس نے اس پر گواہی دی۔

مامون کے آخری الفاظ یہ تھے —— میں نے تیرے مخالفین کو جمع کیا تاکہ تو ان سے میرے سامنے مناظرہ کرے اور میں بمنزلہ ایک حاکم کے تم دونوں فریق کے لئے ہوں پس مناظرہ کر اگر تیری حجت تیرے مخالفین پر واضح ہوگئی اور حق تیرے ساتھ ثابت ہوا تو ہم تیری پیروی کریں گے اور اگر تو حجت نہ لا سکا اور حق نے تیرے مخالفین کا ساتھ دیا تو پھر تیرے لئے سزا ہے۔

**آغاز مناظرہ** مامون نے بشر مریسی رئیس معتزلہ عہد کو حکم دیا کہ مناظرہ شروع کرو بشر اپنی جگہ سے اٹھ کر مامون کی نشست کے قریب آیا اس کی تمام جماعت اس کے ساتھ تھی —— مامون نے خود ہی فیصلہ کر دیا تھا کہ دلیل بشر پیش کرے گا اور شیخ جواب دیگا۔

خارج از موضوع کوئی بات نہیں کی جائے گی۔ دلائل کا تمام دار و مدار صرف قرآن کی اندرونی شہادت پہ ہوگا۔ مامون نے دونوں فریق کو مخاطب کر کے اس بارے میں جو تقریر کی وہ نہایت وقیع ہے۔ اور گویا آداب مناظرہ پہ ایک بہترین درس ہے۔

اب مناظرہ شروع ہوا بشر یکے بعد دیگرے قرآن کریم کی آیات پیش کرتا اور شیخ اس کا جواب دیتے پھر ردِ جواب الجواب کا سلسلہ جاری ہوتا۔ اسی سلسلے میں حروف و اصوات کی بحث نکل آئی۔ جہم ابن صفوان نے اگرچہ نفی صفات کی بنا پر خلق قرآن کا دعویٰ کیا تھا لیکن بشر مریسی کا اعتقاد اشاعرہ کے اعتقاد سے اقرب تھا وہ زیادہ تر حروف و اصوات عربیہ کے حدوث و خلق کو قطعی قرار دیتا اور "کلام اللہ" اور "قرآن عربی" میں تفریق کر کے اس قرآن کے خلق و حدوث کو قطعی قرار دیتا جو عربی زبان میں ہم پڑھتے اور لکھتے ہیں۔ لیکن شیخ عبدالعزیز نے ثابت کیا کہ جو قرآن اتارا گیا وہ عربی میں تھا پس وہ چیز جو عربی زبان میں اترا تھا اگر عربی تھی تو عربی کے حروف و اصوات ہی میں تھی۔ اور وہی "کلام اللہ" ہے پس کلام اللہ عربی میں اترا اسی کو رسول نے تلاوت کیا اور وہی ہماری زبانوں سے بھی نکلتا ہے۔ مسئلہ بحث بڑھتا جاتا تھا اور مامون کا یہ حال تھا کہ کبھی شیخ کے حسن جواب کی داد دیتا اور کبھی بشر کے استدلال و استشہاد سے خوش ہوتا کہ یکایک بشر نے کہا میں اپنے اور تمام دلائل و براہین کو خود ہی چھوڑ دیتا ہوں اب صرف ایک سوال کرتا ہوں اس کا جواب دو۔ تمام بحث کا ابھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اور حق کے اعتراف کے بغیر تم کوئی راہ نجات اپنے سامنے نہ پاؤ گے یہ کہہ کر اس نے سوال کیا، قرآن نے صدہا مقام پر اللہ کو "خالق کل شئی" کہا ہے یا نہیں شیخ نے کہا ہاں اللہ ہی ہر شئے کا خالق ہے۔ بشر نے کہا قرآن بھی "شئی" ہے یا نہیں، شیخ نے کہا پہلے شئی کی حقیقت سنو پھر جواب لو بشر زیادہ تیز ہو کر بولا میں اور کچھ سننا نہیں چاہتا میرے سوال کا جواب دو۔ شیخ نے پھر کہا تمہارا طرز سوال غلط ہے اس کے جواب دینے کو تو میں تیار ہوں۔ تم صبر و ضبط سے پہلے میری تقریر سنو۔ بشر نے کہا تقریر یہاں

بہت ہو چکیں امیر المومنین کو نتیجہ مناظرہ کا انتظار ہے، شیخ نے پھر جواب سے اعراض کیا اس پر بشر نے مامون سے کہا یا امیر المومنین حاکم کا فرض عدل و انصاف ہے آپ حاکم ہیں اگر عبدالعزیز حجت رکھتا ہے تو سوال کا جواب کیوں نہیں دیتا ــــ

اس حالت میں محمد بن جہم معتزلی پکار اٹھا "ظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كَارِهُوْنَ" بشر کے گروہ میں سے ایک اور شخص اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور چیخ کر کہا یا امیر المومنین جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ۔ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔ شیخ عبدالعزیز لکھتے ہیں کہ خود بشر بھی اب اپنا جوش و تعصب نہ روک سکا اور بار بار کہنے لگا۔ "بالآخر شیخ کا گدھا پُن دیکھ کر بیٹھ گیا"۔

شیخ لکھتے ہیں کہ فی الحقیقت اس وقت میں کش مکش میں مبتلا ہو گیا تھا اور صاف نظر آرہا تھا کہ قرآن کے "شئے" ماننے کے ساتھ ہی یہ سب شور مچا دیں گے کہ قرآن کا مخلوق ہونا ثابت ہو گیا لیکن اللہ نے میری مدد کی اور یکایک کامیابی کی راہ دکھلادی۔

شیخ نے کہا اچھا میں تسلیم کرتا ہوں کہ قرآن بھی اشیاء میں داخل ہے۔ یہ اقرار سنتے ہی بشر اچھل پڑا اور بشر اور مامون الرشید ایک ساتھ بول اٹھے اگر قرآن بھی اشیاء میں داخل ہے تو قرآن کہتا ہے کہ اللہ تمام اشیاء کا خالق ہے پس قرآن کو تم نے "مخلوق" تسلیم کر لیا۔

شیخ نے گرج کر کہا ہرگز نہیں، قرآن کہتا ہے "اللہ تم کو اپنے "نفس" سے ڈراتا ہے" تو کیا اللہ کا نفس ہے اور پھر قرآن کہتا ہے کہ "كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" پس اگر قرآن اشیاء میں داخل ہو کر مخلوق ہو جاتا ہے تو کیا خدا بھی "کل نفس" میں داخل ہو کر (نعوذ باللہ) موت کا مزہ چکھے گا!!

شیخ عبدالعزیز کا یہ کہنا تھا کہ تمام مجلس پر سناٹا چھا گیا اور ایسا معلوم ہوا گویا یہ الفاظ نہیں تھے ایک بجلی تھی جو یکایک کوند گئی۔ خود بشر مریسی مبہوت ہو کر دیکھنے کا دیکھتا رہ

گیا۔ خود مامون بے اختیار عبدالعزیز کے جواب پر وجد کرنے لگا اور پکار پکار کر کہنے لگا۔

معاذ اللہ معاذ اللہ۔ خدا کی ذات موت سے بری ہے۔

# خاتمہ

بشر مریسی نے اپنے آخری سوال کو مناظرہ کا خاتمہ قرار دیا تھا شیخ نے اس کا جواب دے دیا وہ جواب جو مناظرہ کا خاتمہ اور حجت کا آخری اعلان تھا۔

مامون الرشید نے حکم دیا کہ مناظرہ ختم کیا جائے اور عبدالعزیز سے مخاطب ہو کر کہا۔

اگرچہ اس مسئلہ کا فیصلہ ہماری آج کی صحبت میں نہ ہو سکا لیکن اس میں شک نہیں کہ تو نے اپنے مخاطب کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا اور اس کی دلیل کے آگے میں نے تجھے عاجز نہیں پایا۔ تیری فضیلتِ علمی پر تیرے جوابات گواہ ہیں اور تو نے جس طرح خوف سے بے پرواہ ہو کر تقریر کی واللہ میں اس کی قدر کروں گا اور تیری تلخ گوئی کو اپنی قدر دانیوں اور حلم سے ٹھکا دوں گا میری طرف سے تیرے لئے امن و اعزاز و اکرام کا فرمان ہے۔ اور تیرا جوہر استعداد اس کا مستحق ہے کہ تو میری مجلسِ علمی کا ندیم ہو ۔۔۔ پھر تلوار کی نیام پر ہاتھ رکھا جو مجلس کی برخاستگی کا اشارہ تھا تمام اہلِ دربار اٹھ کھڑے ہوئے میں جب رخصت ہونے لگا تو مامون مسکرایا اور کہا آج تو نے اپنے بڑے ہی طاقتور حریف پر فتح پائی ۔۔۔

اس کے بعد مامون الرشید نے حکم دیا کہ دس ہزار درہم قیامگاہ پر بھیج دیا جائے نیز قیام کے لئے ایک سجا سجایا محل سرکاری بھی قیام کے لئے مرحمت ہوا۔

اس کے بعد لکھتے ہیں جب میں دربار سے نکلا تو تمام لوگوں کو راستوں دوکانوں اور کوٹھوں پر چشم براہ پایا۔ لوگوں نے جب دیکھا کہ میں نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ واپس جا رہا ہوں تو ان کی

حیرت اور خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ لوگ ہر طرف سے مبارک باد دینے اور ارباب حق کی فتح پر خوشیاں منانے کے لئے ہجوم کرتے اور مجھ سے مصافحہ کرنے کے لئے اپنی جانوں کو تھلکہ میں ڈالتے۔

اس کے بعد جب علما، شہر و امصار کو واقعاتِ مناظرہ کی خبر ملی تو اس ایک نمونے نے ہزاروں زبانوں کو یکایک کھول دیا۔

صبح سے شام تک میرا مکان لوگوں سے بھرا رہتا۔ مجلسِ مناظرہ کے حالات روایت کرتے کرتے میں تھک گیا یہاں تک کہ خبر دور دور پھیل گئی۔ اور حجاز و شام تک سے لوگ دریافت کرنے کے لئے آنے لگے تب جا کر میں نے چاہا کہ اس مناظرے کے واقعات قلمبند کر دوں۔ تاکہ ہر شخص اس کو پڑھ کر حق کی فتح اور باطل کے خذلان کی سرگذشت معلوم کرے۔

افسوس کہ ہم اس مناظرے کو نقل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ بہت طول طویل ہے۔ اور ہماری موجودہ صحبت کا موضوع مسئلہ خلقِ قرآن نہیں بلکہ علمار سلف کے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ایک نظارہ دکھلانا ہے۔

---

# ارشاد الملوک

۳؍ اگست ۱۹۱۳ء کو کانپور میں ایک مسجد کا کچھ حصّہ یہ کہہ کر شہید کیا گیا کہ یہ مسجد میں شامل نہیں ہے مسلمان اسے مسجد میں داخل شمار کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مزاحمت کی۔ جس میں کئی مسلمان شہید ہوئے۔ اس پر ۶؍ اگست ۱۹۱۳ء کو سر جیمس مسٹن نے اس حادثہ پر آگرہ سے ایک بیان جاری کیا جس میں علمائے وقت کو اس حادثہ کا ذمہ وار ٹھہرایا گیا تھا۔ کہ ان کے اکسانے سے ایسا ہوا ہے۔ ورنہ مسلمان بذاتِ خود متنازعہ حصّہ کو مسجد نہ سمجھتے تھے۔ مولانا نے اس کے جواب میں انگریزوں اور ان کی حکومت کو بے نقاب کیا ہے۔

ہز آنر جیمس مسٹن بالقابہ نے حادثۂ خونین کانپور کے بعد ۶؍ اگست ۱۳ء کو آگرہ میں جو خطبۂ ہمایونی دیا تھا وہ اچھی طرح شائع ہو چکا ہے۔ اور موافق و مخالف بحثیں بھی ہو چکی ہیں تاہم ہمیں جو کچھ عرض کرنا تھا وہ اب تک باقی ہے۔

سب سے پہلے تو ہم اپنے تئیں مبارکباد دیتے ہیں کہ ہز آنر کی زبانِ مبارک بھی "خدا" کے لفظ سے ناآشنا نہیں۔ ستم زدگانِ کانپور کا ذکر کرتے ہوئے آخر خدا انہیں یاد آہی گیا کاش

ہز آنر فارسی کے ذوق آشنا ہوتے تو ہم غالب مرحوم کا یہ شعر سناتے ؎

روانِ خدائے تو نامم کہ بردۂ ناصح | نہ ہے لطافتِ ذوقے کہ درمیان تو نیست

ہز آنر نے لینے کو تو خدا کا نام لے دیا لیکن کاش انہیں معلوم ہوتا کہ ان کے مخاطب مسیحی نہیں بلکہ مسلمان ہیں اور ان کے لئے یہ لفظ اتنا سہل و آسان نہیں جتنا خود ان کے لئے ہے ــــ وہ ایک "مصلوب جسد" کے پوجنے والے نہیں ہیں جو اپنے بے رحم خدا کو پکارتے پکارتے بالآخر دنیا سے چل دیا۔ اور اب اسکے خون کے سوا جسکے کفارے میں اسکے تمام پجاریوں کے گناہ معاف ہو گئے ہیں اور اسکے اندر کچھ باقی نہیں رہا ہے بلکہ وہ ایک حیّ و قیوم اور قاہر و منتقم خدا کے پرستار ہیں جو ان کی دعاؤں کو سنتا۔ ان کی اعانت و نصرت فرماتا۔ حق و عدل کو کامیاب اور ظلم و جبر کی پاداش کے لئے ایک عدالت رکھتا ہے۔ انکو خدا تک پہنچانے کے لئے انکے خدا نے یہودیوں کے ہاتھوں اپنا خون نہیں بہایا ہے۔ بلکہ جب یہودیوں کی طرح خود ان کا کسی دستِ ظلم سے خون بہایا جاتا ہے تو پھر وہ اپنے خدا تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ ہز آنر کی طرح صرف مسیح ہی کو زندہ نہیں بلکہ ہر اس مظلوم و مقتولِ جور و ستم کو بھی زندہ سمجھتے ہیں۔ جس کا خون جرمِ بے جرمی میں بہایا گیا ہو۔

بہتر تھا کہ ہز آنر صرف انسان ہی کا ذکر کرتے جس کی قسمت کی باگ انکے ہاتھ میں دیدی گئی ہے۔ اور خدا کا نام نہ لیتے جو ان کی قسمت کا بھی مالک ہے۔ معلوم نہیں ہز آنر بحیثیت بیسویں صدی کے ایک متمدن فرزند یورپ ہونے کے مذہب و خدا پرستی کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں۔ یورپ ایک طرف تو مادہ کے آگے سر جھکاتا ہے دوسری طرف مسیح کی پرستش کے بھی انکاری نہیں۔ پہلی صورت میں تو یہ تذکرہ ان کے لئے بالکل ہی غیر ضروری تھا یورپ اب بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ اور خدا کا خوف زمانۂ وحشت کے توہمات تھے۔ جن سے بیسویں صدی کے عصر تمدن کے ایک تعلیم یافتہ دماغ کو کوئی ہراس نہ ہونا چاہیئے ــ دوسری صورت میں بھی ایک مصلوب جسم کے پرستار کے لئے بہت مشکل ہے۔ کہ وہ ان

لوگوں کو خوفِ الٰہی کا وعظ سنا سکے۔ جو ایک زندہ خدا کی پرستش کرتے ہیں۔

ہم ہز آنر کی مطلق العنان فرمانروائی پر اس دورِ قانون میں صبر کر سکتے ہیں۔ انکو اپنے ایک وعظ اور ملا کی حیثیت بھی دے سکتے ہیں۔ اگر علیگڈھ کالج میں انکی ضرورت پیش آئے انکو اپنا مفتی و فقیہہ اور شیخ الاسلام بھی مان لینگے۔ جیسا کہ وہ کانپور کے متعلق فتوےٰ دے رہے ہیں یہ سب کچھ مان لینے کیلئے تیار ہیں مگر خدارا خوفِ الٰہی کے وعظ سے تو ہمیں وہ معاف ہی رکھیں انکی زبان سے سب کچھ سننا پڑتا ہے اور سنتے ہیں مگر "خدا" کا نام سن کر بے اختیار ہو جاتے ہیں۔ آہ یہی تو وہ نام مقدس ہے جسکی شہادتِ توحید کی صدا سے کانپور کی مسجد کی ہر دیوار اور ہر اینٹ مقدس کی گئی تھی اور اسی نام کی عزت تھی۔ جس کے لئے بالآخر فرزندانِ الٰہی کو اپنا خون دینا پڑا۔

از ملیکے ایک مباد ایں ہمہ بیداد          در حوصلۂ حلم خداوند نہ گنجد

ہز آنر سے کیا کہیں کہ وہ اس لذت سے آشنا ہی نہیں ایک مسیحی قلب اس "مذہبی" جنون کی حقیقت کیا سمجھے گا جو ہمارے جسم کے ایک ایک قطرۂ خون کے اندر بھرا ہوا ہے۔ انہوں نے خدا کا نام تو سیکھ رکھا ہے لیکن ابھی اس کے کاموں سے بے خبر ہی رہے۔ "خدا" کا تصور کوئی ڈرنے کی چیز ہوتی تو ۳ اگست کا قطرۂ خونیں حکمرانانِ عہد کے تاجِ غرور میں نہ ہوتا ۔۔۔۔ اس کے بعد ہم کو اس "جماعت" کے متعلق بھی غور کرنا ہے جس کی سنجیدہ ذمہ داری" نے ہز آنر کو اس درجہ متاثر کیا۔ اور جو ان کی روایت کے مطابق اس حادثۂ فاجعہ کی اصل محرک ہے۔ ۔۔۔ یہ لوگ عجیب و غریب ہیں انکی طاقتیں حیرت انگیز اور انکے کام پُراسرار ہیں وہ اگرچہ کانپور سے باہر ہیں لیکن ایسی مخفی طاقتیں رکھتے ہیں کہ ایک اشارے کے ساتھ ہی سارے شہر کو جان دیدینے پر آمادہ کر دیتے ہیں۔ ان کی حکومت کروڑوں انسانوں کے دلوں پر قائم ہے۔ مسجد کے "وضو خانے" کے متعلق کانپور کے مسلمانوں کو کوئی اعتراض نہ تھا لیکن اس پُراسرار جماعت نے دو ہفتہ کے اندر ہندوستان کی تمام اسلامی آبادی کو معترض بنا دیا اور جس

چیز کو کل تک لوگ سر جیمس مسٹن کی نظر سے دیکھنے لگے ــــــ ہم نہایت ممنون ہیں ہز آنر کے کہ انہوں نے سب سے پہلے ہمارے سامنے کسی ایسی سحر کار اور حکمران طلوب ارواح جماعت کی مخبری کی جو کروڑوں مسلمانوں کے دلوں پر حکومت رکھتی ہے اور اسلامی آبادی اس کے اشارہ سے پر جان دینے پہ آمادہ ہو جاتی ہیں۔ فی الحقیقت اگر کوئی ایسی جماعت موجود ہے تو جہاں تک بھلا ممکن ہو ہمیں اسکی جستجو میں نکلنا چاہیئے جن لوگوں کو خدا نے ایسی عجیب و غریب طاقتیں دی ہوں ان کے دیکھنے کا کون مشتاق نہ ہو گا۔ سر جیمس مسٹن نے جہاں ضمناً مخبری کا فرض انجام دیا ہے وہاں اگر از راہ رعایا پروری ہمیں ان تک پہنچا بھی دیں تو یہ احسان عظیم ہو گا ؎

ڈھونڈ لاتے تمہیں اس بت کو خدا را اے شیخ　　　تم خدا ترس تھے اک کام ہمارا کرتے

مسلمان ہمیشہ سے رو رہے ہیں کہ ان میں باہم اتفاق نہیں۔ کوئی متفق علیہ لیڈر نہیں۔ کسی قسم کا آرگنائزیشن نہیں۔ انکی حالت ایک بے سری فوج کی سی ہو رہی ہے۔ جس کا مسٹر "ٹائلر" جیسا کوئی سپہ سالار نہ ہو۔

لیکن جیمس مسٹن کی روایت اگر بغیر جرح تسلیم کر لی جائے تو اس صورت میں ہمیں اپنی سالہا سال کی مایوسیوں میں ایک قلم تبدیلی کر دینی پڑے گی۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک جماعت کسی "محفوظ" مقام پر (جو ہز آنر کے دماغ مبارک کے محفوظ حجرۂ تخیل کے علاوہ یقیناً کوئی دوسری جگہ ہے) موجود ہے جسکو یہ قوت حاصل ہے کہ کانپور میں جوش نہ تھا۔ اس نے جوش پیدا کر دیا یہاں کے لوگ ساکت و صامت تھے۔ انہوں نے ان کو زبان دراز و فغان سنج بنا دیا وہ اپنی مسجد کے مطلوبہ حصہ کو مسجد نہ سمجھتے تھے مگر انکے حکم سے مسجد یقین کر کے جان دینے پہ آمادہ ہو گئے۔ پھر اتنا ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے دل اسطرح انکی مٹھی میں ہیں کہ بیک اشارہ ساحرانہ و طلسمانہ سب کے سب انہیں کی سی کہنے لگے اور مسجد مسجد کا ہر طرف شور مچ گیا۔

سبحان اللہ اگر تمام مسلمانوں پر ایسی طاقت رکھنے والے موجود ہیں تو ہمیں اپنی پراگندگی اور نا اتفاقی پہ افسوس کرنے کی جگہ یقیناً ہز آنر کی رہنمائی میں ان کو تلاش کرنا چاہیئے۔

ہز آنر بوجہ اپنی رعایا نوازو رحیم و شفیق طبیعت کے اس جماعت سے خوش نہیں کہ اس کے

احکام کی بدولت سپہ سالار پولیس کو بحکم فرمانروائے کانپور چھ سو پچاس کارتوس صرف کرنا پڑے اور اسطرح علاوہ چند جانوں کے نقصان کے گورنمنٹ ہند کے فوجی ذخیرے کا بھی نقصان ہوا۔ لیکن تاہم اگر ہمیں اس جماعت کا پتہ لگ جائے تو ہم کسی نہ کسی طرح ہز آنر سے اسکی صفائی کرا دیں گے ہم ان سے عرض کریں گے کہ نفع کثیر کے مقابلے میں نقصان قلیل کو نظر انداز کر لیا جائے۔ ایک ایسی طاقتور اور حاکم کل جماعت کا پیدا ہونے سے آپ کی سات کروڑ رعایا اپنی تلاش قدیم میں کامیاب ہوتی ہے۔ اسکا بکھرا ہوا شیرازہ جمع ہو جاتا ہے۔ اسکی تمام قومی اور دینی امراض کا علاج اصلی ہاتھ آ جاتا ہے۔ صاحب نفوذ واثر پیشواؤں کے بغیر کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ پس اس طرح کروڑوں انسانوں کو موت کے بعد زندگی نصیب ہوتی ہے۔ "رفاہِ عام کے کاموں" کیلئے جب مسجد کا ایک حصہ لیا جا سکتا ہے کیونکہ عامۂ خلائق کے نفع کثیر کے مقابلہ میں ایک مخصوص جماعت کے نقصان قلیل کی پروا نہیں کی جا سکتی تو پھر ہمیشہ کے لیے ایک قوم کی زندگی کے مقابلے میں مسجد کانپور کے صرف ایک ہی واقعہ کی پروا نہیں کرنی چاہیئے۔

طرابلس کی زمین کس کے خون سے سیراب ہے؟ مسلمانوں کے۔ مغرب اقصیٰ کس کے خون سے رنگین ہے۔ مسلمانوں کے۔ خاک ایران پر کس کی لاشیں تڑپتی ہیں؟ مسلمانوں کی۔ سرزمین بلقان میں کس کا خون بہتا ہے۔ مسلمانوں کا۔ ہندوستان کی زمین بھی پیاسی تھی خون چاہتی تھی کس کا مسلمانوں کا، آخر سرزمین کانپور پر خون برسا اور ہندوستان کی خاک سیراب ہوئی۔ ہندوستان کی دیوی جوش وخروش میں تھی اپنی قربان گاہ کے لیے نذرانہ مانگتی تھی۔ کون جوان ہمت تھا جو اس کی خواہش پوری کرتا۔ آخر صوبۂ متحدہ کا بادشاہ سر جیمس مسٹن آگے بڑھا اور اس نے اپنی وفادار رعایا کا خون پیش کیا ـــــ مسلم ستی تو اب کہاں بسے گا کہ تیرے لئے ہندوستان بھی امن کا گھر نہیں رہا۔ جسکو تو سب سے بڑی اسلامی حکومت کہتی تھی وہ بھی تیرا خون مانگتی ہے وہ تیری محبت و وفاداری کا امتحان لیتی ہے ~ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

وہ کیا عجیب منظر تھا جب کہ بلائے کانپور میں کئی ہزار بے دست و پا برطانوی رعایا برہنہ سر برہنہ پا پایا

چشم نم و بادل پر غم ایک سیاہ عالم کے نیچے جو اسلام کی بیکسی و مظلومی کا نشان تھا کئی سو معصوم بچوں کیساتھ چند اینٹوں اور پتھروں کا ڈھیر لگا رہی تھی اور اس کی زبان پر وہ دعا جاری تھی جو وقت تعمیر کعبہ ابراہیم و اسماعیل کی زبان پر جاری تھی۔ پروردگار اپنے گھر کیلئے ہماری چند اینٹوں کو قبول کر تو سن رہا ہے اور جان رہا ہے — کیا برٹش مورخ ہم کو بتا سکتا ہے کہ برسٹل اور مینچسٹر کے کتنے ہنگاموں میں ان آتش بار ہتھیاروں سے کام لیا گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں وہ ہم کو حوالہ دیگا کہ برسٹل اور کانپور میں کتنی مسافت ہے۔ لیکن اے معصوم مورخ برائے خدا ہم کو بتا کہ برسٹل اور کانپور کی ذی روح حقیقتوں میں کتنی فصل ہے نصرانی کہتے ہیں کہ عورتوں میں روح نہیں لیکن اے پیغمبر ناصرہ کی امت بتا کیا مسلمانوں میں بھی روح نہیں۔ کیا تجھ کو شریعت کا یہ حکم یاد نہ رہا کہ "تو خون مت کر"۔

مقتولین کانپور، تم پر نماز نہیں پڑھی گئی کہ تم مغفور تھے ہم گنہگار تمہاری مغفرت کی کیا دعا مانگتے لیکن سنا ہے کہ تم کو کفن بھی نہیں ملا۔ گولیوں اور بندوقوں کی قطع برید کے بعد تمہارے جسم ہسپتال کی قینچیوں اور چھریوں کے کام آئیں گے۔ غزوہ بنی لحیان میں شہدائے اسلام کی لاشیں فرشتوں نے اٹھائی تھیں۔ ہم آج بھی یقین رکھتے ہیں کہ اخفار راز کے لئے اگر پولیس نے تمہاری لاشیں دریا میں نہیں پھینکیں تو یقیناً تمہاری لاشوں کو فرشتوں نے اٹھایا کہ رضوان الٰہی ان کا منتظر تھا۔

# اسلامی خون کی قیمت

یہ مسلمانوں کا خون تھا۔ اس خون کی اب زمین کی سطح پر کیا کمی رہی ہے کہ اس کو نادر و عجیب سمجھا جائے۔ ممکن ہے چھٹی صدی عیسوی میں اس خون کی دنیا میں کمی رہی ہو۔ جب بدر کے کنارے تین سو تیرہ مسلمان پچاس کم ایک ہزار مغرور و قوی دشمنوں کے مقابلہ میں بھی اپنا خون محفوظ رکھتے تھے۔ چودہ مسلمانوں کا خون اگر بہنا بھی تھا تو اس حالت میں کہ ستر دشمنوں کی لاشیں میدان

میں تڑپ چکی ہوتیں۔ اور اتنی ہی تعداد مشکیں کسی ہوئی سامنے ہوتی، ممکن ہے مسلمانوں کا خون اس وقت کمیاب ہو جب احد کے دامن میں تین ہزار دشمنوں کے نرغے میں جن میں دو سو شتر سوار اور سات سو آہن پوش خون آشام تھے۔ صرف سات سو مسلمان پھنس گئے تھے اور جب کہ حضرت انسؓ نے ستر زخم کھا کر اپنی گردن کا خون زمین کے حوالے کیا تھا۔

چند دنوں کے اندر نقشہ عالم کو یکسر پلٹ دینے والی جنگ قادسیہ کا وہ معرکۂ اغواث جس میں دشمنوں کے پورے ایک دستہ کے مقابلہ میں تنہا ایک مسلمان کی تلوار کافی تھی اور ہر صدائے تکبیر بلند کرنے والی زبان اس وقت تک خاموش نہ ہوتی تھی جب تک اپنے خون کے چند قطروں کے معاوضہ میں دشمنان حق کے خون کا ایک سیلاب عظیم اپنے سامنے نہ دیکھ لیتی۔ تو یقیناً وہ ایک وقت تھا جو مسلمانوں کے خون کی قیمت تبلا سکتا تھا۔

اس جنگِ قادسیہ کے تیسرے معرکہ یوم العماس کے بعد وہ چوتھا معرکہ جس میں مسلمانوں کا صرف آلات آہنی ہی سے مقابلہ نہ تھا بلکہ حریفانِ کار زار کے ساتھ مست ہاتھیوں کا ایک بہت بڑا غول بھی تھا۔ تاریخ کے صفحوں پر آج بھی فرزندانِ اسلام کے خون کی قیمت تبلا سکتا تھا جبکہ ایک تنہا مجاہد "قعقاع" نے ایک پورے پیل تن غول کو خاک و خون میں تڑپا دیا تھا اور پھر بھی اسکے خون کی پوری قیمت نہیں ملی تھی۔ جبکہ ۶۳۵ھ میں رومیوں کے عظیم الشان مشرقی مرکز پر تنہا جریدہ ایک مسلمان تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھے بڑھ رہا تھا اور دروازہ شہر کی ایک پوری جمعیت پر بے باکانہ حملہ آور ہوا تھا تو اسلامی خون کی عزت و حرمت پر یقیناً زمین کی مٹی کا ایک ایک ذرہ شہادت دے سکتا تھا۔ —— وہ پہنچا اور اس بے جگری سے فوج پر ٹوٹا کہ شہر سے بھاگ کر تمام عیسائیوں نے دیر مسجل میں پناہ لی جبکہ ایک پورا شہر ایک پوری فوج اور ایک بہت بڑی فوج کی چھاؤنی اپنا پورا خون دیکر بھی ایک مسلم مومن کے خون کو بمشکل خرید سکتی تھی تو ضرور اس وقت یہ خون قیمتی اور اسکی روانی بہت نادر تھی۔

یرموک کے میدان میں مسلمانوں کا خون ضرور قیمتی تھا جبکہ ایک تنہا شرجیل کا یہ حال تھا کہ چاروں طرف سے ہزاروں دشمنوں کی تلواریں پڑ رہی تھیں۔ مگر پھر بھی زمین کو اس کے خون کا ایک قطرہ نصیب نہ ہوتا تھا کیونکہ اس کے خون کے لئے اس سے بھی زیادہ خون کی ضرورت تھی۔

ہاں وہ معرکہ ابو محجن ثقفی کا مشہور واقعہ جس معرکہ میں پیش آیا۔ یہ شراب نوشی کے جرم میں قید تھے۔ مگر جب معرکہ کارزار گرم ہوا تو جوش جہاد سے مضطرب ہو گئے اور سپہ سالار جنگ کی بیوی سے پوشیدہ اجازت لے کر میدان جنگ میں پہنچے اور کشتوں کے پشتے لگا کر واپسی میں خود اپنے ہاتھوں سے بیڑیاں پہن لیں اور بدستور قید خانے میں بیٹھ گئے۔ اس معرکہ میں "خنساؔ" عرب کی مشہور شاعرہ بھی اپنے چاروں بیٹوں کے ساتھ شریک جنگ تھی اور اپنے خطبات حربیہ و رجزیہ سے دلوں کی آتش شجاعت کو بھڑکا رہی تھی۔

اور وہ معرکہ جبلات کی خاموشی کو اپنے اسلحہ کی جھنکار ہاتھیوں کی چیخ اور نعروں کی گرج سے زمین کو ہلا رہا تھا اور جب کتے کی آواز اور شدید آواز کی مشابہت کی بنا پر تاریخ میں "لیلۃ الھریر" کے نام سے مشہور ہے۔

ہاں جبکہ رومی و اسلامی سرحد کے انتہائی حصہ میں ایک بڑھیا مسلمان کی صدا بغداد کے تخت پر معتصم کو مضطرب کر دیتی تھی اور اس کی فریاد کا جواب دینے کے لئے ساٹھ ہزار تشنگان خون کو لے کر جوش و اضطراب کے پروں سے اڑتا ہوا رومیوں کے سر پر گرتا تھا تو اس وقت اس خون کی قیمت یقیناً بہت گراں تھی۔

غرضکہ ایک زمانہ تھا جب دنیا میں مسلمان کے خون سے بڑھ کر اور کوئی شے کمیاب

دگرداں نہ تھی مگر اب تو دریا کا پانی قیمتی ہے، مگر مسلماں کے زخموں کا خون بہت ارزاں ہو گیا ہے
ایک عرصہ سے تمام عالمِ اسلامی سوگ میں ہے مسلمانانِ ہند کے پاس دل و جگر
کے ٹکڑے تھے مگر زخموں سے بہا ہوا خون نہ تھا اس ماتم کدۂ مقدس میں جہاں شہداء
کی پاک روحیں خدا کی آغوش سے نکل کر اپنے ماتم گساروں کی آہ و فغاں سننے کے لئے
آئی ہوئی تھیں بغیر خون سے وضو کئے ہوئے ہم کیونکر شریک ہو سکتے تھے۔

رابعہ بصریہ نے ایک موقع پہ کہا تھا، نمازِ عشق کی دو رکعتیں ادا نہیں ہو سکتی
ہیں جب تک خون سے وضو نہ کیا جائے۔ رئیس اگست کی تیسری تاریخ پیغامِ شہادت
لے کر آئی تا مسلمانانِ ہند کی اس شرمندگی کو مٹائے اور ہم ممنون ہیں مسٹر جیمس میسٹن
بالقابہ کے جن کی بدولت دو چار کوزے ہم نے بھی بھر لئے ؎

دعا کنید بوقتِ شہادتم دو را — کہ ایں دمیست کہ درہائے آسمان باز ست

ہز آنر فرماتے ہیں :-

سب سے زیادہ میں ان لوگوں کی سنجیدہ ذمہ داری سے متاثر ہوا جو خود
تو دور اور محفوظ ہیں، مگر جنھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے ایک
جاہل جماعت کے جذبات کو مشتعل کر دیا اور جن پر خدا اور انسان کی نظروں میں
یکساں بہت سا بے ضرورت خون بہانے اور مصیبت لانے کا گناہ
عائد ہوتا ہے۔ میری دعا ہے کہ آگرہ کو ایسی المناک مصیبت کا کبھی سامنا
نہ کرنا پڑے۔

لیکن یہی مضمون ایک دوسرے پیرایہ کانپور کی زبانی ان لفظوں میں بھی بیان کیا
جا سکتا ہے اور ایک ہز آنر کے مقابلے میں سات کروڑ آنکھوں کا مشاہدہ یہی ہوگا۔ کہ

ان ساری جانفرسا مصیبتوں ان انسانیت سوز بے رحمیوں ان سفاک شعار اور قتل افعال اس تہذیب سلب اور قہر و جبر - ہندوؤں کے طوفان اور سنگینیوں کی سفاکی - صدہا اشکہائے حسرت اور نالہ ہائے جانکاہ - غرضیکہ سوراگست سے تمام انسانی مصائب و ہلاکت کی ذمہ داری عنداللہ وعندالناس صرف ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جنھوں نے حکومت کے بلند اور محفوظ تخت پر بیٹھ کر مظلوموں کی داد و فریاد سے بے رحمانہ اغماض کیا - ان کے جوش کو بے اصل ان کے احتجاج کو مصنوعی اور ان کے قانونی مطالبہ کو بے معنی بتلایا - تاج برطانیہ کی عزت اور حکومت کی مذہبی آئینی کی روایات کو بھول گئے اور انھوں نے باوجود فرضِ انصاف اور حق کے وہ نہیں کیا جس کو کر کے ان تمام خونین مصائب کو بیک قلم روک سکتے تھے اور بالآخر ان کا حاکمانہ گھمنڈ اور بے نیازانہ اغماض جو پہلے اخباروں کے صفحوں پر حرفوں کی سیاہ پوشی اور صحن ہائے مجالس میں آہ و فغان کے دھوئیں کی صورت میں موجود تھا مظلوموں کے خون کا سیلاب بن کر مسجد کانپور کی منہدم دیوار پر سے گذر گیا ؎

گیرم کہ دنت ذبح بہیدن گناہ من ــ دیدن ہلاک و رحم نہ کردن گناہ کیست

ہم سب کی دلی دعا ہے کہ خدا ہندوستان کے اور صوبوں کو ایسے حکام کی مصیبت سے محفوظ رکھے -

# مواعید شکستہ

ایک زمانہ وہ تھا جب ہندوستان میں شرع اسلام کی حکومت تھی احتساب جاری تھا۔ اور قانونِ الٰہی کی پابندی فرض تھی۔ سلطنت کا مذہب اسلام تھا اور اسلام ہی کے مطابق معاملات و مقدمات کے فیصلے ہوتے تھے۔

شرع اسلام کا حکم تھا کہ کوئی فیصلہ جو مسلمان قاضی کی عدالت سے صادر نہ ہوا ہو نافذ الاثر نہیں ہو سکتا۔ مدت ہوئی استبداد کا خود فراموش تحکم مسلمانوں کے دلوں سے تو اس حکم کو فراموش کرا چکا ہے۔ لیکن ہنوز "مسلمانی در کتاب" باقی ہے اور عام کتب فقہ میں یہ مسئلہ مذکور ہے۔

شاہ عالم بادشاہ دہلی نے بنگال و بہار و اڑیسہ کی سلطنت جب انگریزوں کو تفویض کی تھی تو عطائے دیوانی و نظامت کے لئے جو معاہدہ تحریر ہوا تھا اس کی ایک خاص دفعہ یہ بھی تھی کہ انگریز ان صوبوں میں شرع شریف کے مطابق حکومت کریں گے۔

میر جعفر جب مشرقی ہندوستان سے دستبردار ہوا۔ محمد علی خان نے جب ارکاٹ و کرناٹک کی ریاست نذر کی۔ آصف الدولہ نے جب صوبۂ الٰہ آباد و روہیلکھنڈ کا پیش کش گذرانا۔ سعادت علی خاں نے جب نصف سلطنت ہبہ کر دی۔ مؤتمن الملک اسحٰق خاں شوستری نے جب صوبۂ آگرہ کے لئے معاہدہ کیا تو عام روایت ہے کہ ان تمام معاہدوں میں اس شرط کو خاص اہمیت دی گئی تھی اور انگریزوں نے بطریق دوام و استمرار ادائے امر شرعیہ کے امتثال و انفاذ کے لئے دستخط کئے تھے۔ لندن کے انڈیا آفس میں ہنوز ان کاغذات کی اصلیں اور کلکتہ کے گورنمنٹ ہاؤس میں ان کی مصدقہ نقلیں موجود ہوں گی۔

۱۸۵۸ء کے بعد آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت جاتی رہی عنان سلطنت براہ راست شہنشاہ انگلستان کے ہاتھ آگئی، اس تبدیل و تغیر سے نظام تو ایک حد تک بدل گیا۔ مگر اساس تنظیم یا مابہ النظام کا بدلنا ممکن نہ تھا، شہنشاہیت نے کمپنی کے تمام معاہدات جائز و نافذ قرار دیئے اور ان کی مسئولیت اپنے سر لی بسئولیت تو بہرحال باقی رہی لیکن معاہدہ کو نافذ العمل بنائے رکھنے کی جو شرط تھی وہ گویا جزاکے لئے مشروط ہی نہیں ہوتی تھی۔

ابھی چند دنوں کی بات ہے لارڈ کرزن کی گورنمنٹ نے مہاراجہ کشن پرشاد کی وساطت اور ریذیڈنٹ کی مجبور کن حکمت عملی سے فائدہ اٹھاکر نظام حیدرآباد نواب میر محبوب علی خاں مرحوم کی گورنمنٹ سے ننانوے سال کے لئے صوبہ برار کا اجارہ لیا ہے اجارہ نامہ کی نقل بہ آسانی مل سکتی ہے، اور اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ برار میں (۱) امتثال احکام مذہبیہ (۲) سکۂ دولت آصفیہ (۳) خطبۂ نظام کے شرائط ہیں یا نہیں اور اگر ہیں تو کیا اس وقت بھی دفعہ اولی کا نفاذ باقی ہے۔؟

اسے بھی جانے دیجئے صوبۂ مدراس کے ذیل میں ایک بہت ہی مختصر اور چھوٹی سی عربی ریاست جیھور واقع ہے، یہ ریاست خود مختار تھی۔ ایک عرب خاندان اس کا فرمانروا ہے رئیس کا سرکاری لقب "سلطان" ہے جو حکومت ہند میں بھی مسلّم ہے۔ عربی حکومتیں عموماً شرعی قانون رکھتی ہیں، یہی دستور العمل جیھور کا بھی تھا، کچھ زمانہ گذرا انگریزی سلطنت کی شفقت و مرحمت کو سلطان جیھور کی بدنظمی ناگوار گذری۔ ریاست کی زمام انتظام اپنے ہاتھ میں لے لی شاید معاہدہ یہ ہوا کہ سلطان جیھور تادیب و تجربہ کے لئے ریاست کے نظم و نسق سے الگ ہوتے ہیں ان کی نیابت میں یہ فرض گورنمنٹ ہند ادا کرے گی، مگر اس وقت تبدیلی سے اصول حکومت میں فرق نہ آئے گا۔ اور ایام تادیب

گذرنے پر سلطان کو ریاست واپس مل جائے گی سو وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا۔ جمہور میں بجائے قانونِ اسلام کے اس وقت تعزیراتِ ہند کی حکومت ہے۔

حکومت نے پہلے پہل آئینِ نظامت کو توڑا، رعایا خوش رہی کہ انتظام کشنری سے شاید اشک شوئی ہو جائے۔ قضات کے مناصب توڑے۔ ملک چپ رہا کہ قاضی کی ایک خاص ضرورت داؤں کی جماعت پوری کر دیگی۔ شرعی عدالتیں توڑیں، قوم صبر کر بیٹھی کہ شرعِ محمدی سے کام نکل جائے گا۔

مقدمات وغیرہ میں غیر مسلم ججوں کے فیصلے ناطق ہونے لگے، مسلمان اس پہ بھی بے حوصلہ نہ ہوئے کہ قانون تو "ہدایہ" و "عالمگیری" ہی سے ماخوذ ہے۔

تعلیمِ قانون کا نصاب منتخباتِ فقہیہ پہ حاوی تھا اور اخیر میں ہدایہ کے ابواب میں وکالت کا امتحان لیا جاتا تھا، یہ ضابطہ بھی ٹوٹا۔ ہندوستان اس پہ بھی اپنی ناراضی کو دباتے رہا کہ مدنیتِ فرنگ کے آداب و آئین میں شاید فحشاء و منکر سے باز رکھنے کے مؤثر دفعات و قواعد ہوں گے۔

مذہب سے گورنمنٹ کی بے تعلقی کا اعلان ہوا، پیروانِ مذہب نے اپنی تشفی تھی رکھی کہ ہنوز مذہبی آزادی تو قائم ہے۔

مذہبی آزادی پہ جب حرف آنے لگا۔ لاہرپور ضلع سیتاپور کی خانقاہ اور روضہ کے سدِ باب کے لئے صاحبِ سجادہ پہ تشدد شروع ہوا، احاطۂ عدالت ججی غازی پور کی مسجد کے درختوں اور آس پاس کی کھپریلوں پہ دست درازی شروع ہوئی۔ پنڈت سری رام جج نے خدا کے گھر میں داخل ہو کر مسجد کے لوٹے اور بدھنیاں اپنے سامنے تڑوائیں، مسلمانوں کے ضبط میں اب بھی فرق نہ آیا کہ ابھی مسجد کی حقیقت تو تطاول سے محفوظ ہے۔

پھر جب کانپور میں مسجد مچھلی بازار کا ایک حصہ شہید کیا گیا تو اس کے لئے بھی تاویل

کر لی گئی کہ یہ حصہ مسجد میں داخل ہی نہ تھا۔ اور اگر تھا بھی تو جب تک مذہب کی راہ میں کشت و خون نہ ہو اور اہل مذہب کی جانوں پہ نہ آ بنے اس وقت تک مذہبی آزادی میں کیا کلام ہے۔

لیکن ۱۷ اگست کو جب اس آزادی کا بھی خون ہوا۔ اللہ کے گھر پہ جانیں فدا کرنے والے شہید کئے گئے تو عوام اس پر بھی خاموش ہیں کہ ہنوز شاہجہان کی مسجد اور شہنشاہ کونین کے بہت سے پرستار زندہ تو ہیں۔

دیکھنا ہے کہ اب اس مجروح و مخدوش زندگی پر بھی حملہ ہوا تب کیا ہوگا۔

"دیکھتے نہیں کہ ہر سال ایک یا دو مبتلائے مصیبت ہوتے رہتے ہیں۔ اس پہ بھی نہ تو توبہ ہی کرتے ہیں اور نہ نصیحت پکڑتے ہیں (۹ - ع - ۱۵)"

# اسلام اور سزائے قتل

راجپال کو رنگیلا رسول نامی کتاب لکھنے کی پاداش میں ایک مسلمان نے قتل کیا تو مخالفین کو اسلام اور مسلمانوں پر زیادتی کی تہمت لگانے کا ایک نیا بہانہ ہاتھ آیا۔ اور انہوں نے اس قسم کے سوالات اٹھانے شروع کئے کہ اگر کوئی شخص اسلام و بانیٔ اسلام کیخلاف کوئی بات کہے تو کیا اسلامی قانون میں اس کی سزا قتل ہے۔ اور یہ کہ اس قتل کے محرک خود مسلمان علما تھے۔

مولانا کے ایک سناتن دوست جو پنجاب کی ایک مذہبی انجمن کے معزز رکن تھے اور مولانا سے اسلام کے بارے میں کئی باتیں دریافت کرکے اپنی تشفی کر چکے تھے۔ اس واقعہ کے بعد اپنی مذہبی جانب داری کا مظاہرہ کئے بغیر نہ رہ سکے اور علماء اور مسلمانوں پر مذہبی تنگ نظری کا الزام لگا بیٹھے۔ مولانا نے اس مضمون میں ان کی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔

افسوس ہے اس خط میں آپ نے جو تاثرات ظاہر کئے ہیں وہ اس اصولی غلطی کا نتیجہ ہیں، جس سے پرہیز کرنے کا آپ نے ارادہ کیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب آپ مجھ سے پہلے پہل ملے اور اپنے شکوک مجھ پر ظاہر کئے تو میں نے بعض مقدمات آپ کے ذہن نشین کرنے چاہے تھے۔ میں نے کہا تھا۔ کہ یہ وہ بنیادی مقدمات ہیں جن کے بغیر طلب حقیقت کی راہ میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔

منجملہ ان مقدمات کے ایک مقدمہ یہ تھا کہ مذہب اور پیروانِ مذہب کا امتیاز ہمیشہ نظر کے سامنے رکھنا چاہئے۔ مذہب کے بارے میں ہماری دو تہائی مایوسیاں صرف اس غلطی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ کہ ہم بسا اوقات ان دونوں کے اختلافات بھول جاتے ہیں۔ میں سب سے پہلی بات جو آپ کے علم میں لانی چاہتا ہوں یہ ہے کہ آپ نے جستجوئے حقیقت میں ایک بنیادی صداقت معلوم کی تھی۔ اور اب اس کا سر رشتہ آپ کے ہاتھ سے چھوٹا جا رہا ہے۔

آپ لکھتے ہیں "ایک بڑی مشکل ہم لوگوں کی راہ میں یہ ہے کہ آپ جیسے بزرگ اسلام کی تعلیم اور اسپرٹ جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ وہ جب دوسرے مسلمانوں کی تعلیم میں ڈھونڈھی جاتی ہے تو نہ صرف یہ کہ نہیں ملتیں بلکہ ایسی باتیں سامنے آتی ہیں کہ کوئی انصاف پسند دماغ شک و شبہ کے طوفان سے محفوظ نہیں رہ سکتا" سوال یہ ہے کہ اسلام کی جو تعلیم آپ کے علم میں آئی ہے۔ اگر فی الحقیقت آپ مطمئن ہوگئے ہیں کہ وہ اسلام کی تعلیم ہے تو پھر آپ دوسرے مسلمانوں کی تعلیم میں اسے ڈھونڈنا کیوں چاہتے ہیں۔ آپ کو اسلام کی تلاش ہے یا مسلمانوں کی تعلیم کی۔ یقیناً یہ دونوں چیزیں ایک نہیں ہو سکتیں اگر آپ کو اسلام کی تعلیم کی جستجو ہے تو وہ دنیا کی ہر تعلیمی حقیقت کی طرح صرف

اپنے سرچشمہ ہی میں ڈھونڈھی جا سکتی ہے۔ اگر آپ کی سرچشمہ تک رسائی ہو گئی ہے (کم از کم میرا تاثر آپ کی نسبت یہی تھا) تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ اسلام کی تعلیم معلوم کرنے کے لئے خود اسلام تک پہنچ گئے ہیں۔ بلاشبہ اس کے بعد بھی آپ کے لئے یہ بات باقی رہ جاتی ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ زندگی میں اس کا عمل تلاش کریں۔

لیکن عمل تلاش کریں یہ نہیں کہ مسلمانوں کے عمل کو اسلام کی تعلیم قرار دیں۔

میں نہیں سمجھتا کہ یہ قدرتی اور سچا طریقہ چھوڑ کر آپ نے غلط روی اور کج اندیشی کی راہ کیوں اختیار کی۔

## طریق جدل اور طریق ہدایت

معلوم نہیں آپ کو وہ بات بھی یاد رہی یا نہیں جو گذشتہ سال میں نے آپ کے ذہن نشین کرنی چاہی تھی۔ کہ اس راہ میں بحث و جستجو کے ہمیشہ سے دو طریقے رہے ہیں ایک طریقہ وہ ہے جسے قرآن نے اپنی زبان میں "جدل" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ دوسرا طریقہ ہے جسے "ہدایت" کے لفظ سے پکارا ہے۔

وہ تمام لوگ جو حقیقت و صداقت کے متلاشی نہیں ہوتے بلکہ کسی خاص خیال اور جذبہ سے اپنی بات منوانی اور دوسرے کی گرا دینی چاہتے ہیں طریق جدل پر عامل ہوتے ہیں یہ لوگ اپنے آپ کو خواہ کتنا ہی حق کا طالب ظاہر کریں لیکن فی الحقیقت وہ حق کے نہیں اپنی ہوا و نفس کے مطیع ہوتے ہیں مذاہب عالم کے پرجوش حامیوں، مذہبی مجالس کے زبان دراز مناظروں کا غالب حصہ اسی طریق جدل کی پیداوار ہے۔

لیکن دوسرا طریقہ طریق ہدایت ہے یہ ان لوگوں کی راہ ہے جو سچائی اور حقیقت

کے متلاشی ہوتے ہیں وہ نہ تو کوئی خاص فرقہ وارانہ جذبہ رکھتے ہیں نہ انہیں کسی خیال اور رائے کی برتری ثابت کر دینے کی پچ ہوتی ہے۔ اس طریقہ کے رہرو کی ہر بات پچھلے طریقہ سے مختلف ہوتی ہے کیونکہ مقصد اور نظر و فکر کی روح میں اختلاف ہوتا ہے۔

فی الحقیقت ان دونوں طریقوں میں نہ صرف اختلاف ہے بلکہ صریح تضاد ہے۔ پہلے کا نتیجہ یہ ہے کہ حق کی طلب و معرفت کی استعداد ہی طبیعت انسانی میں باقی نہیں رہتی دوسرے کا نتیجہ یہ ہے کہ صرف حق ہی کی طلب و معرفت کا استغراق باقی رہ جاتا ہے اور نفس و ہوس کی تمام عصبیتیں اور خود پرستیاں معدوم ہو جاتی ہیں۔

## مذاہب عالم بہ اعتبار عمل

اگر ایک شخص مجادل نہیں بلکہ طریق ہدایت پر عامل ہے تو وہ بغیر کسی بحث و اختلاف کے تسلیم کرے گا کہ آج جس قدر مذاہب دنیا میں موجود ہیں تعلیمی مصادر کے لحاظ سے انہیں تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) وہ نہایت قدیم مذاہب جن پر امتداد زمانہ سے انقلاب حالت کے ایسے دور گزر چکے ہیں کہ اب انہیں ان کی حقیقی صورت و حالت میں معلوم کرنا نہایت دشوار ہو گیا ہے ان کی تعلیم کے مصادر محفوظ نہیں ہیں اور ان کے پیروؤں کی زندگی میں حقیقت کا اب کوئی سراغ نہیں لگایا جا سکتا البتہ بیرونی شہادتوں کی روشنی میں اس کی اندرونی حالت پر نظر ڈالی جا سکتی ہے۔

(۲) دوسری قسم ان مذاہب کی نظر آئے گی جن کی عمر پہلی قسم کے مذاہب سے کم ہے اور جنہیں نسبتاً اپنی تعلیم و اشاعت و توسیع کے لئے بہتر زمانہ حاصل ہوا تھا اس لئے

اگرچہ وہ بھی انقلاب حالات کی وجہ سے محرف اور متبدل ہو گئے ہیں۔ تاہم ان کی تعلیم کے بنیادی سرچشمے اس حد تک ضرور موجود ہیں کہ ایک طالبِ حق ان سے اندرونی شہادت حاصل کر سکتا ہے تاہم اس کے لئے بھی بیرونی شہادت ضروری ہے۔

(۳) اگر ہم نے صحتِ نظر کے ساتھ ان دونوں قسموں پر نظر ڈال لی ہے تو ضروری ہے کہ ایک تیسری اور آخری قسم بھی سامنے آجائے۔ یہ وہ قسم ہے جس کا ظہور دنیا کے تمدن و علوم کی اشاعت و تعلیم کے زمانہ میں ہوا چونکہ اس آخری قسم کے تمام تعلیمی مصادر محفوظ مدون اور ہر انسان کی دسترس میں ہیں اس لئے اس کے لئے کسی بیرونی شہادت کی ضرورت نہیں۔

مذاہبِ عالم میں اس تقسیم کی رُو سے ہندوستان اور ایران کے قدیم مذاہب پہلی قسم میں داخل ہیں یہودی اور مسیحی مذاہب دوسری قسم میں اور تیسری قسم سے مقصود اسلام ہے۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے شاید ہی دنیا میں کسی تعلیم کی حقیقت و اصلیت کا ادراک اس قدر آسان اور سہل ہے جسقدر اسلام کا ہے اول یہ کہ اس کی تعلیمی اصل اس طرح محفوظ اور مرتب دنیا کے سامنے ہے کہ بغیر کسی علمی تحقیق و کاوش کے ہر شخص اس سے واقف ہو سکتا ہے ثانیاً اس کے تمام مصادر اس طرح مسلّم اور طے شدہ ہیں کہ اس بارے میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں۔ ثالثاً تعلیمی مصادر کی جتنی بھی مقدار ہے بہت مختصر ہے اتنی مختصر کہ اگر ایک معمولی درجہ کا تعلیم یافتہ انسان چاہے تو ایک دن کے اندر معلوم کر سکتا ہے کہ اسلام کے تعلیمی مصادر کے مطالب کیا کیا ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جب ایک تعلیم اس درجہ واضح اور سہل ہمارے سامنے موجود ہے

تو کیا کسی غیر معادل کے لئے جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے فہم کے لئے خود اس پر اعتماد نہ کرے اور اگر اس کی تعلیم میں اور بعض انسانوں کے عمل میں اختلاف نظر آ جائے تو اپنے آپ کو شک و شبہ کے طوفان" کے حوالے کر دے

یہاں تک میں نے صرف اصولی بحث کی ہے اب مجھے آپ کے بعض تاثرات اور پیش کردہ سوالات کا جواب دینا ہے۔

## دعوت قرآنی کی بنیادی اصل

یہ موقع زیادہ تفصیل کا نہیں ہے ورنہ میں آپ کو بتلاتا کہ جستجوئے حقیقت اور معرفت صداقت کی یہی وہ بنیادی اصل ہے جس کی اب سے تیرہ سو برس پہلے قرآن حکیم نے نوع انسانی کو دعوت دی تھی۔ دراصل قرآن کی ساری تعلیم اسی اصل کی شرح ہے۔ قرآن جس وقت نازل ہوا اس وقت دنیا میں مذاہب کے پیروؤں کی کمی نہ تھی لیکن مذاہب کی حقیقت گم ہو چکی تھی۔ بیشمار جماعتیں تھیں اور ہر جماعت صرف اپنے ہی کو سچائی کی وارث یقین کرتی تھی۔ سچائی کی راہ ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتی اس لئے قرآن کے لئے بظاہر دو ہی طریقے ہو سکتے تھے۔ یا تو تمام پیروان مذہب کی تصدیق کرے یا تکذیب لیکن اگر وہ سب کی تصدیق کرتا تو اس کے معنی یہ تھے کہ اس نے بیک وقت حق اور باطل دونوں کو تسلیم کر لیا اور اگر سب کی تکذیب کرتا تو اس صورت میں دنیا کا مذہبی صداقت سے خالی ہونا لازم آتا پس اس نے ایک تیسری راہ اختیار کی اس نے کہا دنیا کے تمام مذاہب حق ہیں لیکن ان کے پیرو حق سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اگر پیروان مذہب کا یہ انحراف دور ہو جائے جو حق نہیں ہے تو ہر جماعت کے پاس وہ چیز باقی رہ جائے گی جو صرف "حق" ہے۔ یہی مذاہب عالم

کا مشترک حق دنیا کی عالمگیر روحانی صداقت ہے اور اسی کو قرآن نے اپنی زبان میں صراط المستقیم" اور "اسلام سے تعبیر کیا ہے۔

سچائی کی راہ یہ ہے کہ کہو ہم اللہ پہ ایمان لائے ہیں اور اس سچائی پہ ایمان لاتے ہیں جو ہمارے سامنے پیش کی گئی ہے نیز ان تمام مذہبی صداقتوں پہ ایمان رکھتے ہیں جو ابراہیم پہ نازل ہوئیں اور جن کی اسمٰعیلؑ و یعقوبؑ اور ان کی نسل کے رہنماؤں نے دعوت دی اور پھر وہ تعلیم جو موسیٰؑ کو دی گئی اور وہ تعلیم جو عیسیٰؑ کا پیغام حق تھا، غرضکہ دنیا کے سارے نبیوں اور مذہبی صداقت کے سارے معلموں کو خدا کی طرف سے وقتاً فوقتاً جو کچھ ملا ہے اس سب پہ ہمارا ایمان ہے۔

اس طرح قرآن نے جو طریقہ اختیار کیا وہ یہ تھا کہ تمام مذاہب کی تصدیق کی مگر تمام پیروان مذہب کی غلط روی کی تکذیب کی اور اس تصدیق و تکذیب کے اجتماع سے اس بنیادی صداقت کی راہ نوع انسانی پہ کھول دی جس پہ چلے بغیر کوئی انسان مذہبی حقیقت کی معرفت حاصل نہیں کر سکتا۔

آج بھی ہر اس انسان کے لیے جو مذہب کی روحانی صداقت کی طلب رکھتا ہو اس راہ کے سوا دوسری کوئی راہ موجود نہیں ہے۔ وہ وقت اب دور نہیں ہے جب عالم انسانیت مذاہب عالم کے اختلافات سے اکتا کر مجبور ہو جائے گا کہ یا تو یک قلم مذہب ترک کر دے یا تمام مذہبی صداقتوں کو جمع کر دے۔ میرا یقین ہے کہ جمعیت انسانی مذہب ترک نہیں کر سکتی اس لیے ناگزیر ہے کہ دوسرا طریقہ اختیار کرے اور جب وہ دوسرا طریقہ اختیار کرے گی۔ تو فی الحقیقت وہ یہی طریقہ اختیار کرے گی جس کی طرف تیرہ سو برس پہلے قرآن نے دعوت

دی تھی ۔یعنی انسانوں کے فہم و عمل کی تکذیب اور اصل و صحیح مذہب کی تصدیق ۔ اس وقت دنیا کے تمام پیروانِ مذہب یک زبان ہو کر اعلان کریں گے ۔

دنیا میں انسانی جمعیت کی ابتدا اختلاف سے نہیں بلکہ وحدت و یگانیت سے ہوئی سب ایک ہی قوم تھے اور سب فطری صداقت کے ایک ہی طریق پر چلنے والے تھے ، پھر ایسا ہوا کہ ان میں پھوٹ پڑ گئی اور گمراہی و فساد کی بیشمار راہوں میں بکھر گئے تب خدا نے ان کی ہدایت کے لئے نبیوں کو مبعوث کیا ۔ جو نیک کرداری کے پھل کی بشارت دیتے تھے ، اور بدکاری کے نتائج سے ڈراتے تھے ان کے ساتھ تعلیم حق کی کتابیں تھیں یہ اس لئے نازل کی گئی تھیں تاکہ جن جن باتوں میں نادانی و گمراہی سے اختلاف اور جھگڑا پیدا کر دیا گیا ہے ان سب کا فیصلہ ہو جائے اور سب اس حقیقی دین پر متفق ہو جائیں جس سے منحرف ہو کر ایک دوسرے سے جھگڑنے لگے ہیں ۔ افسوس ہے کہ نسل انسانی اس پر بھی اختلاف و فساد سے باز نہ آئی جن جن باتوں کے فیصلے کے لئے یہ کتابیں نازل کی گئی تھیں انہیں میں پھر اختلاف پیدا کر دیا گیا اور دین حق کی حقیقت اور وحدت گم ہو گئی جب ایسا ہوا تو ضروری تھا کہ ایک مرتبہ ان تمام اختلافوں اور گمراہیوں کے خلاف دین حق کی حقیقت کا عام اعلان کر دیا جائے اور تمام جماعتوں اور مذہبوں کو ایک نقطہ پر جمع کر دیا جائے ، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و رحمت سے اس کا دروازہ اہلِ ایمان پر کھول دیا اور وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت

کی راہ دکھاتا ہے (۱۲-۲۰۹)

اب میں اس خاص معاملہ پر متوجہ ہوتا ہوں جس کا آپ نے ذکر کیا ہے، میں آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ اس بارے میں آپ نے جس قدر تاثرات قبول کئے ہیں وہ زیادہ تر اسی اصولی غلطی کا نتیجہ ہیں۔

## مسلمانوں کا پچھلا مظاہرہ

کتاب راجپال کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ رسالہ فی الحقیقت نہایت بیہودہ اور دل آزار تھا اور اس پر اعتراض کرنے میں مسلمان حق بجانب تھے لیکن آپ کہتے ہیں کہ معاملہ اس حد تک پہنچ کر ختم ہو گیا بلکہ آپ کے لفظوں میں۔

جو طریقہ مسلمانوں نے ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اختیار کیا اور جو جو باتیں کہی گئیں وہ نہ صرف حق و انصاف کے خلاف تھیں بلکہ عجیب طرح کی مذہبی ذہنیت ظاہر کرتی تھیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تمام لیڈروں اور مولینا صاحبان نے اور جمعیۃ العلماء نے فتویٰ جاری کر دیا کہ رنگیلا رسول لکھنے والے اور چھاپنے والے کو قتل کرنا چاہئیے۔

میں آپ کی طبیعت کی صداقت اندیشی اور حق جوئی کا معترف تھا اور اب بھی ہوں جو آپ نے اس رسالے کے متعلق جو رائے قائم کی اور جس طرح بے لاگ اور قطعی لفظوں میں اپنا خیال ظاہر کر دیا فی الحقیقت ایک راستی پسند انسان کا یہی شیوہ ہونا چاہئیے۔ لیکن جن واقعات کا آپ نے ذکر کیا ہے افسوس ہے کہ نہ تو ان کی تعبیر صحیح ہے اور نہ وہ تاثر صحیح ہے جو آپ نے قبول کیا ہے

آخری چیز میں وہی اصولی غلطی کام کر رہی ہے جس پر پچھلی سطروں میں بحث کر چکا ہوں۔

تعبیر میں آپ نے جو غلطی کی ہے وہ غلطی عام ہے اور اس ناواقفیت کا ثبوت ہے جو ایک ہزار سال کی یکجائی کے باوجود ہندوؤں کو اسلام اور مسلمانوں کی نسبت ہے۔ میں نے بارہا خیال کیا ہے کہ اگر کسی ذریعہ سے ہم یہ باہمی کا آشنائی دور کر دے سکیں تو باہمی مخالفت اور توحش کی کتنی بڑی مقدار خود بخود دور ہو جاسکتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس کا کوئی سامان نہیں ہوتا

آپ نے غالباً بعض اخبارات کے مضامین دیکھ کر یہ رائے قائم کر لی کہ مسلمان لیڈروں اور جمعیۃ العلماء نے فتویٰ دیدیا لیکن اگر آپ کو مسلمانوں کی اصطلاح "فتویٰ" کی حقیقت معلوم ہوتی جو بہت ہی معمولی اور عام ہے تو کبھی یہ بات آپ کے قلم سے نہ نکلتی۔

غالباً آپ کا خیال یہ ہے کہ جب کبھی کسی معاملہ پر ایک مسلمان مذہبی قسم کی کوئی بات کہے تو وہ "فتویٰ" ہے۔ فتویٰ مسلمانوں کے دینی علوم کی اصطلاح ہے۔ اور اس کا اطلاق صرف اس بیان پر ہوتا ہے جو ایک مستند عالم دین اس حیثیت سے دیتا ہے کہ فلاں مسئلہ میں اس کے نزدیک شریعت کا حکم یہ ہے اب آپ غور کیجئے کہ لیڈروں کی طرف فتویٰ منسوب کر دینا کیسی غلطی ہے آپ کہہ سکتے ہیں کہ "علماء" بھی لیڈر رہیں۔ یہ ٹھیک ہے لیکن یقیناً یہاں لیڈر سے مقصود علماء نہیں ہیں۔ لیڈر مسلمان جماعتوں کے عام سربرآوردہ اشخاص اور سیاسی رہنما ہیں اور ظاہر ہے کہ نہ تو وہ فتویٰ دیتے ہیں اور نہ کوئی مسلمان ان کے بیانات کو فتویٰ کی حیثیت سے قبول کرتا ہے۔ البتہ جمعیۃ العلماء مذہبی حیثیت سے فتویٰ دے سکتی ہے لیکن یہ خیال صریح غلط ہے، کہ جمعیۃ العلماء نے رنگیلا رسول لکھنے والے یا چھاپنے والے کی نسبت کوئی فتویٰ جاری کیا۔

یہاں پھر وہی باہمی ناواقفیت اور ناآشنائی کی بلا سامنے آگئی ہے جو ہندو مسلمانوں کے تمام معاملات پر چھائی ہوئی ہے اول تو موجودہ صورت میں فتویٰ کی گنجائش ہی نہیں ہے

ہندوستان میں ایک شخص نے اسلام کے خلاف دلآزار کتاب لکھی تھی اور شائع کی تھی یہاں نہ تو مسلمانوں کی حکومت ہے نہ شرعی قوانین نافذ ہیں نہ مسلمانوں کے مذہبی گروہ کو کسی طرح کا دخل سیاست و تعزیرات میں ہے جو کچھ بھی اس بارے میں کر سکتی ہے حکومت کر سکتی ہے اگر کوئی اور شخص اس میں مداخلت کرے گا مجرم ہوگا، پس ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں مسلمانوں سے فتویٰ لینے یا دینے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، ہاں یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص احمق یا مجنون ہو کہ وہ خود کو سب کچھ سمجھنے لگے، تو واقعہ یہ ہے کہ ایسا کوئی واقعہ نہیں پیش آیا۔

ثانیاً جمعیۃ العلماء کی نسبت یہ سمجھ لینا کہ چونکہ وہ علماء کی انجمن ہے اس لئے اس کی جانب سے جو کچھ بھی کہا جائے فتویٰ ہے کس درجہ ناواقفیت کی بات ہے۔

جمعیۃ العلماء بھی دراصل ایک انجمن ہے اور اس حیثیت سے وہ تمام طریقے اظہار رائے کے عمل میں لاتی ہے جو دنیا کی تمام انجمنیں عمل میں لایا کرتی ہیں اس معاملہ میں اس نے بھی ایک تجویز منظور کی اور ورکنگ کمیٹی کا ایک جلسہ کرکے اس کا اعلان کر دیا پس وہ جمعیۃ العلماء کی ایک تجویز ہے نہ کہ فتویٰ۔

ثالثاً جمعیۃ العلماء کی اس تجویز کا مضمون بھی آپ نے صحیح طور پر نہیں سمجھا اور جو کچھ سمجھا وہ اصلیت سے اتنا ہٹا ہوا ہے کہ اگر میں آپ کو ملامت کروں تو آپ کو ناخوش نہ ہونا چاہئے دراصل وہ تجویز مسلمانوں کو مخاطب کرکے لکھی ہی نہیں گئی تھی اس کا تمام تر خطاب حکومت سے تھا کہ وہ اس طرح کے دل آزار حملوں کا سدِ باب کر دے اور اگر موجودہ قوانین اس کے لئے کافی نہیں ہیں تو نیا قانون نافذ کرے البتہ اس تجویز میں اس بات کا حوالہ ضرور تھا کہ اسلامی قوانین میں ایسے شخص کی سزا قتل ہے جو پیغمبر اسلام کی عمداً توہین و تذلیل کرے جس سے مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کے دینی احساسات اور معاملہ کی اہمیت حکومت پر واضح ہو جائے۔ انصاف

کیجئے کہ کہاں یہ صورتِ حال اور کہاں یہ صورتِ حال اور کہاں اس کی یہ تعبیر کہ جمعیت نے قتل کا فتویٰ دیدیا۔

رابعاً جمعیتہ نے یا کسی دوسری جماعت نے اگر یہ کہا ہے کہ اسلامی حکومتوں کا یہ قانون تھا تو اس کا صاف مطلب یہی ہو سکتا ہے جو حکومتوں کے قوانین کا عام طور پر ہوتا ہے یعنی ان کے قوانین کی رو سے یہ ایسا جرم تھا جو اگر عدالتی تحقیقات کے بعد ثابت ہو جائے تو اس کے لئے قتل تک کی سزا دی جاسکتی تھی۔ اس کا یہ مطلب کہاں سے نکالا گیا کہ جو مسلمان کسی کو بدزبانی کرتے دیکھے اسے فوراً قتل کر ڈالے۔

اسلام کے شرعی نظم کی رو سے تو کسی جرم کے لئے بھی ایسی اتار کی جائز نہیں ہو سکتی۔ تعزیر اور سیاست کے تمام احکام کا تعلق "قضا" سے ہے یعنی آج کل کی بول چال میں عدالتی کارروائی سے۔ کسی فرد کو بھی اپنی جگہ اختیار نہیں کہ قانون ہاتھ میں لے لے۔ جس کسی کو اپنے نزدیک مجرم سمجھے سزا دیدے اگر کوئی شخص ایسا کرے گا تو وہ اسلامی قوانین کی رو سے اسی طرح سزا کا مستحق ہوگا جس طرح قانون کی خلاف ورزی کرنے والا مجرم ہو سکتا ہے۔

میں نے اس حصۂ بیان میں ضرورت سے زیادہ تفصیل اس لئے کی کہ میں آپ پر یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ واقعات کے مطالعہ و بیان میں کوتاہ اندیشیوں کا کیا حال ہے کس طرح ایک بات بغیر کسی اشتباہ اور پیچیدگی کے محض اس لئے کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے اور معاملات پر بے لاگ طریقے سے نظر ڈالنے کی استعداد کھو چکے ہیں اور جب کسی معاملہ پر بحث کرتے ہیں تو اس کی بالکل کوشش نہیں کرتے کہ احتیاط اور انصاف کے ساتھ قدم اٹھائیں۔

ہندوستان میں ہندو مسلمان کی کش مکش کے سلسلے میں اگر وہ تمام بیانات اور مباحث جمع کرلئے جائیں جو ایک فریق نے دوسرے کے اقوال و اعمال کی نسبت بیان کئے ہیں اور پھر

ان پر انصاف اور صداقت شعاری کے ساتھ نظر ڈالی جائے تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ نصف سے زیادہ مقدار ان باتوں کی نکلے گی جو کبھی فتنہ و فساد کی صورت نہ اختیار کرتیں اگر واقعات کے مطالعہ و بیان میں انصاف و دیانت کا تھوڑا سا بھی لحاظ رکھا جاتا۔

## فقہ اسلامی کے تعزیری قوانین

جب کبھی تعزیر و سیاست کے کسی ایسے معاملے میں جیسا کہ یہ معاملہ ہے اس طرح کی تعبیر بیان اختیار کی جاتی ہے تو قدرتی طور پر ان تمام لوگوں کو جو اسلام کے نظام شرع سے واقفیت نہیں رکھتے ایک سخت غلط فہمی واقع ہو جاتی ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ جس طرح اسلام نے اپنے پیروؤں کو نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے اسی طرح تعزیر و سیاست کے بھی احکام ہیں مثلاً یہی قتل والا مسئلہ! حالانکہ اسلام کی نسبت ایسی مجنونانہ تعلیم کا تصور بھی کرنا اس کے خلاف سخت سے سخت اتہام ہے۔ نعوذ باللہ اگر اسلام کی ایسی تعلیم ہو اور اس نے اپنے پیروؤں کو قتلِ انسانی کا پروانہ دیدیا ہو۔ اسلام کے نزدیک تو انسان کی زندگی سے بڑھ کر دنیا کی کوئی چیز بھی محترم نہیں وہ قتل نفس کو انسان کی سب سے بڑی شقاوت قرار دیتا ہے، اس کی کتاب اپنے معجزانہ اندازِ بلاغت میں اعلان کرتی ہے کہ نوعِ انسانی کے کسی ایک فرد کا قتل۔ فرد کا نہیں نوع کا قتل ہے۔

جب کسی نے کسی انسان کو بغیر ان دو حالتوں کے کہ قصاص لینا ہو یا قتل و خونریزی اور ظلم و فساد روکنا ہو قتل کر ڈالا تو وہ صرف ایک جان ہی کا قاتل نہیں ہے بلکہ تمام انسانوں کا قاتل ہے اور اسی طرح جس کسی نے ایک انسان کو ہلاکت سے بچا لیا تو اس نے صرف ایک فرد انسانی ہی

کی جان نہیں بچائی بلکہ تمام نوع انسانی کو زندگی بخشی (۵ ! ۳۵)

بلاشبہ اسلام نے خاص خاص صورتوں میں قتل انسانی کی اجازت دی ہے صرف اجازت ہی نہیں دی ہے بلکہ بغیر کسی جذبۂ اعتذار کے کہا جاسکتا ہے کہ ترغیب دی ہے قتلِ انسانی کی یہ ناگزیر صورتیں اس لئے گوارا نہیں کی گئی ہیں کہ انسانوں کو قتل کیا جائے بلکہ اس لئے کہ انسانوں کو بچایا جائے

ایسا قتل جو قاتلوں سے انسانوں کو بچانے کے لئے ہو اگرچہ بظاہر خون بہانا ہے۔ لیکن فی الحقیقت اس میں انسانی زندگی کی حفاظت پوشیدہ ہے (۲ ! ۱۷۹)

قرآن بتلاتا ہے کہ یہ ناگزیر صورتیں تین ہیں، جنگ، قصاص اور ایسے جرائم جن کا انسداد بغیر انتہائی سزا کے ممکن نہ ہو۔ ان تین صورتوں کے علاوہ کسی حال میں بھی اسلام خدا کی بنائی ہوئی اس مخلوق کا خون بہانا برداشت نہیں کر سکتا۔ جس کا نام انسان ہے جو شخص اس سے زیادہ قتل انسانی کا جواز اس کی طرف منسوب کرتا ہے وہ یا تو اسلام سے قطعاً بے خبر ہے یا اسلام پر تہمت لگانے میں اُسے عار نہیں !

وہ نہیں سمجھ سکتا کہ اسلامی قانون کے معنی کیا ہیں اور ان کی نوعیت عقائد و عبادات کے شرعی احکام سے کس درجہ مختلف ہے، بلاشبہ تعزیر و سیاست کے بے شمار احکام ہیں جو فقہائے اسلام یعنی مسلمان قانون سازوں نے وقتاً فوقتاً وضع کئے اور مختلف عہدوں میں ان وقتوں کے ظروف و احوال کے مطابق ان کا اجرا و نفاذ ہوتا رہا۔ یہ تمام قوانین آج بھی قانون اسلام کی کتابوں میں موجود ہیں اور انہیں اسلامی قانون بھی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اسلام کے اصولی اور اجمالی مبادیات ہی سے نکالے گئے ہیں لیکن ان کے اسلامی قانون

ہونے کی نوعیت وہ نہیں ہے جس نوعیت کے قوانین عقائد و عبادات کے ہیں۔ دونوں کا فرق کئی حیثیتوں سے واضح ہے۔

اولاً تعزیر و سیاست کے تفصیلی قوانین کا بڑا حصہ براہ راست شریعت کا ٹھہرایا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ قانون سازی کے طریقوں پر شرعی اصول و مبادیات سے استنباط کیا ہوا ہے۔ اس بارے میں اسلام نے جو نظام تشریعی اختیار کیا تھا۔ وہ یہ نہیں تھا کہ نپولین کے فرانسیسی مجموعۂ قوانین یا تعزیراتِ ہند کی طرح اس نے تمام تفصیلی اور جزئی قانون کا ایک مجموعہ بنا کر نافذ کر دیا ہو اگر وہ ایسا کرتا تو دنیا کا عالمگیر مذہب نہ ہوتا محض کسی ایک قوم اور عہد ہی کا مذہب ہوتا۔ پس اس نے جو طریقہ اختیار کیا وہ یہ تھا کہ تفصیلات و جزئیات سے قطع نظر کر لی گئی اور صرف ایسے اصولی اور اجمالی مبادیات وضع کر دیئے گئے جن سے حسب ضرورت ہر طرح کے تفصیلی قوانین کا استخراج کیا جا سکتا ہے۔

اصل شرع اس بارے میں یہ تھی کہ جمعیتِ بشری کی استعداد و ضرورت کے مطابق عدل و سعادت کا نظام قائم رہے اور مفاسد کی روک تھام اور مصالح کے حصول کے لئے جن وسائل کی ضرورت ہو وہ صحیح طریقہ پر کام میں لائے جا سکیں ۔۔ اسلامی حکومت کی ابتدا ایک محدود رقبہ اور محدود احوال و ظروف میں ہوئی تھی اس لئے تفصیلات تعزیر و سیاست میں پھیلاؤ نہیں ہوا تھا۔ پھر جوں جوں دائرۂ اقتدار وسیع ہوتا گیا، اور نئی نئی ضرورتیں پیش آتی گئیں مقننین اسلام تفصیلی قوانین کا استنباط بھی کرتے گئے۔ یہاں تک کہ ہر طرح کے تعزیری قوانین کا ایک مکمل ذخیرہ مدون ہو گیا۔

پس اگرچہ یہ تمام تفصیلی قوانین بھی اپنی اصل کی بنا پر شرعی قوانین ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اسلام کے براہ راست احکام نہیں ہیں اور اسلام کے براہ راست احکام میں اور مسلمان قانون

سازوں کے استنباط کئے ہوتے احکام میں جو بنیادی فرق ہے اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ اسلام کی طرف دونوں کی نسبت ایک طرح کی نہیں ہو سکتی پہلی قسم کے احکام اس کے براہ راست ٹھیرائے ہوئے ہیں، دوسری قسم کے فقہا کے استنباط کئے ہوئے ہیں اور بسا اوقات ان میں اور اسلامی اصول و مباحات میں بیشمار کڑیاں نظر و تفریح اور قیاس و استخراج کی واقع ہوگئی ہیں۔

ثانیاً یہ بات بالکل کھلی ہوئی ہے کہ یہ قوانین تعزیرات و سیاست کے قوانین تھے اور تعزیر و سیاست کے قوانین سلطنت کے لئے ہوتے ہیں عام افراد امت کے لئے نہیں ہوتے یعنی نماز روزے کے احکام کی طرح ان کا خطاب افراد سے نہیں بلکہ حکومت سے تھا۔ یہ قوانین انفرادی واجبات و فرائض میں نہیں ہیں، یہ صرف اسی حالت میں قابلِ عمل ہو سکتے ہیں جبکہ کوئی اسلامی حکومت موجود ہو اور وہ اپنی عدالتوں میں اسے نافذ کرے اسلام نے احکام قضا پر اس قدر زور دیا ہے کہ شاید ہی اس عہد میں دنیا کی کسی قانونی حکومت نے اس قدر زور دیا ہو اسلام کا نظمِ سیاست یہ ہے کہ "جرم" اور "تعزیر" ایک ایسی چیز ہے جس کی تشخیص اور حکم ہر حال صرف عدالت ہی کے ہاتھ میں ہے — عدالت سے بھی مقصود محض کوئی خاص عدالتی منصب نہیں بلکہ "سماعت" "شہادت" اور "تحقیق" "و حکم" کے وہ تمام مراتب ہیں، جن کے مطابق حاکمِ عدالت کو کارروائی کرنی چاہئے۔ اگر کسی معاملہ میں تمام عدالتی کارروائی نہیں ہوتی ہے تو خلیفۂ وقت کو بھی اختیار نہیں کہ اپنے علم اور مشاہدے کی بناء پر کسی مجرم کو سزا دیدے اگر خلیفہ کے مشاہدے میں کسی کا جرم آگیا ہو تو اس کی حیثیت محض ایک مدعی یا گواہ کی ہوگی۔ اسی حیثیت سے اسے عدالت کے سامنے کھڑا ہونا چاہئے یہ عدالت کا کام ہے کہ اس کے دعوی یا گواہی کی نسبت موافق یا مخالف رائے قائم کرے۔

موجودہ زمانہ کی قانونی اصلاحات میں بہت زیادہ زور اس اصل پر دیا جاتا ہے کہ

عدالتی اختیارات انتظامی اختیارات سے علیحدہ کر دیئے گئے ہیں یعنی جو قوت "سزا" کے نافذ کرنے کا اختیار رکھتی ہے اسے "مجرم" قرار دینے کا اختیار نہیں ہے بلاشبہ یہ ایک عظیم اصلاح ہے لیکن دنیا کو معلوم نہیں کہ ساتویں صدی ہی میں جبکہ دنیا کے سب سے بڑے متمدن ملک روم کے قوانین کا یہ حال تھا کہ ایک ہی شخص بحیثیت مجسٹریٹ کے ملزم پر الزام بھی عائد کرتا تھا اور بحیثیت جج کے اسے سزا بھی دیدیتا تھا اسلامی حکومت میں نہ صرف عدالت کے اختیارات انتظامی مناصب سے الگ تھے بلکہ اسلامی عدالتوں کو وقت کے حاکموں، گورنروں اور خود بادشاہوں پر بھی حکم دینے اور بلا رو و رعایت سزا تجویز کرنے کا اختیار حاصل تھا ویسا ہی اختیار جیسا اختیار وہ ایک عام باشندۂ ملک کے لئے سزا تجویز کرنے کا رکھتے تھے اسلام نے تعزیر و سیاست کے باب میں عدالت کے نظام کو جس قدر اہمیت دی ہے اس کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ مسلمان قانون سازوں کی ایک بڑی جماعت اس طرف گئی ہے کہ کوئی آقا اپنے نوکر اور غلام کو بھی بطور خود سزا نہیں دے سکتا اگرچہ قصور کتنا ہی بڑا اور سزا کتنی ہی ہلکی ہو۔

آج اگر ہندوستان میں اسلامی حکومت موجود ہوتی اور بغیر کسی ادنیٰ تغیر کے وہی قوانین نافذ ہوتے جو ساتویں اور آٹھویں صدی ہی میں دمشق اور بغداد کی عدالتوں میں نافذ تھے اور ایسا ہوتا کہ ایک مسلمان ایک "ذمی" (غیر مسلم شہری) کو قتل کر ڈالتا تو یقیناً وہ اسی طرح قتل عمد کا مجرم قرار دیا جاتا جس طرح دنیا کی تمام عدالتوں کے نزدیک قرار دیا جا سکتا ہے ایک لمحہ کے لئے بھی کوئی مسلمان یہ خیال نہیں کر سکتا تھا کہ اس نے ایک غیر مسلم انسان کا خون بہا کر کوئی مقدس فرض انجام دیا ہے۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ فقہ اسلامی کے قوانین اس بارے میں کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن کیا بحالتِ موجودہ ان کا ذکر موزوں اور برمحل ہو سکتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ فقہ اسلامی کے جس قدر تعزیری قوانین غیر مسلموں کے متعلق ہیں وہ سب ایک خاص قسم کی صورتِ حال سے تعلق رکھتے تھے یعنی یہ کہ اسلامی حکومت ہو اس نے غیر مسلموں کی حفاظتِ جان و مال کا ذمہ لیا ہو اور ذمیوں کے متعلق جو معاملات پیش آئیں اس میں ان کے ذریعہ سے اسلامی عدالتیں اپنے احکام نافذ کر سکیں۔

لیکن اب سرے سے وہ صورتِ حال باقی ہی نہیں ہے نہ تو ہندوستان میں اسلامی حکومت ہے نہ "شرعی ذمہ" ہے نہ "ذمی" ہیں پس فی الحقیقت ان قوانین کا موجودہ حالت سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا غیر مسلموں کو کس معاملہ میں سزا دینی چاہئے اور کس میں نہیں دینا چاہئے یہ بات تمام تر اس اصل پر مبنی تھی کہ اسلامی حکومت نے فتح یا معاہدہ کے بعد غیر مسلموں کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ اور انھیں خاص شرائط پر ہر طرح کے شہری حقوق عطا کر دیئے تھے۔ چونکہ حکومت نے ذمہ لیا تھا اس لئے یقیناً اسے یہ حق بھی حاصل تھا کہ اپنے قوانین و عدالت کے ذریعہ ان کے معاملات کا فیصلہ کرے اور اگر وہ ظلم و تعدی پر اتر آئیں تو انہیں سزا دے — لیکن اگر اسلامی حکومت موجود نہیں ہے اور نہ غیر مسلموں کا ذمہ باقی رہا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ قوانین ایک قلم غیر متعلق ہو جاتے ہیں کیونکہ اب وہ "ذمہ" ہی باقی نہیں رہا جس پر تعزیر و سیاست کے یہ قوانین مبنی تھے اور نہ حکومت ہی باقی رہی جسے عدالتی نظام کے ذریعے سزائیں نافذ کرنے کا حق تھا۔ پس موجودہ حالت میں ان قوانین کا ذکر کرنا اور انہیں اسلامی قانون! اسلامی قانون! کہہ کر پکارنا کس قدر بے معنی ہے۔

ایسی ہی غلطیاں ہیں جن کی وجہ سے اسلام کی صورت غیروں کی نظروں میں مشتبہ ہو گئی ہے اور اس کی صاف اور روشن تعلیم پر طرح طرح کی بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کے پردے پڑ گئے ہیں۔

# اصل سوال کا جواب

اصل مسئلہ سے متعلق جن لفظوں میں سوال کیا گیا ہے اس کا جواب بغیر کسی تامل کے یہ ہے۔ کہ نہ تو اسلام کا یہ قانون ہے اور نہ کوئی ایسا قانون اسلام کا قانون ہو سکتا ہے۔

البتہ مسئلہ کی ایک بالکل دوسری قسم کی صورت ہے اور وہ بلاشبہ فقہ اسلامی کے قوانین میں موجود ہے وہ صورت یہ تھی کہ اگر ایک ذمی (غیر مسلم باشندہ) اپنے مذہب کے جنونانہ تعصب کی وجہ سے یا مسلمانوں سے بغض و عداوت کی وجہ سے یا حکومت کی تحقیر و تذلیل کے لئے ایسا رویہ اختیار کرے کہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں سب و شتم کرنے لگے یا اس طرح کی بدزبانی کرنے لگے جو سب و شتم کا حکم رکھتی ہو تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے۔

فقہا کی ایک جماعت اس طرف گئی کہ اس طرز عمل کے بعد اس کا ذمہ وعہد باقی نہیں رہا یعنی اسلامی حکومت کا معاہدہ خود اسی کی طرف سے شکست ہو گیا اس لئے اسے قتل کرنا چاہیے۔ دوسری جماعت اس طرف گئی ہے کہ عہد و ذمہ شکست نہیں ہوا اس لئے قتل کی سزا نہیں دی جا سکتی البتہ عدالت کو اختیار ہے کہ وہ مصلحت کے مطابق ایسی کارروائی کرے جس سے اس کا سدباب ہو جائے۔

پہلی رائے حضرت امام مالک رح۔ امام احمدؒ اور امام شافعی رح کی ہے۔ دوسری رائے امام ابوحنیفہ رح کی ہے اور حنبلیہ و شافعیہ میں سے بھی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے۔

## اسلامی حکومت اور غیر مسلم

جو فقہا اس طرف گئے کہ اس صورت میں قتل کرنا چاہیے انہوں نے جن حالات میں اور

جن وجوہ کی بناء پر ایسا حکم تجویز کیا ضروری ہے ٹھیک طور پر اسے تسلیم کر لیا جائے لیکن اس کی وضاحت اس وقت تک نہیں ہو سکے گی جب وقت تک یہ بات واضح نہ ہو جائے کہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کی حیثیت کیا قرار دی گئی تھی مختصر لفظوں میں اس کی تشریح حسب ذیل ہے۔

چھٹی صدی مسیحی میں جب اسلام کا ظہور ہوا تو مذہب و اعتقاد کا اختلاف انسانی قتل و خونریزی کا سب سے بڑا باعث تھا دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ تھی جو حکومت کا اقتدار حاصل کر کے دوسرے مذہب کے پیروؤں کے ساتھ انصاف کر سکتی ہو جس مذہب کے پیرو طاقت و حکومت حاصل کر لیتے تھے اپنے مذہب کے سوا اور کسی مذہب کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

رومیوں کی قوم اس عہد کی سب سے بڑی متمدن قوم تسلیم کی گئی ہے لیکن اس کا بھی یہ حال تھا کہ جس وقت تک اپنے قدیم مذہب پر قائم رہی یہودیوں اور عیسائیوں کے لئے امن نہ تھا جب مسیحی مذہب قبول کر لیا تو تمام غیر مسیحی رعایا زندگی اور معیشت کے حقوق سے محروم ہو گئی۔

لیکن اسلام نے مذہب اور اعتقاد کی آزادی کا اعلان کیا اس نے مذہبی رواداری اور انسانی حقوق کی ایک ایسی فضا پیدا کر دی جس کا اس وقت تک دنیا میں کوئی نمونہ موجود نہ تھا۔

پچاس برس کے بعد جب اسلامی حکومت کا دائرہ اقتدار وسیع ہوا تو یہ ایک ایسی مملکت تھی جو اگرچہ خاص ایک مذہب کے پیروؤں کی تھی لیکن اس میں حکمران قوم کے دوش بدوش ہر مذہب و ملت کے لوگ آباد تھے اور سب کو بلا امتیاز ایک ہی طرح کی شہری و ملکی حقوق حاصل تھے مذہب و اعتقاد کے اختلاف کی بناء پر کوئی انسان دوسرے انسان کے انسانی و ملکی حقوق تلف نہیں کر سکتا تھا۔

جہاں تک غیر مسلموں کا تعلق ہے اسلام کا طریق عمل یہ تھا کہ اس نے فتح مکہ کے بعد

عرب کی قدیم بت پرستی کے اعتراف سے تو انکار کر دیا لیکن باقی تمام غیر مسلم اقوام کیلئے یہ حکم دیا کہ وہ اسلامی حکومت کے ماتحت اسی طرح زندگی بسر کر سکتے ہیں جس طرح خود مسلمان بحیثیت شہری ہونے کے انھیں وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو خود مسلمانوں کو حاصل ہیں۔

اصل طرز عمل اس بارے میں وہ ہے جو خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کے ساتھ وقتاً فوقتاً اختیار کیا تھا اور آپؐ کے بعد خلفاء راشدین اس پر عامل رہے تھے۔

ایران، شام اور مصر کی فتح کے بعد وہاں کے غیر مسلم باشندوں سے جو معاہدے کئے گئے وہ آج تک تاریخ و فقہ میں موجود ہیں۔ فقہا نے انہیں سے ذمیوں کے مسائل کا استنباط کیا ہے۔

اسلامی احکام کی رو سے غیر مسلم باشندوں کے جن حقوق کا بطور عہد و میثاق کے ذمہ لیا گیا تھا وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) انھیں پوری مذہبی آزادی رہے گی۔ ان کی مذہبی عبادت گاہیں اور ہر طرح کی مذہبی عمارتیں محفوظ رہیں گی۔ صلیبوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ سنکھ بجانے سے نہیں روکے جائیں گے۔ اپنے تہواروں میں اپنے جلوس نکال سکیں گے۔ تمام مذہبی عہدے اور انتظام بدستور قائم رکھے جائیں گے۔

(۲) انہیں ان کے مذہب سے برگشتہ نہیں کیا جائے گا۔

(۳) ان کی جان و مال اور ہر طرح کی جائداد محفوظ رہے گی اور اس میں تصرف کا حق انہیں حاصل رہے گا اور ان کا کوئی حق چھینا نہیں جائے گا۔

(۴) اگر ان پر کوئی دشمن حملہ کرے گا تو مسلمان ان کی طرف سے لڑیں گے۔

(۵) انہیں ان کے مذہبی احکام کے خلاف کسی امر پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

(۶) قانون کی نظر میں ان کی جان اور مال مسلمان کی جان اور مال کی طرح ہوگا۔

(۷) تجارتی کاروبار اور معیشت میں کسی طرح کی روک نہ کی جائے گی۔

(۸) وہ تمام ٹیکسوں سے معاف رکھے جائیں گے جو مسلمان کے لئے قرار دیئے گئے ہیں ان سے عُشر بھی نہیں لیا جائے گا۔

(۹) وہ فوجی خدمت سے بھی مستثنیٰ ہوں گے

یہ اُن معاہدات کا خلاصہ ہے جو خود سرورِ کائنات ؐ نے غیر مسلموں سے کئے تھے مثلاً نجران کا معاہدہ جو ۱۰ھ میں ہوا تھا اور جس کے پورے الفاظ فتوح البلدان اور کتاب الخراج میں موجود ہیں۔ پھر خلفاء راشدین کے زمانے میں جب شرق کے بڑے بڑے ممتدن ممالک فتح ہوئے اور مجوسیوں اور عیسائیوں کی بے شمار آبادیاں اسلام کے ماتحت آگئیں تو ان مجمل شرائط میں اور زیادہ تفصیل ہوئی اور مذہبی ملکی اور معاشرتی آزادی وحقوق کی وہ تمام باتیں پوری صراحت کے ساتھ تسلیم کر لی گئیں جو آزاد باشندگان شہر کے لئے اس عہد میں زیادہ سے زیادہ ہو سکتی تھیں

یہ محض ایک معاہدہ ہی نہ تھا بلکہ ایک ایسا واضح اور قطعی طرز عمل تھا جس میں کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔

مسلمان خلفاء جس درجہ غیر مسلمین کے حقوق کا لحاظ رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ صرف اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ سے لے کر حضرت علیؓ تک چاروں خلفاء کے وہ کلماتِ وصیت دیکھ لئے جائیں جو سفر آخرت کرتے وقت ان کی زبان پر طاری ہوئے تھے۔

ان میں سب سے پہلے یہ جملہ نظر آئے گا۔

"غیر مسلموں کے حقوق کا خیال رکھنا کیونکہ ہم نے ان کا ذمہ لیا ہے"۔

ذمیوں کے مذہبی و ملکی حقوق کے عام اعتراف کا یہ حال تھا کہ فی الحقیقت اُن کی جان

مسلمانوں کی جان کی طرح اور ان کا مال مسلمانوں کے مال کی طرح محفوظ تھا اور یہ صرف زبان ہی کا اعلان نہ تھا بلکہ قانون کا دائم و جاری عمل بھی تھا۔ خلفاء راشدین کے زمانے سے اسلام کی آخری سلطنتوں تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ذمیوں کا قتل اس لئے جائز رکھا گیا ہو کہ وہ مسلمان نہیں ہیں ۔۔۔ خلفاء راشدین سے بڑھ کر اسلامی تعلیمات کے پکے کون ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایک نہیں بے شمار واقعات موجود ہیں جن میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ نے ایسے مسلمانوں کو قتل کرنے کا حکم دیا جنہوں نے کسی عیسائی یا مجوسی باشندے کو قتل کر دیا تھا۔ اپنے پہلے اور اپنے بعد جس رواداری اور انسانی مساوات کا سلوک اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ کیا تھا اس کا ایک یورپین مورخ موسیو سیدیو نے ان لفظوں میں اعتراف کیا ہے:

"اسلام نے ذمیوں کو بجز ایک حق کے اور تمام حقوق دیدیئے تھے۔ یعنی وہ بادشاہ نہیں ہو سکتے تھے"۔

ان تمام حقوق کے معاوضہ میں اسلامی حکومت ان سے کیا چاہتی تھی اس پہلو سے بھی معاملہ پر غور کر لینا چاہیئے۔ قدرتی طور پر اس سلوک کے بعد اسلامی حکومت ذمیوں سے کم سے کم یہ توقع رکھنے میں حق بجانب تھی کہ وہ حکومت کو اپنی حکومت تصور کریں گے اور اس کے خلاف کسی بغاوت یا سازش میں حصہ نہیں لیں گے۔

(۲) مسلمانوں کے ساتھ وہ خود بھی شرافت اور رواداری کا برتاؤ کریں گے۔

(۳) وہ کوئی ایسی بات علانیہ نہ کریں گے۔ جس سے حکومت کی توہین و تذلیل ہو یا حکومت کے مذہب کی اہانت ہو۔

کیا ایک لمحہ کے لئے بھی کوئی شخص ان توقعات کو بے اعتدلانہ قرار دے سکتا ہے ـــ

چھٹی صدی عیسوی میں دنیا میں جب اسلام نے ان قوانین کا اعلان کیا تھا تو یقیناً یہ کوئی ظالمانہ طرزِ عمل نہیں تھا۔ آج دنیا میں کون قوم اور مذہب ہے جو اپنی تاریخ کے صفحات میں اس طرح کے طرزِ عمل کی ایک بھی مثال دکھا سکے۔

---

# شیعہ کالج لکھنؤ

باوجود کئی ہفتوں کے اغراض و اغماض کے آج میں مجبور ہوا ہوں کہ وقت کے ایک ایسے مسئلے کی نسبت چند کلمات لکھوں جو ہمیشہ سے اسلامی مباحث و نظر کا سب سے زیادہ مشتبہ و ظنون آلود موضوع رہا ہے اور جس کی نامبارکی کی طرح بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کی آلودگی سے اسے الگ نہیں کرسکتی تاہم سچائی کی فاتحانہ حقیقت پر میرا اعتماد ہے۔

اگر دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کو چراغ کی روشنی دھندلی نظر آتی ہے تو یہ ان کی آنکھوں کا ضعف ہے جن کو دور کرنا چاہیئے ان کی خاطر چراغ گل نہیں کئے جا سکتے۔

میں آج مجوزہ شیعہ کالج کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔

سب سے پہلے میں یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ مسئلہ اصلاح و تجدید امت کے متعلق میرا ایک خاص مسلک ہے اور اس مسلک کی بنیاد محض بعض جزئیات عروج و تنزل کے مشاہدہ پر نہیں ہے جیسا کہ گذشتہ پچاس سال کی تمام اصلاحی تحریکوں کا رہا ہے بلکہ اس کی بنیاد وہ کلیات و اصول و عقائد ہیں جن کو اسلام کی تصریحات، کتاب و سنت کی محکمات، عقل و براہین کی دلالت

تاریخ و استقرار تاریخی کے نظر و اخذ اور تمام جزئیات ترقی و تنزل امم کے درس و فکر کے بعد میں نے قرار دیا ہے اور اس بارے میں ایک پورا سلسلۂ عمل اپنے پیش نظر رکھتا ہوں۔

منجملہ ان عقائد و اصول کے جن پر میرا مسلک و دعوت مبنی ہے ایک سب سے بڑا اہم اصول وہ ہے جس کو میں "مسئلہ تحزیب و تشذیب" سے تعبیر کرتا ہوں یعنی مسلمانوں کا توحید و تالیف کے بعد پھر متفرق ہو کر گروہ گروہ ہو جانا اور ایک امت قیمہ کی جگہ مختلف ناموں اور مختلف عقیدوں میں بٹ جانا۔

میرا عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام ادبار و تنزل کی اصل و حقیقی علت یہی چیز ہے اور جب تک یہ دور نہ ہوگی اس وقت تک کوئی سچی تجدید و احیا کامیاب نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کے تنزل کی تمام شاخوں سے گزر کر جب درخت کی جڑ تک نظر پہنچے گی تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ علل و اسباب کے کلیات دوسرے ہیں اور ان میں سب سے زیادہ اہم و نافذ علت تالیف کے بعد تفریق، توحید کے بعد تفرقہ، اجتماع کے بعد افتراق اور نزول علم کے بعد بغی و عدوان ہے۔

یاد رکھو کہ کوئی قوم اس لئے نہیں بگڑتی کہ اس نے اپنی تعلیم سعادت کی فروعات کو چھوڑ دیا بلکہ اس لئے کہ اصول و کلیات کا سررشتہ اس کے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ اسلام کے بھی اصول و فروع ہیں۔ اسلام کا اصل عقیدۂ "توحید" ہے اسی عقیدے کے اندر مسلمانوں کی تمام روح حیات مضمر تھی اور اسی روح نے ان کو دائمی زندگی کی خوشخبری سنائی تھی۔ لیکن مسلمانوں نے سب سے زیادہ اسی عقیدے سے انحراف کیا حتی کہ آج اس سے بڑھ کر اور کسی اعتقاد میں وہ تجدید دعوت کے محتاج نہیں ہیں جس طرح عقیدۂ توحید کے معنی یہ نہ تھے کہ مشرکین مکہ کی طرح زبان سے تو ایک صانع کل کا اقرار کر دیا جائے لیکن اپنی عملی زندگی پر صدہا غیر الٰہی عبودیتوں کی لعنت بھی طاری کر لی جائے اسی طرح توحید کی حقیقت کے ساتھ یہ ضلالت بھی جمع نہیں ہو سکتی کہ ایک فاطر السموات والارض کی بندگی کا دعویٰ کر کے بہت سی جماعتوں اور شکلوں میں متفرق ہو جائیں اعتقاد توحید کا

اولین مطالبہ یہ تھا کہ تمام کرۂ ارضی کی سعادت و ہدایت کے لئے ایک ایسی امت عادلہ تیار ہو جو دوسری پچھلی قوموں کے برخلاف اپنے کل عقائد و اعمال کے اندر جلوۂ توحید رکھے یعنی جس طرح اس کا خدا وحدہٗ لاشریک ہو، اسی طرح اس کا مصدر امر و نہی قرآن بھی ہدایت میں اس کا مبدا ر حکم و سلطانی رسول بھی اپنی تعلیم کتاب و حکمت میں اس اور اس کی امت بھی اپنے خصائص و محامد اور وحدت و یگانیت میں وحدہٗ لاشریک ہو۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن ہر جگہ اسلام کو "وحدت و تالف" اور کفر کو "تعدد و تشتت" قرار دیتا ہے اور جس شدت و اعادہ تکرار کے ساتھ شرک سے روکتا ہے ٹھیک ٹھیک اسی طرح تفریق و شقاق سے بھی باز رکھنا چاہتا ہے، وہ بار بار کہتا ہے کہ تم "مغضوب علیہم" یعنی یہودی اور "الضالین" یعنی نصاریٰ کی ضلالتوں سے اپنے آپ کو بچاؤ اور "انعام یافتہ" جماعتوں کی راہ پر چلو۔

ان لوگوں کی راہ اختیار نہ کرو جنھوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور ایک امت ہونے کی جگہ گروہ گروہ ہوگئے ہر فرقہ اپنے ہی خیالات و اوہام کو حق سمجھتا ہے اور اس پر قانع اور خوشحال ہے (۳۰: ۳۲)

اللہ کے رسول نے سب سے بڑی وصیت امت کو یہی کی۔

میں نے تم کو عذاب شقاق و افتراق سے نکال کر اتحاد و تالیف کی رحمت کا پیکر بنا دیا ہے لیکن میرے بعد کافروں کا طریق اختیار نہ کرنا کہ باہم ایک کی تلوار دوسرے کی گردن پر چلے (بخاری)

اور یہی چیز ہے جس کی طرف "باب مدینۃ العلم" حضرت امیر علیہ السلام نے اپنے ایک خطبہ میں دعوت دی فرمایا کہ سواد اعظم کی معیت کو اپنے اوپر لازم کر دو اللہ کا ہاتھ جماعت کے ساتھ ہے جو شخص اپنی جماعت سے الگ ہو گیا وہ شیطان کے لئے ہوگیا جس طرح بکری اپنے ریوڑ سے الگ ہو کر

جیرٹیے کے لئے ہو جاتی ہے۔ آگاہ ہو کہ جو شخص تفریق کلمہ کی طرف بلانے اور جماعت میں پھوٹ ڈالے اسے قتل کر ڈالو اگرچہ وہ وہی سر ہو جو میرے عمامے کے نیچے چھپا ہے۔

سواد اعظم سے مقصود تعداد کے لحاظ سے بڑی جماعت نہیں ہے بلکہ مقصود اسلام اور اس کی قومی جماعت ہے پس یہ اختلاف و شقاق ایک عذاب الہٰی ہے مسلمانوں کی سب سے بڑی معصیت ہے۔ زمین کی سطح پر مسلمانوں نے اس سے بڑا اور کوئی گناہ نہیں کیا اور خدا نے اس وقت تک جس قدر بھی ان کو سزائیں دی ہیں وہ سب کی سب اسی بڑے جرم کی پاداش ہیں۔

سطور مندرجہ صدر سے یہ چیز تمہارے سامنے واضح ہو گئی ہو گی کہ مسئلہ اختلاف و تفریق کے متعلق میرا کیا عقیدہ ہے۔ میں نے الحمد للہ کہ سنی شیعہ کی تفریق سے فہم حقیقت کی ایک بالاتر جگہ پائی ہے۔ میں نے ہمیشہ اتحاد کلمہ کی دعوت دی۔ حق و باطل کے مقام کی طہارت جماعت بندی کی گندگی سے آلودہ نہیں ہو سکتی۔ میں نہیں جانتا کہ سنیت کیا چیز ہے اور "شیعیت" کسے کہتے ہیں۔

یہ ہیں میرے عقائد یہ ہے میرا مسلک اور یہ ہے وہ بصیرت راسخہ جو کتاب و سنت نے مجھے عطا کی ہے۔ اسی بصیرت نے مجھ کو ہمیشہ فریقانہ نزاعات سے الگ رکھا اور وہی آج مجھ کو مجبور کرتی ہے کہ اپنے ان عزیز و محترم بھائیوں کے آگے جنھوں نے اپنی مصلحت پر غیروں کے مقاصد کو ترجیح دی ہے دشمنوں کی طرح نہیں بلکہ دوستوں کی طرح غیروں کی طرح نہیں بلکہ اپنوں کی طرح بڑوں کے حکم و غرور کے ساتھ نہیں بلکہ چھوٹوں کے عجز و نیاز کے ساتھ جمجمۂ سیعہ کا رجے سے نہیں بلکہ ایسے طرز و اسلوب سے اپنا اختلاف پیش کروں۔

## عود الی المقصود

کسی مولود کی حالت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے سب سے پہلی چیز اس کے مولد و منشار کا معلوم

کرنا ہے دیکھنا چاہیئے کیا حالات و اسباب تھے جن سے اس تحریک کی تخلیق وتکوین ہوئی۔ اس کا مبدا، خود انسان کے قلب کے اندر ہے جہاں ضرورتوں کا احساس اور حقیقتوں کا علم ہوتا ہے یا باہر کا القا ہے جس نے اپنی مصلحتوں کے لیۓ دوسرا نام اختیار کر لیا ہے پھر جس فضا میں اس تحریک کے مخلوق صناعی نے جگہ پائی ہے وہ کہاں کی فضا اور کس سرزمین کا موسم تھا۔ میدانی سرزمینیں تھیں جہاں بیج بویا جاتا ہے یا پہاڑوں کی چوٹیاں تھیں جن کی بلندی سے پانی برستا ہے۔ اس بارے میں دنیا کی معلومات حسب ذیل ہیں۔

شیعہ کانفرنس نے علی گڈھ کالج میں شیعوں کے متعلق کچھ مطالبات کیۓ بعض مطالبات تو واقعی مستحق قبول تھے اور بعض صحیح نہ تھے مثلاً شیعہ طلباء کے حقوق دینی اور اہتمام ضروریات دینیہ کے متعلق جو کچھ تھا اصولاً سب درست تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ مطالبہ بالکل بے معنی تھا کہ کہ کالج کا ایک سیکریٹری سنی ہو اور اس کے بعد دوسرا شیعہ! کالج کا سیکریٹری یقیناً شیعہ ہونا چاہیئے اور اگر ہمیشہ شیعہ ہی ہوتا رہے تو اور بہتر لیکن اس لیۓ کہ وہ مسلمان اور صاحب صلاحیت ہے نہ اس لیۓ کہ وہ شیعہ ہے۔

رہی کانفرنس کی یہ شکایت کہ ان کی مخصوص تعلیم دینیات کا کالج میں کوئی انتظام نہیں ہے تو وہ مجھے بتائیں کہ عام طور پر نفس مذہب اسلام کی تربیت ہی کا وہاں کونسا انتظام ہے۔ محض مسلمانوں کو پرچانے کے لیۓ اور ان سے چندے وصول کرنے کے لیۓ تو اس بستی کا ہر فرد مذہب مذہب قوم قوم پکارنے لگتا ہے اور جب مسلمانوں کے سامنے آکر کھڑا ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اور مذہب کی تربیت کا دکھ اس سے زیادہ اس دنیا میں اور کسی کو نہیں ہے لیکن اگر کالج میں جا کر ان کے اعمال کا تجسس کیا جاۓ اور دیکھا جاۓ کہ طلباء کے سامنے کالج کے ٹرسٹیوں کے عہدہ داروں نے کالج کے پروفیسروں نے مذہب کا اور مذہب کی عملی زندگی کا کون نمونہ پیش کیا ہے تو اس وقت

کھل جائے گا، کہ نمائش اور تصنع کے ان پردوں کے پیچھے کیا چھپا ہے۔ آہ مسلمانوں کی فریب خوردہ روحیں جو یقین کر لیتی ہیں کہ گھوڑے کے بالوں سے ریشمی چادر بنی جا سکتی ہے اور فسق و الحاد سے مسلمانوں کی اصلاح ہو سکتی ہے۔

شیعہ کانفرنس کے مطالبے کی فہرست کے سلسلے میں دوسرا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان شکایتوں کا اصلی مبداء کیا تھا وہ خود پیدا ہوئی تھیں یا پیدا کرائی گئی تھیں۔

یہ وہ وقت تھا جبکہ مسلمانوں کی تعلیم اور علی گڑھ کی مرکزیت و احاطہ اثر کے متعلق احکام و اوامر میں ایک انقلاب عظیم ہو رہا تھا اور جو چیز کل تک سب سے زیادہ محبوب تھی وہی اب سب سے زیادہ مردود و مبغوض ہو گئی تھی۔ واقعات مجموعی کے تغیرات نے اس کی ضرورت پیدا کر دی تھی کہ اگر تفریق و نزاع باہمی کی کوئی نئی بنیاد پڑ جائے تو حال کیلئے بڑی مصلحت اور مستقبل کیلئے سب سے بڑی بشارت ہوگی۔ علیگڑھ کالج اور شیعہ جماعت کے حقوق کا مسئلہ اس غرض کے حصول کے لئے سب سے بڑی بشارت ہوگی۔ علی گڑھ کالج اور شیعہ جماعت کے حقوق کا مسئلہ اس غرض کے حصول کے لئے یکایک کرشمہ دہ کار ہو گیا۔ ایک طرف علی گڑھ کی مرکزیت تعلیم کے احاطۂ اثر اور وحدت جذبات و خصائص پر بھی اس سے پورا اثر پڑتا تھا دوسری طرف اتحاد عمومی کے لئے بھی اس سے بڑھ کر اور کوئی فتنہ کارگر نہیں ہو سکتا تھا کہ جعلوا اھلھا شیعا کی پوری پوری تعمیل تھی۔

پس جیسا کہ قاعدہ ہے اور جیسا کہ ہمیشہ ہوا ہے مخفی و زیر حجاب رہنے والی قوتیں آگے بڑھیں اور اس مسئلہ کو پرورش کے لئے خاص طور پر اپنی گودوں میں اٹھا لیا۔

رفتہ رفتہ یہ مسئلہ یہاں تک بڑھا کہ بعض شیعہ ارکان و سرپرستان کالج نے کالج اور کالج کی اعانت سے دست برداری کا ارادہ کر لیا، ہز ہائینس نواب صاحب رامپور نے تار کے ذریعہ اپنی علیحدگی کی اطلاع دی اور جب ایک وفد ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے مطالبات کی فہرست نکال کر پیش کر دی۔ اسی وقت یہ امر بالکل واضح ہو گیا کہ کون سی قوتیں اس مسئلہ کے اندر کام کر رہی ہیں۔

بہ ایں ہمہ اس وقت بھی میری یہی رائے تھی اور اب بھی ہے کہ خود ارکان کالج نے بھی اس بارے میں سخت غلطی کی۔ ان کی سب سے پہلی غلطی یہ تھی کہ مطالبہ پیش کرنے والوں کے حق و اہمیت سے صاف صاف انکار کرنا شروع کر دیا کبھی کہا کہ اس طرح شکایت کرنا اور جواب مانگنا بالکل ناقابل التفات ہے۔ ہمارے ٹرسٹیوں میں شیعہ ممبر بھی موجود ہیں اور وہی شیعوں کے وکیل ہیں۔ کبھی کہا کہ ہم نے دینیات کی ایک کمیٹی بنا دی ہے اور دینیات کی نگرانی کے لئے فلاں فلاں شیعہ حضرات ملازم ہیں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

حالانکہ یہ سب باتیں فتنہ کی تھیں ایسی ہی غلطیوں سے چھوٹی چھوٹی باتیں اہم بن جاتی ہیں کہ اُن سے اغیار فائدہ اٹھاتے ہیں اور تفریق کلمہ کا ایک بنا بنایا کھیل انہیں مل جاتا ہے پھر یہ شکایتیں بھی کیا تھیں جن کا پورا کرنا دشوار تھا اگر یہ پوری کر دی جائیں تو بہرحال اپنے عزیزوں اپنے ہی بھائیوں کو اس سے خوشی ملتی اور فرض کرو اگر ایک بھائی غلطی بھی کر رہا ہے تو تم غلطی مت کرو اسے مناؤ۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اپنوں سے روٹھ کر غیروں کی چوکھٹ پر چلا جائے

بہرحال اس بارے میں ارکان کالج نے بھی غلطی کی اور فرصت کو اپنے ہاتھوں ضائع کر دیا۔ یہاں تک کہ اس مسئلہ نے دوسرے دور میں قدم رکھا اور ایک علیحدہ شیعہ کالج بنانے کا خیال پیدا ہو گیا۔ صورت حال یوں قرار دی گئی کہ علی گڈھ کالج صرف سنیوں کا کالج ہے اس لئے چاہئے کہ شیعوں کا بھی ایک الگ کالج ہو۔

## ڈیپوٹیشن

رفتہ رفتہ تمام ابتدائی مراتب طے کئے گئے اور بالآخر مسئلہ اس حد تک پہنچ گیا کہ ۱۴؍ جنوری کو زیر قیادت نواب صاحب رامپور ایک ڈیپوٹیشن سر جیمس مسٹن کی خدمت میں حاضر ہوا اور

ایڈریس پیش کیا۔

ایڈریس کے جواب میں ہز آنر نے جس عدیم النظیر جوش و محبت کے ساتھ اس تجویز کا خیر مقدم کیا اور جس طرح گورنمنٹ کی اعانت و شرکت کے والہانہ و مخلصانہ وعدے کیئے ان کو پڑھ کر مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوا۔ کیونکہ تعجب ہمیشہ غیر متوقع نتائج پر ہوتا ہے اور یہ چیز پہلے سے معلوم تھی

ایڈریس کا جواب پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تجویز میں ہز آنر کے لیئے کچھ ایسی محبوبیت و مطلوبیت ہے کہ بار بار اس کی تعریف کرتے ہیں اور بار بار اعانت کا وعدہ کرتے ہیں۔ بار بار کام کرنے والوں کو داد دیتے ہیں اور پھر بھی جی نہیں بھرتا اور یہی کہتا ہے کہ ایک بار اور کہہ دیجئے مَنْ اَحَبَّ شَیْئاً اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ

آخر میں انہوں نے ایک افسر اعلیٰ کی طرح صرف اپنی گورنمنٹ کی زیادہ سے زیادہ ممکن اعانت کا وعدہ ہی نہیں کیا بلکہ ایک سچے مربی اور سرپرست کی طرح کام کرنے کی تدبیریں اور ان کے قیمتی نکتے بھی سمجھا دیئے۔

شیعہ کالج کے لیئے چالیس لاکھ کا سرمایہ تجویز کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ رقم جلد نہیں جمع ہو سکتی اور اس لیئے جلد کالج بھی نہیں بن سکتا۔ مگر تاخیر کا یہ پہلو ہز آنر کو گوارا نہیں انہوں نے فرمایا کہ چالیس لاکھ کا انتظار نہ کیجئے۔ اگر بارہ لاکھ بھی جمع ہو جائیں تو کام شروع کر دیجئے ۔۔۔ اس سے بھی زیادہ بے خطا تدبیر یہ بتائی کہ

"اپنی جماعت کے بڑے بڑے زمینداروں سے ان کی مالگذاری میں سے
کوئی مقررہ رقم کالج کے لیئے منظور کرا لیجئے وغیرہ وغیرہ"

ایڈریس کے جواب میں اس زریں مشورے کے پڑھنے کے ساتھ مندرجہ ذیل واقعات

کر بھی پیش نظر رکھ لیجیے۔

(۱) سندھ کے مسلمانوں نے اپنی تعلیم و ترقی کے لئے یہی مالگذاری والی تجویز پیش کی تھی۔ ایجوکیشنل کانفرنس نے بار بار اس کے لئے رزولیشن پاس کئے۔ مگر چار سال ہو گئے اب تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

(۲) بمبئی میں ایک مسلمان نے آٹھ لاکھ روپیہ گورنمنٹ کو دیے کہ گورنمنٹ اپنے عام اصول کے مطابق اتنی ہی رقم خود بھی دے اور شیعہ کالج کی طرح کسی بڑی سرکاری زبان سے اس کے لئے چند الفاظ کہلوا کر ایک عمدہ کالج کی بنیاد پڑ جانے دے۔ مگر گورنمنٹ بمبئی نے جنگ کی وجہ سے سر دست معذوری کا اظہار کیا ہے۔

(۳) اسی طرح بنگال میں سالہا سال سے ایک کالج کا مسئلہ در پیش ہے مگر ہنوز روز اول کا مضمون ہے۔

مجوزہ شیعہ کالج کی تحریک کی تولید اور نشو و نما کی یہ اجمالی سرگذشت تھی اس کے مطالعہ سے ہر صاحب عقل سمجھ سکتا ہے کہ اس تحریک کا مبداء و مولد کیا ہے اور سوال اصلی ایک نئے کالج اور برادران شیعہ کی خواہشوں کا ہے یا ان مقاصد مخفیہ کا جن کے لئے اس تحریک کو آلہ بنایا گیا ہے

# الساکت عن الحق شیطان اخرس

ایک طرف اس تحریک کی تولید و نشو و نما کا یہ حال ہے دوسری طرف علی گڈھ کے ارکان کالج کا موجودہ رویہ ہے اور ضروری ہے کہ چند کلمات اس کی نسبت بھی کہے جائیں۔

علی گڈھ کالج کے ارباب حل و عقد نے ہمیشہ دعویٰ کیا ہے کہ ہمارا موضوع مسلمانوں کی تعلیم اور علی الخصوص اعلیٰ تعلیم ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق ایک خاص اصول وضع کیا

ہے اس اصول کو وہ ایک قومی مرکز کے قیام وتکمیل کے نام سے پکارتے ہیں پھر دعویٰ کرتے ہیں کہ علی گڈھ کالج ہی مسلمانوں کا قومی مرکز ہے۔

ان کی اصل کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کو دنیا بھر کی چیزوں کا مرکز ثابت کردیں لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ہوتی تو مجبوراً "تعلیمی مرکز" قرار دینے ہی پر اکتفا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو چاہیئے دین و دنیا کا اور کوئی کام نہ کریں صرف کالج ہی کو پوجیں اگر وہ ایسا نہ کریں گے اور کاموں میں لگ جائیں گے تو مرکز قائم نہ ہوگا۔ اور مرکز قائم نہ ہوا تو پھر قوم قوم نہیں!

نیز ان لوگوں نے اپنی تقلید اور پرستش کا ایک نیا بت بنایا ہے اور اس کا نام رکھا ہے "سرسید کی پالیسی" یونانی علم الاصنام میں ہر طاقت کے لئے ایک مخصوص بت ہوتا تھا یہ نہیں ہوتا تھا کہ رزق کا دیوتا علم کے دیوتا کے کاموں میں مداخلت کرے۔ یا کیوپڈ وینس کی حکومت میں خلل ڈالے۔ لیکن ان لوگوں نے صرف ایک ہی بت بنایا ہے اور اس کے اختیارات اس قدر وسیع ہیں کہ علم و عمل کا کوئی گوشہ اس سے خالی نہیں سرسید مرحوم کی پالیسی کا اس بارے میں یہ حال تھا کہ انھوں نے پہلی لکھنؤ کانفرنس میں خاص رزولیشن پیش کیا کہ مسلمان اپنی تمام متفرق اور علیحدہ علیحدہ کوششوں کو ترک کرکے ایک مکمل تعلیمی مرکز بنائیں ورنہ ان کی کشتی طوفانِ ہلاکت سے نہیں نکلے گی چنانچہ وہ ہمیشہ دوسری کالجوں سکولوں اور مستقل تعلیمی کوششوں کی مخالفت کرتے رہے حتیٰ کہ ایک مرتبہ ان کو اس مسئلے کے متعلق اس قدر جوش آگیا کہ بہت سے لوگ اس کے متحمل نہ ہوسکے۔ مرحوم سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ نے پھبتیاں اڑائیں اور لوگ جلسہ سے اٹھ کر چلے آئے۔

ان تمام امور کے علاوہ سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو اتحاد و جمعیت کلمہ کا داعی قرار دیتے ہیں اور اسی بنا پر شیعہ مطالبات کا ایک بڑا حصہ منظور نہیں کیا پس اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مجوزہ شیعہ کالج کا وجود ان کے عقائد مسلمہ اور ان کے امام معصوم کے مذہب کے

لحاظ سے کیا حکم رکھتا ہے۔ کیا علی گڑھ کالج کے اندر دو مسجدیں بنانا تفریق تھا مگر شیعہ کالج کی بنیاد رکھ کر آب و ہوائے تفریق میں آئندہ نسلوں کو تیار کرنا تفریق نہیں ہے؟

اگر اس کا جواب وہی ہے جو ہونا چاہئے تو میں پوچھتا ہوں کہ علی گڑھ پارٹی نے اس وقت تک اس کی مخالفت و اصلاح اور کلمۂ حق کے اعلان کے کیا کاروائی کی ہے۔ یہ کیا ہے کہ علی گڑھ کالج کی بستی کا ہر فرد یکسر بہرا گونگا بن گیا ہے۔ کیوں تمہارا مسلکِ مرکزیت اب کہاں فنا ہو گیا تمہاری دعوت قومیت کس گوشہ میں دفن کر دی گئی۔ تمہاری چہل سالہ محنت اکارت جا رہی ہے۔ تم کہاں چھپ گئے ہو۔ تمہاری شریعت تعلیم ذبح کی جا رہی ہے۔ تمہارے گلوں میں پھندے کیوں پڑ گئے ہیں؟

یا سبحان اللہ اگر ایک مسلم اللہ اور رسول کے نام کی دعوت دے تو اس پر اپنی کانفرنس کا دروازہ بند کرنا چاہتے ہو اور کہتے ہو کہ سب سے پہلے ممبر سید پر ایمان لانے کا اقرار کرے اس کے بعد وہ تقریر کر سکتا ہے۔ لیکن آج سرے سے علی گڑھ کالج کی اصلی بنیاد ہی منہدم کی جا رہی ہے اور مرکزیت کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں مگر تم سب پر نفاق کی موت طاری ہو گئی ہے۔ تم کہتے ہو کہ ہمارا دائرہ عمل قومی تعلیم ہے سیاست نہیں، اچھی بات ہے لیکن اب بتلاؤ کہ یہ جو کچھ ہے سیاست ہے یا تعلیم! اگر تعلیم کا مسئلہ ہے تو تمہاری قومیت اور قومی تعلیم کی لن ترانیاں کہاں گئیں؟

تم بھلا ان سوالات کا کیا جواب دو گے۔ میں خود ہی حقیقت کو بے نقاب کر دیتا ہوں تاکہ ہر انسان تمہاری اصلی صورت دیکھ لے اور اسے معلوم ہو جائے کہ حق سے تمہارا رشتہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو تمہارے اعتقاد بدلے ہیں اور نہ تمہارے مسلک میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے۔ بلکہ ہے یہ کہ تمہارے صوبہ کا سب سے بڑا حاکم علانیہ شیعہ کی تحریک

کا ساتھ دے رہا ہے یہ دیکھ کر تمہارے ہوش و حواس غائب ہو گئے ہیں۔ تم ڈرتے ہو کہ اگر ہم نے فنا کبھی زبان ہلائی تو عجب نہیں کہ دربار شاہی سے مردود ہو جائیں۔

یہ ہے تمہاری حق پرستی یہ ہے تمہاری صداقت اور یہ ہے تمہارے مدت العمر کے دعووں کی کائنات! آہ ایک انسان کے ڈر نے تمہاری روح پر ایسی ہلاکت طاری کر دی ہے کہ تم اس چیز کو زبان سے نہیں نکال سکتے جس کو تمہارا دل حق کہہ رہا ہے۔ اے سست ایمانو تم ان سے ڈرتے ہو مگر افسوس کہ تمہارے دل سے خدا کا خوف اس طرح نکل گیا ہے جس طرح کبوتر اپنے گھونسلے سے اڑ جاتا ہے۔

## خاتمۂ سخن

بالاختصار اپنے وہ خیالات ظاہر کر کے جو مجوزہ شیعہ کالج کی تحریک اور اس کے نشوونما کے اسباب و بواعث میں سے ہمارے پیش نظر ہیں۔ اب آخری سوال یہ سامنے آتا ہے کہ موجودہ حالت میں کیا کرنا چاہیے۔

(۱) ہمارا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ مسلمان محمڈن کالج کے سوا اور کوئی کالج قائم نہ کریں بلکہ جس قدر بھی کالج بڑھیں بہتر ہے ساتھ ہی "مرکز" اور تعلیمی مرکز کا خیال بھی اصلاً غلط نہیں ہے مگر جو مطلب ارباب علی گڑھ نے سمجھا ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے۔ دنیا کی غلطیاں اس لیے غلط نہیں ہوتیں بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سچ کو جھوٹ سے ممزوج و آلودہ کر کے دکھلایا جاتا ہے اور مخلوط سچ، خالص جھوٹ سے کہیں زیادہ فتنہ پرداز ہے۔

یقیناً اصول مرکزیت ایک قدرتی اور صحیح ترین چیز ہے اور یہ بھی غلط نہیں کہ علی گڑھ کالج مسلمانان ہند کے لیے "مرکز" کی حیثیت پیدا کر چکا ہے، مگر ساتھ ہی اس کے یہ معنی بھی نہیں

کہ اور کوئی مفید کام کیا ہی نہ جائے۔ خوارج نے کہا تھا اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ اس پر حضرت امیرؑ نے فرمایا کَلِمَۃُ الْحَقِّ یُرِیْدُ بِھَا الْبَاطِلُ ان کا یہ کہنا کلمۂ حق ہے۔ مگر مقصود باطل ہے۔ رسو اصولِ مرکزیت کا بھی یہی حال ہے۔

(۴) اسی طرح اس سے بڑھ کر خوشی کی اور کون بات ہو سکتی ہے کہ ایک نیا کالج مسلمانوں کے لئے اور قائم ہو۔ لیکن کالج قائم کرنے کے یہ معنی نہ تھے کہ باہمی اختلاف و نزاع کی زمین تیار کر کے اس پر غیروں کے ہاتھوں تخم ریزی کرائی جاتی۔

چاہیئے تھا کہ علی گڑھ کالج کی نزاع سے الگ ہو کر محض خدمتِ قومی اور جذبات صالحۂ اسلامیہ پر اس کی بنیاد رکھی جاتی اس صورت میں یہ سوال صرف ایک نئے کالج کا ہوتا اور کوئی راست باز انسان ایسا نہ ہوتا کہ اس تحریک کی پرجوش دل سے تائید نہ کرتا۔ مگر اب یہ کالج کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ افتراقِ امت و انشقاق ملت کے فتنۂ خوابیدہ کے ایقاظ و ازدیاد کا مسئلہ بن گیا۔

میں داعیانِ شیعہ کالج سے یہ نہیں چاہتا کہ وہ اس تحریک کو چھوڑ دیں بلکہ نہایت عاجزی اور کمال منت کے ساتھ صرف دو جزئی تبدیلیوں کا خواستگار ہوں اول یہ کہ وہ جو کچھ چاہیں کریں مگر خدا کے لئے اس کا نام "شیعہ کالج" نہ رکھیں۔ کیونکہ ان انسانوں کے لئے جو قرآن نامی کتاب کے ماننے والے اور محمد بن عبداللہ کے پیرو ہیں اس زمین پر بجز اسلام کے اور کوئی نام نہیں اب تک اس بدعت سے خاکِ ہند محفوظ رہی ہے۔ پس خدارا افتراق و انشقاق کی ہلاکتوں کا ایک نیا دروازہ نہ کھولیں۔

بزرگانِ شیعہ کانفرنس و حضرات مجلس منتظمہ کالج کو غور کرنا چاہیئے کہ اب تک ہندوستان میں کوئی کالج اور مدرسہ کسی خاص فرقہ کے نام سے قائم نہیں ہوا ہے اور وہ نہ صرف تفریق و انشقاق

اور تہذیب و تخرّب کی جھیل کو بھرنے کی جگہ زیادہ وسیع کر رہے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ نام اور انتساب کے ایک نئے فتنہ کی بنیاد رکھنے والے بن رہے ہیں۔ نئے نئے فتنوں کی راہ کھولنے کے لئے حضرت امیرؑ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ خطبۂ نہروان نہج البلاغت میں آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ میں حضرات ائمۂ کرام علیہم السلام کی تصریحات مندرجۂ اصول کافی وغیرہ سے ثابت کرنے کے لئے تیار ہوں کہ جس طرح سنیوں کے لئے صرف اسلام ہی کا نام سچا ہے اسی طرح برادرانِ شیعہ کے لئے بھی خدا کے قرار دیئے ہوئے اس نام کے سوا اور کوئی نام شرعی نہیں ہو سکتا۔ اس طرح وہ اپنے مقاصد میں سے کسی چیز کو بھی نہیں کھوئیں گے مگر تمام مسلمانوں پر ایک عظیم الشان احسان و تفضل کرنے کا ذریعہ ہوں گے۔ ایسا احسان جس سے بڑھ کر اور کوئی احسان نہیں ہو سکتا اور سوچیں تو ان کا یہ احسان خود انھیں کے وجود کے لئے ہے۔

دوسری عاجزانہ التماس یہ ہے کہ جس طرح انہوں نے اس کی تعلیم کا دروازہ قابل تحسین فیاضی کے ساتھ تمام مسلمانوں کے لئے کھلا رکھا ہے اسی طرح اعانت کرنے اور اس کی بنا میں شریک ہونے کا دروازہ بھی اپنے بھائیوں پر بند نہ کریں اور یہ تخصیص نہ رکھیں کہ صرف شیعوں ہی کا روپیہ اس کے لئے قبول کیا جائے گا۔ بلکہ اگر غیر شیعہ مسلمان بھی اس خدمت کا شرف حاصل کرنا چاہیں تو اسے نامنظور نہ کریں اور نہ کوئی اندیشہ کریں۔ اگر بقول ارکانِ شیعہ کانفرنس شیعہ ارباب فیض کا لاکھوں روپیہ محمڈن کالج علی گڈھ سے شیعہ حقوق کو حاصل نہ کرا سکا تو پھر چند غیر شیعوں کا تھوڑا سا روپیہ کیوں مجوزہ کالج کی خصوصیت و تصرف میں خلل ڈال سکے گا۔

یہ خاتمۂ سخن ہے وقت نہیں کہ اس داستان کو طول دیا جائے ورنہ یہ حکایت بڑی ہی درد انگیز ہے اور بہت سی راتوں کو آنکھوں میں کاٹ دینے والی ہے۔ اللہ دلوں کا بھید جاننے والا ہے اور اس کی نظر سے کسی کا دل چھپا نہیں وہ بہتر جانتا ہے کہ مجوزہ شیعہ کالج کے متعلق جو

کچھ میرے قلم سے نکل رہا ہے یہ فریقانہ تعصب کی خباثت اور جماعت بندی کے ناپاک حسد کا نتیجہ ہے یا محض کلمۂ اسلام کی محبت کا جس میں کسی فریقانہ ایں و آں کی گنجائش نہیں اور محض اپنے عزیز بھائیوں کو ایک سخت ٹھوکر سے بچانے کا اضطراب ہے جو اس حد سے کوسوں آگے گذر چکا ہے، جہاں شیعہ سنی کی تمیز کا نام و نشان ہو۔

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

# نشۂ شام کی نصف شب

○

اخلاقی عقائد کی بہت سی گمراہیاں ہیں جن کے الفاظ لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گئے ہیں اور موقع پر ان کا استعمال نہایت کثرت سے کیا جاتا ہے۔ منجملہ ان کے ایک یہ خیال بھی ہے کہ صلح جنگ سے اور امن شورش سے بہر حال بہتر ہے۔ لیکن غور کیجئے تو اس خیال میں جس قدر سچ ہے شاید اس سے کسی قدر زیادہ مقدار میں جھوٹ بھی ہے، یہ سچ ہے کہ شورش سے سکون بہتر ہے مگر کس شورش سے سمندروں کے تلاطم اور ہواؤں کی خوفناک موجوں کی شورش سے نہ کہ اس زندگی کی شورش سے جس کے جاتے ہی موت کے سکون کا پیام آجاتا ہے۔

لکھنؤ کے ان جلسوں میں بھی امن کم اور شورش زیادہ تھی، صلح کا خیال محدود تھا اور جنگ کی طلب وسیع امن اور سکون اسٹیج کے کنارے تک بھی خالص نہ تھا۔ مگر جنگ کے ولولے سے ہال کی پوری فضا گونج گونج اٹھتی تھی لیکن اس عجب سرائے بوقلموں میں ایک ہی وقت کے اندر سب کو خوشی نہیں ہو سکتی ہمیشہ شادی و غم میں باہم تصادم رہا ہے۔

دنیا میں رنج و خوشی اور شادی و غم کی حقیقت یہ ہے کہ پہلے میں "حاصل" کی مسرت ہوتی

ہے اور دوسرے میں "رفتہ" کا افسوس۔ غم کی تمام مثالوں کو ایک ایک کرکے ذہن میں لائیے ہر مثال میں آپ دیکھیں گے کہ کوئی نہ کوئی شئی آپ سے جاتی رہی ہے۔ اور جانے ہی کا نام "غم" ہے۔

پھر اگر یہ سچ ہے کہ خوشی کسی شئی کے حاصل ہونے کا نام ہے تو آپ کو جب کبھی کوئی چیز ملے گی ضرور ہے کہ وہ کسی کے ہاتھ سے نکلی ہو۔ عالم کائنات میں کوئی چیز بھی بیکار پڑی ہوئی نہیں ہے کہ آپ اٹھالیں ہر چیز کسی نہ کسی جگہ جڑی ہوئی ہے آپ کو اٹھا لینے سے نہیں ملے گی بلکہ توڑنا پڑیگا آپ کا دامن بھرے گا۔ مگر کسی کی آستین ضرور خالی ہوگی۔ آپ پھولوں کی سیج پہ لیٹ کر خوش ہوتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی باغ اجڑا ہے جب کہیں جاکر آپ کا بستر آباد ہوا ہے۔

عرفی شیرازی جو بجائے شاعر ہونے کے ایک اسرار شناس حکیم تھا اس نکتہ کو کہہ گیا ہے

زمانہ گلشن عیش کرا بہ یغما داد — کہ گل بہ دامن دستہ می آید

مرزا غالب نے ایک دوسری بات کہی ہے مگر آپ اسی نظر سے دیکھیں ؎

ہر جادہ کہ از نقش پے لشت کہ گلشن — جا کیست بجیب ہوس انداختۂ ما

لکھنؤ کے جلسہ میں جو کچھ ہوا وہ دراصل ایک ابتدائی معرکۂ جنگ تھا جس نے مسلمانوں میں سب سے پہلے ایک نئے حریف مقابل کو دنیا سے روشناس کیا قوم خوش ہے کہ اس نے طاقت حاصل کی لیکن جن سے چھین کر حاصل کی ضرور ہے کہ وہ غمگین ہوں کوئی وجہ نہیں کہ آپ ان پر معترض ہوں

دل از من دیدہ از من آستین از من کنار از من

لیکن جو کچھ ہوا اس پر محض ایک سرسری نظر ڈال کر نہیں گزرنا چاہیے، آج کل ہماری نظریں بحیرہ مارمورا اور دردہ دانیال کے جنگی طوفانوں کی طرف لگی ہوتی ہیں اور جی نہیں چاہتا کہ اور کسی طرف دیکھیں تاہم ہم ناظرین سے کہیں گے کہ وہ ان چند ہلکی لہروں سے بھی اغماض نہ کریں جو ۲۶ دسمبر ۱۲ء کو گومتی کی خاموش دساکن سطح میں اٹھی ہیں۔

# حدیث الغاشیہ

مرغِ اسیر کی گرفتاری اور دنیا و بے خبری تغافل شعاری کا مرثیہ ہمارے شعراء کی بدولت ایک عجیب و دلچسپ داستان بن گئی ہے۔ فرض کیجیے کوئی خوش نصیب طائر اپنے ہزاروں آرزوؤں اور تمناؤں سے پامال ہو اور اس کا منفحۂ ضعیف آپ کی مضبوط مٹھی میں اس طرح دبا ہو جیسے فولادی انگلیوں کو اور سخت کیجیے تو غریب کی کاغذی پسلیاں ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ لیکن یکایک آپ کو ٹھوکر لگی اور اب جو دیکھتے ہیں تو ہاتھ خالی ہے اور وہ بدبخت سامنے کے کسی درخت کی ٹہنی پر بیٹھا دبکا پڑا سہما ہوا چہچہا رہا ہے۔

بعینہ یہی حال فرنگیوں کی بے چارے اعلان کا تھا۔ وہ صیاد ان سخت پنجہ تحفوں نے قومی آزادی اور جماعتی دولت کی سنہری چڑیا کو بیسوں اپنی آہنی انگلیوں میں دبا کر مقید کر رکھا تھا اور استبداد و لرزت کا یہ عالم تھا [illegible] اجازت نہ تھی اب چشمِ تر اور نگاہِ خونبار سے دیکھ رہے تھے کہ ایک ہی جست میں برق رفتار ان کے قبضے سے نکل گئی ہے اور وہ ہاتھ جو کل تک کسی کے پر و بال متذبذب سے مجبور رہتے تھے اب خالی ہیں تاکہ جی بھر کے اپنی محرومی اور بے بسی پر ماتم کر لیں۔

بہر حال انقلابِ حالت نے لیڈروں کے کیمپ میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ پچھلی جنگ اور ہزیمت سامنے تھی اور آئندہ کی خوفناک ہزیمت دیکھ سامنے اس لیڈری کے سومنات کا ہر بت لرزاں و ترساں تھا۔ [illegible] ایک رات درمیان میں باقی تھی اور جو کچھ ہونا تھا ہو رہا تھا کہ طلوعِ آفتاب [illegible] ہی انجام پارلیمنٹ کے سب سومنات کے چھوٹے بتوں نے دیکھا کہ ہمارا اعلیٰ [illegible] کچھ کام نہیں دیتا تو

ان میں جو سب سے [illegible] آدمی تھا کہنے لگا کیا [illegible] سے نہیں کہا کرتا

تھا کہ اپنے (اس آخری) معبود ہی کی تسبیح و تقدیس کیوں نہیں کرتے (جو
تمام مشکلوں کو حل کرنے والا ہے) (۳۷-۱۸۰)

یہ اس طرف اشارہ تھا کہ طاقتوں اور قوتوں کے اس بت اعظم سے کیوں نہیں خواستگار اعانت ہوتے جس کی سحرکار آنکھوں کی برق بخشی سے اس مندر کے تمام چھوٹے بڑے سنگی بت طاقت حاصل کرتے ہیں۔

(پھر) کیا تم نے "لات" اور "عزیٰ" نامی بتوں کو نہیں دیکھا ہے اور وہ جو
ایک سب سے بڑا (تیسرا بت اور ہے) (جس کا نام) منات ہے

دعا مستجاب ہوئی اور بالآخر اعمال و اشغال مخفیہ کی یہ عظیم الشان رات اس طرح شروع ہوئی کہ سب سے پہلے اس مقدس عمل تسخیر کو انجام دیا گیا جس کا ظاہری و سادہ نام ہی لوگوں کی زبان میں "ڈنر" ہے۔

(۴)

راویانِ صداقت شعار اور ناقلانِ عدالت آثار روایت کرتے ہیں کہ یہ عمل ساڑھے بارہ بجے تک بجمیع شرائط جاری رہا اور جو کچھ کہ ہوا قابلِ اظہار نہیں۔

"تسخیر کواکب" کے عمل کی مشکلات آپ کو یا مجھ کو کیا معلوم، ان سے پوچھئے جنھوں نے اس فن کے علم و عمل دونوں میں دستگاہیں حاصل کی ہیں۔ پھر مقصد جیسا اہم ہوتا ہے اتنا ہی عمل بھی قوی ہوتا ہے۔ اس عمل میں بڑی مشکل یہ تھی کہ قران السعدین نہیں بلکہ "قران الضدین" کا سامنا کرنا تھا۔ مریخ اور زہرہ دونوں کو جمع کرنا تھا اور مشتری کے گرد وہ حلقہ کھینچنا تھا کہ زحل کے قربان سے باہر قدم نہ نکالے۔ بہرحال حال کا پنجہ سخت تھا۔ مریخ اور زہرہ دونوں کو ایک دائرے میں جمع کر ہی کے چھوڑا یہاں تک کہ زہرہ بے با ایں ہمہ ناز و عشوہ و غمزہ سے

لیا گیا کہ عین حضرتِ مریخ کے سامنے اپنا رقص ہوش افگن نظارگیان ارض کو دکھلائے گی۔

اس صحبتِ فلکی میں تو یہ عجائب و غرائب انجام پا رہے تھے اور ادھر زمین کے بسنے والوں کی قسمت سر پیٹ رہی تھی۔

بگذرز سعادت و نحوست کہ مرا ناہید بغمزہ کشت و مریخ بہ قہر

اصل یہ ہے کہ پہلے اجلاس میں جن بعض زبان آورانِ آزادی سے سرگرم تقریریں کی تھیں ان کی نسبت لیڈروں نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ ابھی ان سنہری لکڑیوں کے لئے آگ کی آزمائش باقی ہے

۳۰ دسمبر کے جلسہ میں جبکہ لفظوں کی جگہ زبانوں سے شعلے نکل رہے تھے تو راجہ صاحب محمود آباد ہمارے مجلس طراز دوست مسٹر محمد علی کو مخاطب کرکے دل ہی دل میں ضرور کہتے ہوں گے۔

مجلس طرازیوں کے بچھاؤں گا سب مزے تم اتفاق سے کہیں تنہا اگر ملے

بالآخر انتظار میں زیادہ دیر نہیں لگی اور بہت جلد تنہائی کا گوشۂ خلوت ہاتھ آگیا جلوت کے اسرار و نیاز محرمانِ مجلس تک تو پہنچے نہیں ہم ایسے غیروں کو کیا خبر تاہم یہاں تک تو تمام راوی متفق ہیں کہ راجہ صاحب نے اپنی شکست کا اعتراف کیا اور کہا کہ اگر ہرانا ہی چاہتے ہو تو ہار جانے کا اقرار کرتے ہیں اب اور کیا چاہتے ہو۔ ع بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است

کہا جاتا ہے کہ راجہ صاحب نے کہا تھا کہ جب تک مسٹر محمد علی رام نہ کئے جائیں گے کچھ نہیں ہوگا۔ یہی سبب ہے کہ اس خلوتِ شب کی بارات کا دولھا انہی کو بنایا گیا اور رات بھر سہرے کی آرائش و تزئین میں صرف ہوگئی۔ خیر ہم کو اس سے کوئی بحث نہیں ہم تو صبح کی چشمِ خمار آلود اور زلفِ پریشان کی ادائیں دیکھنے والوں میں تھے اور یہ جو اپنے حصہ میں آیا تو اس پر شاکی بھی

نہیں ہمارے دوست کے ہموطن یوسف علی خاں ناظم کا فلسفہ اس موقع کے لئے ہمیں یاد آتا ہے

ادائیں شب کی تو سب لوگ دیکھتے ہیں مگر ہم ان کی بگڑی ادائیں سحر کو دیکھتے ہیں

یہ تو اس شبِ وصل کی شام تھی اس کے ذکر کو کہیں جلد نپٹایئے کیونکہ اصلی پر لطف حصہ تو اس کے بعد آتا ہے جبکہ رندانِ بادہ گسار نے "حجلۂ نیم شبی" آراستہ کیا اور موٹر کاریں بھیج بھیج کر ایک ایک غمزدۂ پیمان کی قسمتِ خفتہ کو شیشۂ بادہ گساری سے بیدار کیا گیا ؎

وقت آں نیست کہ بہ حجرہ بخوابی تنہا

چشمِ تصور سے کام لیجئے کہ دسمبر کے آخری ہفتہ کی سرد راتیں ہیں۔ لیلائے شب کی زلف کمر سے گذر چکی ہے۔ ایک کنجِ خلوت میں صحبتِ بادہ پرستی گرم ہے اور گرم گرم سازشوں کی۔

دھری شراب ہے بیٹھے ہیں جابجا ساقی

قبل اس کے کہ آپ کسی مدعیٔ زہد کو الزام دیں، آپ ہی کو منصف بناتے ہیں کہ بھلا ایسی توبہ شکن اور ولولہ انگیز صحبت میں اگر ہمارے کسی دوست کی "توبہ" نے لغزش کھائی اور اس جامِ عہد فراموش کو منہ سے لگاتے ہی بنی جو کسی کے دستِ طلائی نے بھیج دیا تھا انصاف کیجئے کہ آخر پہلو میں دل کس کے نہیں ہے اور پھر یہ تو وہ مقام ہے کہ "ہاروت و ماروت" کے قدم بھی ڈگمگا گئے تھے ؎

ساقیا مرنج از این عالم چہ انبہاست

خود صحبت آزمایانِ شبینہ کا بیان ہے کہ بادہ گساری رات کے دو بجے تک جاری رہی۔ اللہ اللہ جاڑے کی راتیں اور پچھلے پہر کی یہ اصرار صحبتیں! آپ الزام دلانے کی فکر میں ہیں اور "رات کے دو بجے" کے لفظ سے نہیں معلوم کیسے کیسے خیالات میرے دماغ میں گذر رہے ہیں۔ رات کی تاریکی پچھلا پہر رندانِ شاطر و کہنہ مشق کا ہجوم اور بعض نوجوان و ناآموزدہ حریفانِ حریت

صبر شغل جی پہ بنی کا یہ عالم! اب کیا کہوں کہ کیا کہنا چاہتا ہوں۔

مست بر بستر من افتد و رندان دانند ۔ عالمِ مست کہ بر بستر ہشیار افتد

اب ادھر کی سنیے۔ یہاں تو شب زندہ داران بادہ گساری صبح خمار کی اعضا شکنیوں میں کروٹیں بدل رہے تھے ادھر صبح آٹھ بجے ہی سے اجلاس کا ہال تماشائیانِ بزم سے بھر گیا۔

ایک دیوانہ پہلے حصولِ مقصد کے لئے جو تدابیر گونا گوں دو قطبوں اختیار کی گئی تھیں منجملہ ان کے ایک تدبیر خاص یہ تھی کہ جلسے کے لئے ٹکٹ مقرر کر دیا گیا اور یہاں تک ہمیں بھی اتفاق تھا لوگ آج اسٹیج پر پردے سے جو پتلیاں نکلنے والی تھیں وہ بغیر کے آموختہ یاد کیے ہوئے ایکٹروں کی طرح ایک تماشے سے زیادہ نہ تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ٹکٹ کے بدلے بغیر کے درخواست پر ٹکٹ گھر کی کھڑکی کا اعلان کیا گیا تھا۔ لیکن جو لوگ وہاں پہنچتے تھے ان سے کہا جاتا تھا کہ راجہ صاحب کے ہاں جائیے۔ راجہ صاحب کے ہاں سے صدا اٹھتی تھی کہ جہاں سے آئے ہیں اسی طرف پھر جائیے۔

یاں سے واں اور واں سے یہاں حکم ہوا وصل کی شب ۔ ہم اٹھاتے ہی بچھاتے پھرے بستر اپنا

حالانکہ یہ سب انتظامات فضول تھے کیونکہ رات کے قرار داد کے بعد سب مطمئن ہو گئے تھے کہ جب میدان میں باہم صلح کر لی ہے تو میدان جنگ میں لڑائی کا اب کیا خوف!

"... پاشا جب ساکت ہو گیا تو کامل پاشا بے فکر ہو گیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ فوج کی اصلی قوت اس کے ہاتھ میں ہے۔"

غرض آٹھ بجے سے جلسہ منعقد اور اصحاب حل و عقد کا منتظر تھا۔ لیکن کسی بزرگ کا پتہ نہیں۔ اور جب لگ تو کیونکہ جس جنگ کے لئے یہاں فوج جمع تھی اس کی صلح رات کے دو بجے کی تاریکی میں انجام پا چکی تھی۔ بہر حال اندھیرے کمرے میں دیوانہ مشتاقِ دید کی بے صبری عجب

کش مکش تھی۔

ہوتا ہے اژدہام تمنا اسی قدر ہوتی ہے جتنی دیر کشودِ نقاب میں

خدا خدا کرکے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بطورِ "مقدمۃ الجیش" کے تشریف لائے گو خود ان کا آنا "جلوۂ یوسفی" نہ تھا، لیکن اپنے ساتھ "نسیم پیراہن" کی بشارت ضرور رکھتا تھا۔ انھوں نے سب سے پہلے صحبتِ نیم شبی کا اعلان کیا اور "جنگل میں منادی کرنے والے یوحنا" کی طرح خبر دی کہ "راہ صاف کرو کیونکہ "آسمان کی بادشاہت" اب قریب ہے"۔

یہاں تک کہ دس بجے صدہائے منتظر، اور صدہائے مضطرب کی صفوں سے گذرتی ہوئی ارباب حل و عقد کی قطار جلوہ فروش ہوئی اور حجلۂ سازش کے تمام عروسان شب زندہ دار ایک ایک کرکے نظر نوازِ بزم و انجمن ہوئے۔ چہروں نے پہلی ہی نظر میں رمز فروشی کی کہ رات بھر میں رنگ بدل چکے ہیں ؎ شب تو شراب خوردہ با تو صد ارغوانیہاست

انھیں میں ہمارے شیوہ طراز دوست مسٹر محمد علی بھی تھے۔ صحبتِ نیم شبی کا خمار آنکھوں میں اور شب بیداری کی فسردگی چہرے پر، جی میں آیا بڑھ کے پوچھیں ؎

تو شبانہ می نمائی بہ برِ کہ بودی امشب کہ ہنوز چشم مستت اثرِ خمار دارد

لیکن ہمارے دوست نے اپنی ایک رات کی حریف پرورادؤں سے نئے دوستوں کا ایسا حصار ہجوم پیدا کر لیا تھا کہ اب اس کا موقع ہی کب باقی رہا تھا ؎

جو کام میں غیر کے ہو میں صرف افسوس وہ دلربا ادائیں

(۴)

دراصل فونڈیشن کمیٹی کی تمام بحث اس پر آکر ختم ہوگئی تھی کہ ڈاکٹر میجر سید حسن بلگرامی کا ریزولیشن منظور ہو یا نامنظور، تمام دیگر مسائل طے پا چکے تھے اور اصل پتھر چار ارباب کار کو حصولِ

یونیورسٹی کی راہ میں نظر آتا تھا اب یہی رزولیشن تھا یعنی گورنمنٹ کے اختیارات کا مسئلہ اور رزولیشن کے الفاظ یہ تھے۔

"قوانین کالج کی دفعہ ۱۱ کے ضمن میں جو اختیارات اس وقت پیٹرن کو حاصل ہیں ان سے زیادہ اختیارات یونیورسٹی کی صورت میں حضور والسرائے کو بحیثیت چانسلر نہ دیئے جائیں۔"

میجر صاحب نے اس تجویز کو بعد از ہزار سعی و مجاہدت پیش کیا اور تمام آزاد خیال طبقہ نے ساتھ دیا اور آخر تک ساتھ دینے کے لیے تیار تھا لیکن اب جو وہ تشریف لائے تو اسٹیج پر آتے ہی میں نے ان سے پوچھا فرمایئے کیا ارادہ ہے کہا صلح کار کے ساتھ کام کرنا بہتر ہے مجھ کو یقین ہے کہ بحالت موجودہ میرا رزولیشن پاس نہیں ہو سکتا۔ میں نے اسی وقت انا للہ پڑھ دیا کہ گو تمام یورپین اڑ کی ہاتھ سے جائے مگر صلح رہے۔

میجر صاحب کانفرنس کی صدارت کے لیے تشریف لاتے تھے اور فی الحقیقت جس قابلیت اور صداقت کے ساتھ انھوں نے اپنے فرض کو ادا کیا وہ ان کی عظمت کے لیے بہت بڑی چیز ہے لیکن بہتر تھا کہ فونڈیشن کمیٹی کے اجلاس میں حصہ نہ لیتے اور اس رزولیشن کو پیش ہی نہ کرتے وہ نئے نئے قوم کے سامنے آئے اور آتے ہی اپنے تئیں ایک آزمائش میں ڈال دیا حالانکہ آزمائش کی راہ دوسری ہے

عاشقی شیوۂ رندان بلاکش باشد

ہم ایک شعر یاد کرنے لگے جس کا پہلا مصرع یاد نہیں آتا دوسرا مصرع یہ ہے

اگر ماند شبے ماند، شبے دیگر نمے ماند

بہرحال مجلس جم چکی تھی پردہ اٹھا اور اس تماشہ کا ایک ہی ایکٹ شروع ہو گیا۔ سب

سے پہلے ہمارے عشوہ فرما دوست مسٹر محمد علی باہر نکلے اور رزولیشن پیش کیا وہ بیٹھے تو میجر سید حسن بلگرامی اٹھے اور تائید کی

یکے بدزدی دل رفت دپہ دہ دار یکے

اسپنہ ۲۶٫۲۷ کے محرک تھے نہ موید ؎

یہ لوگ بھی غضب ہیں کہ دل پہ یہ اختیار  شب موم کر لیا سحر آہن بنا لیا

غرضکہ دو دن کا فریقانہ معرکہ آرائی گو اب اور کہاں تک طول دیا جاتا۔ اس کا فیصلہ یوں کیا گیا کہ بین بین طریقہ پسند کیجئے کہ خیر الامور اوسطہا۔ کفر و اسلام دونوں کو اختیار کیجئے اہرمن اور یزداں کو رام کیجئے صرف کعبہ کی طرف کیوں ہو رہیے جب کدے سے بھی رسم و راہ رکھئے ایک ہاتھ میں زنار برہمن لیجئے اور دوسرے ہاتھ میں سبحۂ زاہد ؎

معشوق ما بشیوۂ ہر کس موافق است  با شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

(۵)

میجر صاحب کی تائید کے بعد میں نے تقریر کرنا چاہی لیکن خواجہ غلام الثقلین صاحب نے کہا کہ وہ رزولیشن کی نسبت ایک ترمیم قلمبند کر چکے ہیں اس کو پیش کریں گے۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ تقریر کی اور دانشمندانہ طریقہ سے بعض اختیارات مہر کے محفوظ رکھنے کی ضرورت واضح کی لیکن انتظامات مخفیہ سرگرم کار تھے مخالفت کی آوازیں اٹھنا شروع ہو گئیں۔

اس موقعہ میں میں سوچ رہا تھا۔ تمام قیاسات کی تصدیق ہو چکی تھی اور معلوم ہو گیا تھا کہ آزاد خیال پارٹی کی قوت کو شکست دینے کے لیے ایک "عنصر" مرکب سے الگ کر لیا گیا ہے۔ ایک جال ہے جس میں سب کے پاؤں پھنس گئے ہیں پھر کیا رنگ بدلا ہوا دیکھ کر میں بھی خاموش ہو جاؤں — یہ ایک بڑی ہر دلعزیزی اور احسان مندی تھی جو بغیر کسی نقصان کے حاصل ہوتی تھی یہ خیال

تھا جو اس وقت معاً ہر دماغ میں گذر سکتا تھا لیکن گو قوت کا ایک لمحہ کے لئے بھی دعویٰ نہیں تاہم ایسے ایسے وساوس شیطانیہ کے لئے تو الحمد للہ اپنے پہلو میں ایک قوت رکھتا ہوں — ہر دلعزیزی کی خواہش ایک وسوسۂ شیطانی ہے جس کی ایک نگاہِ کرم کے ساتھ ہی ہمتوں اور استقامتوں کی بڑی بڑی چٹانیں پانی ہو کر بہہ جاتی ہیں لیکن جس دن میں نے اپنی پہلی آواز بلند کی اس دن سے اپنے پاؤں کو راہِ حق گوئی کی اس اولین زنجیر سے آزاد کر دیا تھا اور استقامت کی توفیق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

میرے عقیدے میں ہر دلعزیزی کا زیادہ صحیح نام "منافقت" ہے یہ محالِ قطعی ہے کہ ایک شخص "حق گو" بھی ہو اور پھر بزمِ کفر و ایمان دونوں میں ہر دلعزیز ہو یہ بالکل فضول کوشش ہے کہ دونوں میں سے کوئی نئی "درمیانی" راہ پیدا کی جائے۔

میں نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن اپنے ظاہر و باطن کو ایک رکھوں گا اور جو دل میں ہوگا اسی کو زبان کے حوالے کر دوں گا — دعا کرتا ہوں کہ خدا مجھے جلد کسی سخت آزمائش میں ڈالے۔

مجھ کو بعض صاحبوں نے روکا کہ اب مخالفت میں تقریر کرنا بے فائدہ ہے لیکن درحقیقت یہ ان بزرگوں کی غلطی تھی۔ مخالفت اس لئے نہیں کی جاتی کہ موافقت کی صدائیں بلند ہوں بلکہ صرف اس لئے کی جاتی ہے کہ ایمان اور ضمیر کا حکم ہے یہ حکم بالکل اس سے بے پرواہ ہے کہ لوگوں کا کیا خیال ہے۔ کوئی سچی بات اس لئے نہیں ترک کر دی جا سکتی کہ لوگ اس کا استقبال نہیں کریں گے۔ سچ سچ ہے اگرچہ تمام عالم میں ایک بھی اس کا دوست نہ ہو۔

حریفِ کاوشِ مژگانِ خوں ریزش نئی ناصح ‏ ‏ ‏ بدست آور رگِ جانے و نشتر را تماشا کن

جلسہ میں اس وقت تین طرح کے لوگ تھے۔ مجلسِ نیم شبی کے محرمانِ راز، اُن کے متعین

جو خود ارباب صحبت نہ تھے مگر ان کے نام احکام جاری ہوگئے تھے اور کچھ عام لوگ جو اس ناگہانی انقلاب سے بالکل بے خبر تھے اور کوئی آواز اور رائے نہ رکھتے تھے ان میں بہت سے تعلیم یافتہ اور بہت سے سرگرم مدعیان آزادی و حریت بھی تھے۔ مگر یہ سب اس تیغ تیز سے زخمی ہوئے کہ مسٹر محمد علی کو تحریک کرتے دیکھا! وہی کمبخت مذاق تقلید جو کل تک پرانے لیڈروں کے اوہام و عقائد اتباع کی صورت میں خانماں سوز عقل و دانش تھا۔ آج آزادی کے عہد تازہ میں نئے لوگوں کے اتباع کی صورت میں فہم و درایت کی گردن کا طوق بنا۔ بصد ندامت کہنا پڑتا ہے کہ ابنائے عصر کی غلامی بھی مقلدانہ تھی اور اب آزادی بھی مقلدانہ ہے۔

اب قدیم وجدید اور منتسبین احرار کی "متحدہ سازش" سخت بدحواس ہوئی کہ کہیں بنا بنایا کھیل نہ بگڑ جائے ہر طرف سرگوشیاں شروع ہوگئیں۔ خواجہ غلام الثقلین کو بھی ڈیپوٹیشن میں شریک کر لیا گیا ان کا بیان ہے کہ مجھے اسٹیج کے "اقصائے مغرب" سے "مشرق ادنیٰ" کی طرف کھینچ کر لے گئے۔ وہاں قسمیں کھا کھا کر اطمینان دلایا اور منتیں کیں کہ مان جاؤ۔ کیا کرتا مجبوراً ماننا ہی پڑا۔

گو مے ہے تند و تلخ پہ ساقی ہے دلربا
اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کہے بغیر

خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ جب معاملہ یہاں تک پہنچا تو میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اور زیادہ مخالفت کروں۔ یہ عرصہ کے بعد کانفرنس میں آیا تھا لوگ کہتے کہ اس نے چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دیا بہرحال یاران طریقت نے خواجہ صاحب کو بھی چپ کرا ہی دیا ؎

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے
اس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے

اب خواجہ صاحب سے کیا شکوہ کریں وہ کہتے ہیں کہ مجھے قسموں نے فرصت ہی نہ دی ؎

ناز سے عشوے غمزے سے لگا لیتے ہیں
وہ جسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں

خواجہ صاحب نے بھی دیکھا کہ کسی کی منتیں منت ہاتھ آتی ہیں۔ یہ ضد اور ہٹ کا موقع نہیں!

بڑا مزہ ہو جو محشر میں ہم کریں شکوہ     وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کیلئے

لے دیکھے اک خواجہ صاحب ہمارے ساتھ اٹھے تھے۔ ان کو بھی ہمارے دوست اسٹیج کے پیچھے لے گئے بیچارے میر حسن کو بھی یہی شکایت تھی ۔

جو کوئی آئے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے     ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں

ہم تو اس وقت تقریر کر رہے تھے۔ کسے معلوم کہ اسٹیج کے گوشوں میں کیا ہو رہا ہے۔ ورنہ خواجہ صاحب کو پہلے ہی سے خبردار کر دیتے ۔

لغزش نہ ہو بلا ہے حسینوں کا التفات     اے دل سنبھل وہ دشمن جاں مہرباں ہے اب

خیر بہتر ہے دنیا کو یہ عقلمندی و دانش اور مجھ کو اپنا جنون مبارک رہے ۔

قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل نے     جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

(۶)

غرضکہ کہاں تک اس افسانے کو طول دیجئے۔ زلفِ یار کی آج تک کوئی پیمائش کر سکا ہے

ماجرا ہاست بہ آں زلفِ فسوں ساز مرا

بالآخر وہی ہوا جس کا ہزاروں تمناؤں اور آرزوؤں کے ساتھ انتظام کیا گیا تھا ۔

یاں لعلِ فسوں ساز نے باتوں میں لگایا     دے پیچ ادھر زلف اڑا لے گئی دل کو

مسٹر ممتاز حسین نے بولنا چاہا مگر اب کون بولنے دیتا ہے۔

یارانِ کارفرما پر ایک ایک منٹ ایک ایک برس کا گذر رہا تھا۔ جلدی تھی کہ نہیں معلوم کن کن اعمالِ مخفیہ اور وظائف "نصف اللیل" کے بعد اپنا بخت خفتہ بیدار ہوا ہے اور لوگوں کی آنکھوں

پر نودگی طاری ہوتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ادھر ان کی آنکھ کھلے اور ادھر اپنی قسمت پھر چادر منہ پر ڈال لے۔ بہزار مشکل ان کو نہایت نپا تلا وقت دیا گیا تھا۔ لیکن ادھر ایک لفظ منہ سے نکلتا تھا۔ اور ادھر گھڑی دکھلائی جاتی تھی کہ وقت ہو گیا ؎

اس کی محفل کی دیکھنا تہذیب      بات کا اختتام ہوتا ہے

یکایک غل مچا کہ رزولیشن پاس کر دو۔ راجہ صاحب نے حضار مجلس سے پوچھا منظور ہے؟

این سخن را چہ جواب است تو ہم میدانی

بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی۔

اگر حلقۂ بزم تشنہ کا بس چلتا تو اس سوال کا جواب زبان کی جگہ دل کی ٹکڑوں کی پیشکش سے دیتے

ساقی مے دے کہ اہل محفل      پانی پانی پکارتے ہیں

یکایک شور اٹھا کہ منظور! منظور!! منظور!!!

(۸)

رزولیشن کے پاس کر دینے کی خوشی کے ہیجان نے ہوش و حواس کھو دیتے تھے۔ جن نوجوانوں نے برسوں اپنی گلے بازی کا سرگرم تقریروں میں دکھائی تھی آج ان کی گرج اس ہنگامے کے پاٹ نے میں کام آئی۔ چیختے چیختے گلا بیٹھ جاتا تھا مگر سینوں کے اندر آوازوں کا ایک سمندر رہتا۔ آواز گلے میں اٹکتے منہ دیکھے جاتے تھے گویا ابر و رعد کا سیلاب تھا کہ کسی طرح بند ہی نہیں ہوتا تھا۔ "بنارسی محاورہ" کی پلٹنیں اپنی بیکاری سے کچھ اکتا سی گئی تھیں۔ اب انھوں نے ایک گھنٹہ کی خاموشی کی کسر یوں نکالی کہ کچھ دیر کے لیے بارہ دری کے اسٹیج کو "بارنم سرکس" کا تماشا گاہ قرار دیا اور لگے بے تان قلابازیاں کھانے

زاہد نمکین شود بے ذوق زنہار      گہے طفلے شود مستانہ می رقص

جن لوگوں نے ان عجیب و غریب گھڑیوں کو نہیں دیکھا ہے محال ہے کہ انھیں اس کی کیفیت سمجھائی جا سکے۔ چہرے جوش و ہیجان سے سرخ۔ گردن کی رگیں ابھری ہوئی۔ گلے شدتِ شور و ہنگامہ سے پھٹے ہوئے۔ ہاتھ میں اچھلتی ہوئی ٹوپیاں اور پاؤں میں اضطرابِ رقص۔ منہ سے کف اڑ رہا تھا اور چونکہ قریب قریب کھڑے تھے اس لئے آپس ہی میں ایک دوسرے کے چہرے پر پڑ رہی تھی رومال نکال کر منہ پونچھتے اور پھر کف اڑاتے۔

منتظمینِ جلسہ کو کیا معلوم تھا کہ بارہ دری کے اسٹیج سے میدانِ رقص کا کام لیا جائے گا ورنہ اس کی رعایت ملحوظ رکھتے نتیجہ یہ تھا کہ جوشِ تواجد میں گردشِ رقص کی جگہ نہیں ملتی تھی اس لئے ہر شخص جہاں کھڑا تھا وہیں اپنے پاؤں سے اسٹیج کے چوبیں تختوں کو کوٹ رہا تھا۔

(۸)

لیکن اس عجیب نظارے کا ایک منظر تو رہ ہی گیا۔ جب ہی ریزولیشن کے پاس ہونے کا غل مچا۔ ہم نے دیکھا کہ معاً سر راجہ صاحب محمود آباد اپنی کرسی سے مضطربانہ اٹھے اور نواب وقار الملک بہادر کے ہاتھوں کو بے اختیارانہ چوم لیا۔

نواب صاحب قبلہ کی جو سچی عظمت قوم کے دل میں ہے اس کے لحاظ سے اگر راجہ صاحب ان کے قدم بھی چوم لیتے تو یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ لیکن رزولیوشن کے پاس ہونے کے ساتھ ہی اس مضطربانہ اور معجزانہ تعظیم کا مطلب ہم نہ سمجھے لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ دست بوسی کی یہ قیمت نقد متاعِ "خاموشی" کے انعام میں تھی۔ یہ مضطربانہ اظہارِ تعظیم و تکریم اس لئے تھا کہ وہ اگر اس وقت خاموش نہ رہتے تو یہ کشتیٔ طوفان ساحلِ مراد تک نہ پہنچتی۔

(۹)

حریفانِ نخوت نے صحبتِ نیم شبی کے مزے لوٹے لیکن اس بادہ گسارانہ فیاضی کا اعتراف

کرنا چاہئے کہ صبح کی جلسِ عام کو بھی سرشاری و بیخودی سے محروم نہ رکھا ؎

بیخود اس دور میں ہیں ہم سب حاتم      ان دنوں کیا شراب سستی ہے!

لیکن ہم کہیں کہہ چکے ہیں کہ ہمارے ساقی آب دوست نے پلائی تو ضرور کچھ ایسی ہی شئے جس کا رنگ سرخی مائل اور نظروں کے لئے دلربا انگیز تھا لیکن اس میں شک ہے کہ کہیں پانی تو زیادہ نہیں ملا دیا تھا کیونکہ ہم نے خود دیکھا کہ شام ہوتے ہوتے جمائیاں آنی شروع ہو گئی تھیں اور چہرے اکثر بےحال تھے۔ بادہ دری سے نکلنے کے بعد ہی چند مدعیانِ آزادی ملے جن سے ہم نے پوچھا کہ یہ کیا ہنگامہ تھا تو وہ رزولیشن کا مطلب بھی نہ سمجھا سکے۔ جب کہا کہ بے سمجھے بوجھے آپ نے ہی تو رقصِ مغلوبہ میں حصہ لیا تھا تو یکایک اُن کے سر میں خارش شروع ہو گئی حالانکہ اب ہاتھ کی جگہ سر نہیں پیشانی تھی۔

گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

وہاں تو سب دم بخود رہے لیکن ڈیپوٹیشن کی شرکت کا مسئلہ ایسا تھا جو بعد کو یاد نہ آتا۔ ہم نے سنا ہے کہ بقیہ تمام دن اسی معرکہ آرائی میں صرف ہوا

یہ بعد از انفصال اب اور ہی جھگڑا نکل آیا

بزرگانِ پنجاب نے فوراً اپنا بستر لپیٹا کہ ہماری قائم مقامی کا لحاظ نہیں رکھا گیا گویا اور تو تمام صوبوں کی قائم مقامی کا کامل لحاظ رکھا گیا تھا۔ سنا ہے کہ جناب راجہ صاحب اسٹیشن پہ دوڑے ہوئے گئے کہ خدا کے لئے اور جو جی میں آئے کیجئے مگر روٹھ کر تو نہ جایئے۔۔۔

تم ہی سچے سہی اس بات کا جھگڑا کیا ہے

اور دونوں پر کچھ اس طرح قبضہ کر لیا کہ رو ٹھنوں کو مناہی نہیں لیا بلکہ دو ممبر اور بڑھا لئے

رنجیدہ می روی ز سر کوئے او سلیم      چوں میشود نیاید اگر از قفا کسے

# قرآن کریم اور اصطلاحِ لفظِ کفار

"وقت است کہ وقت بسر آید" کے عنوان سے "کشف ساق" کے متعلق مولینا کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ جس میں جا بجا کفار کا لفظ آیا تھا۔ اس کی نسبت گجرات کے مولوی احمد حسین نے دریافت کیا تھا کہ کفار سے آپ کی مراد کون لوگ ہیں۔

○

قرآن کے متعلق صدہا مباحث ایسے ہیں جن پر ارباب علم کے لئے بہت کچھ غور و تدبر ابھی باقی ہے از انجملہ ایک مبحث اہم "کشف ساق" کے مفہوم و مقصود کا بھی ہے جس کا ذکر متعدد آیات میں کیا گیا ہے مذکورہ مضمون میں بعض مفسرین کی تحریک سے کوشش کی گئی تھی کہ ان آیات کی تفسیر علوم و تحقیق جدید کے ساتھ کی جائے۔ مگر دراصل وہ مضمون ابھی ناتمام ہے اور متعدد مباحث بیان میں آنے سے رہ گئے ہیں۔ مثلاً ان آیات کا محل اصلی، کہ انکے متعلق نہایت اہم مباحث ہیں۔ ان تمام آیات میں خدا تعالیٰ نے ان لوگوں کے ارادوں اور کاموں کی نامرادیوں کی خبر دی ہے جو دین الٰہی کے بغض و عداوت میں مسلمانوں کو مٹانے کی کوشش کریں گے، اور پھر ان لوگوں کے وہ تمام خصائل رذیلہ ایک ایک کر کے بیان کئے ہیں جن کی مضمونِ مذکور میں تشریح کی گئی ہے اور جن میں تخالف عہد و میثاق پر علی الخصوص زور دیا گیا ہے

# آیاتِ کریمہ کا مورد

آغازِ عہدِ نبوت میں معاندینِ اسلام نے مسلمانوں پر جو ظلم و ستم کئے ان کی تباہی و بربادی کی جیسی کچھ تدبیریں کیں۔ دینِ الٰہی کی تحقیر و اہانت میں جس شوخی و بے باکی سے کوشاں رہے اور پھر جس طرح اپنے تمام عہدوں کو توڑ کر اپنے زیر دست مسلمانوں کو سخت سے سخت سزائیں دیں اور باوجود اللہ نے بار بار مہلت دینے اور طرح طرح کی آیاتِ بینہ و قاہرہ دکھانے کے وہ اپنی شیطنت و طغیان سے باز نہ آئے، ان تمام امور کی طرف ان آیات میں مفصل اشارات کئے گئے ہیں۔

یہ زمانہ مسلمانوں کی غربت و بیکسی و محکومی و زیر دستی کا تھا۔ خدا نے ان کو روکا کہ وہ اپنی زیر دستی کی وجہ سے دل شکستہ ہو کر مایوس نہ ہو بیٹھیں اور معاندینِ حق و صداقت سے ذرا بھی نہ ڈریں۔

بعض ضعفاء ملت تھے جن کے عزیز و اقارب مکہ معظمہ میں تھے اور یہ ان سے عزیزانہ نامہ و پیام رکھتے تھے اور اس طرح دشمنوں کو ان کے ذریعہ حریف کے ارادوں اور حالتوں کی خبر مل جاتی تھی۔

اس کے بعد پھر مومنین مخلصین کی تسکین و طمانیت کے لئے حق کی فتح اور باطل کے خسران کی جا بجا خبر دی اور ایک خاص فیصلہ کن وقت کی طرف اشارہ کیا جو بہت جلد آنے والا ہے اور جو زیر دستوں کو بالادست، محکوموں کو حاکم، مفتوحوں کو فاتح اور خاکِ ذلت پر لوٹنے والوں کو عرشِ جلال و عظمت پر متمکن کر دے گا۔ یہی دن ہو گا جبکہ شدت و کرب کی پنڈلی برہنہ ہو جائے گی، سختی و عذاب کا چہرہ بے نقاب ہو جائے گا، ظالموں کو سر افگندگی کی دعوت دی جائے گی۔ اس وقت

ان کی آنکھیں ذلت و شرمندگی سے جھکی ہوں گی چہرے ذلت و نکبت سے مسخ ہوں گے یہ وہی مغرور کفر و عدوان تھے کہ انھیں اللہ اور اس کے احکام کے آگے جھکنے کی دعوت دی جاتی تھی اور یہ اچھے خاصے صحیح و سالم تھے۔ مگر شیطان کی ڈالی ہوئی باگ اتنی سخت تھی کہ اُن کے سروں کو جھکنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔

## معجزۂ قرآنی

یہ پیشنگوئیاں ایک ایسے عہدِ غربت میں کی گئی تھیں جب کہ مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ تھا اور فتح و کامرانی ایک طرف ان کو کسی گوشہ میں چین سے بیٹھنے کی بھی مہلت نہ تھی مگر نصرتِ الٰہی کے معجزات ایسی ہی حالتوں میں عقول و اذہانِ انسانیت کو دعوتِ عجز و اعتراف دیتے ہیں تا قدرتوں کی فرمانروائی کا اعلان اور قوت الٰہیہ کے جلال و جبروت کا اظہار ہو۔ یہ ایک وعدۂ الٰہی تھا جو کمال بے سر و سامانی کے عالم میں کیا گیا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں تک دنیا کو منتظر رہنا پڑا، یکایک واقعات و حوادث کا صفحہ الٹا۔ اسلام کی "غربت اولیٰ" کا دور ختم ہوا ملائکہ فتح و نصرت کے نزول سے خدا کی زمین بھر گئی اور فتح مکہ کا معرکہ پیش آیا۔ یہی وہ فیصلہ کن دن تھا جس کی ان آیات میں خبر دی گئی تھی، اور یہی وقتِ موعود تھا جبکہ "کشف ساق کی حقیقت کھلنے والی تھی"۔ خدا کا تخت بچھا کفر کی فوج کو ہزیمت ہوئی محکوم حاکم، مفتوح فاتح، مطیع مطاع اور پرستاران اصنام و طواغیت کی جگہ عباد اللہ المخلصین کا دورِ خلافت و تمکنت شروع ہوا۔

پس فی الحقیقت ان آیات میں جو خصائص و خصائل خبیثہ و رذیلہ و دنیہ بیان کئے گئے ہیں وہ اپنے مورد اول کے اعتبار سے مشرکین مکہ کے متعلق ہیں اور ان میں انقلاب حالت کی جو خبر دی گئی ہے وہ ایک پیشنگوئی تھی جس کا ظہور جنگِ بدر ہی سے شروع ہو گیا تھا پھر فتح مکہ کے بعد اعلان ہوا اور

اس کے بعد اسلام کے ظہور عام خلافت اسلامیہ کے قیام فتح ممالک و بلدان اور خاتمۂ اہل کفر و طغیان سے روز بروز زیادہ متحقق و متعین ہوتا گیا اور انشاء اللہ تا قیامت اس کے اعجاز و خارق ظاہر ہی ہوتے رہیں گے۔

## قرآن کی ایک خصوصیت

خصائص مخصوصۂ کلام اللہ میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے اکثر بیانات و تنزیلات گو خاص مواقع و حالات سے متعلق ہیں لیکن ان کا انطباق اصولاً ہر زمانہ میں ہوتا رہا ہے پس ان آیات میں جو امور بیان کئے گئے ہیں گو وہ کفار مکہ اور فتح بلدین کے متعلق ہے مگر ان کی صداقت آج بھی ویسی ہی ہے جیسی اب سے تیرہ سو برس پہلے تھی۔

## تحقیق اطلاق لفظ کفار

رہا آپ کا یہ سوال کہ کفار سے مراد وہاں کون لوگ ہیں تو یہ تمام تفصیل لکھی اسی لئے گئی تاکہ مطالب بالکل واضح و بیّن ہو جائیں۔ کفار سے وہاں مراد خاص کر مشرکین مکہ ہیں انھیں سے اسلام کا مقابلہ تھا انھیں کے مظالم کا یوم الحساب آنے والا تھا اور انھیں کے مواعید و مواثیق مکذوبہ تھے جن کا بارہا ظہور ہو چکا تھا اور ضرور تھا کہ ان کے نتائج سے وہ دو چار ہوں اور پھر ان کے علاوہ اسلام و مسلمین کے ساتھ یہ سلوک اور جس گروہ کا رہے گا انشاء اللہ وہ بھی اس وعید الٰہی کا مستوجب ہوگا۔

## اہل کتاب اور کفار

قرآن کریم کا مطالعہ کیجئے تو بادی النظر واضح ہو جائے گا کہ اس نے اس بارے میں خاص

اصطلاحات مقرر کردی ہیں اور ہر جگہ انہیں کو استعمال کیا ہے۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں "کفار" کے لفظ سے عموماً مشرکین کو مراد ہوتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کے لئے اس نے "اہل کتاب" کی اصطلاح قرار دی ہے اور یہ اس کی ایک رعایت خاص ہے۔ جس کے ذریعہ اس نے عیسائیوں اور یہودیوں کو عام مشرکین کے مقابلہ میں امتیاز بخشا ہے۔ قرآن کریم میں ہر جگہ یہود و نصاریٰ کو "اہل کتاب" اور عام طور پر مشرکین و "عبدۃ الاصنام" کو کفار کے لفظ سے مخاطب پائیے گا۔

یہ ضرور ہے کہ قرآن کریم نے الوہیت مسیح کے اعتقاد، حضرت مریم کی پرستش اور قتل انبیاء و مرسلین کو صریح طور پر کفر کہا ہے اور ظاہر ہے کہ شرک کے معنی صرف بتوں کے پوجنے ہی کے نہیں بلکہ انسانوں کی پرستش بھی اس میں داخل ہے۔

"بیشک جن لوگوں نے کہا کہ خدا نے مسیح ابن مریم کی صورت میں ظہور کیا انہوں نے صریح کفر کیا (۵:۷۲)"

اس موقع پر اور دوسرے تمام مواقع میں ان کے اعتقادات کو تو "کفر" قرار دیا ہے۔ تاہم خود ان کو کہیں "کفار" کے لقب سے ملقب نہیں کیا۔

---

# اولیاء اللہ و ارتقائے روحانی،

(مولینا کا ایک مضمون "اولیاء اللہ و اولیاء الشیطٰن" کے عنوان سے چھپا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ اولیاء اللہ سے مقصود کوئی خاص مصطلح جماعت نہیں ہے جیسا کہ سمجھا جاتا ہے، قرآنِ کریم تمام مومنین صادقین کو اولیاء اللہ کے لقب سے پکارتا ہے۔ البتہ جو لوگ تنزیۂ نفس اور اعمال صالح کے ذریعہ تقرب الی اللہ کی راہ اختیار کرتے ہیں وہ ارتقائے روحانی کے ماتحت مختلف مدارج و مراتب سے گذرتے ہیں اور آیت و من یطع اللہ میں انہیں کا ذکر کیا گیا ہے۔

مولوی محمد عمر صاحب تھانوی نے اس سلسلہ میں سوال کیا تھا کہ "ارتقائے روحانی" سے مقصود کیا ہے اور اس کا ذکر قرآن کریم میں کیونکر کیا گیا ہے)

جناب نے ارتقاء روحانی کے متعلق سوال کر کے ایک بہت طولانی بحث چھیڑ دی ہے مختصراً چند اشارات پہ اکتفا کروں گا۔

قرآنِ کریم کے مطالعہ و تدبر سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیاء الرحمٰن اور اولیاء الشیطٰن کے

مختلف درجے اور مرتبے ہیں اور بہ لحاظ اپنے اعمال وخصائص اور تعلق ونسبت کے یہ دونوں جماعتیں ایمان ونفاق اسلام وکفر اور تقویٰ وفسق ہی گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔

اولیاء اللہ کا گروہ جس قدر محبتِ الٰہی اور انقطاع ماسوی اللہ میں ترقی کرتا ہے۔ اتنا ہی اس کے اعمال میں اخلاقِ الٰہی اور صفتِ ربانی کا ظہور بھی ترقی کرتا ہے اور اس کی روح فیضانِ الٰہی سے نزدیک تر ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ تکمیلِ مرتبۂ انسانیت تک اس کا ارتقاء ہو جاتا ہے اور یہی "صراطِ مستقیم" اور دینِ قیم کا آخری مرتبہ ہے۔

اسی طرح اولیاء الشیطٰن بھی جس قدر اپنے مرکز شقاوت وخباثت سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں اور ان کی روح کو مقام ایمان باللہ وذہاب الی اللہ سے بُعد ہوتا جاتا ہے۔ اتنا ہی کفر ونفاق اور فسق وعدوان میں بھی ترقی کرتے جاتے ہیں۔ اور اسی ترقی کی نسبت سے ان کے مختلف درجے اور مرتبے ہیں۔

پہلا گروہ اللہ کی طرف بڑھتا ہے اس لئے اس کو الٰہی منزلیں پیش آتی ہیں اور ان راہوں میں سے ہو کر گذرتا ہے جو اللہ کے دوستوں کی راہیں ہیں لیکن دوسرے گروہ کا رُخ قوائے شیطانیہ کی طرف ہوتا ہے اس لئے ابلیسی منزلیں پیش آتی ہیں اور ان راہوں کو اختیار کرتا ہے جو شیطان کے چاہنے والوں کی راہیں ہیں، پس اولیاء اللہ جس قدر محبت اللہ سے کرنے اور غیر اللہ سے کٹنے میں ترقی کرتے جاتے ہیں اتنا ہی مدارجِ سیر الی اللہ میں بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ اسی طرح اولیا الشیطٰن یا اصحاب النار جس قدر شیطان سے عشق کرتے اور اس کے لئے اور اس کے کاموں کے لئے خدا کو چھوڑنے اور خدا کے کاموں سے دشمنی کرنے میں دلیر اور جری ہوتے جاتے ہیں اتنا ہی ذہاب الی الشیطٰن میں ان کے ابلیسی مراتب کی بھی ترقی ہوتی جاتی ہے۔

اگر تم کہتے ہو کہ انسان کے جسم کی ترقی اور تکمیل کے لئے دنیا میں قانون ارتقاء جاری ہے اور اس نے ایک رینگنے والے کیڑے کو ترقی دے کر بتدریج انسانی جسم و شکل کے حسن و جمال تک پہنچا دیا ہے تو پھر انسانی روح کی ترقی و تکمیل کے لیے کیوں کوئی قانونِ ارتقار تسلیم نہیں کرتے اور کیوں انسان کی معنوی زندگی کو ادنیٰ مرتبہ سے اٹھا کر اعلیٰ مراتب حیات الٰہیہ تک پہنچنے نہیں دیتے۔

فی الحقیقت وہ قانونِ ارتقار جو "لامارک" "طبری" "ابن مسکویہ" اور "ڈاروِن" نے دریافت کیا ہے صرف مخلوقات کے جسم ہی تک محدود ہے وہ کچھ نہیں بتلاتا کہ ارتقار کی یہ زنجیر ہیکلِ انسانی کی کڑی تک پہنچ کر پھر کہاں چلی جاتی ہے اور اس کے بعد بھی ارتقار کے مدارج باقی رہتے ہیں یا نہیں لیکن وہ قانونِ ارتقار جسے محمد الرسول اللہ نے دریافت کیا وہ بتلاتا ہے کہ بلاشبہ انسانیت کے مرتبہ تک پہنچنے کے بعد "ارتقار جسمی" تو ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کے بعد ارتقار روحانی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور جسم حیوانی کو انسان کا ہیکل اختیار کرنے کے بعد بھی انسان بننے کے لیے بہت کچھ بننا اور ترقی کرنا باقی رہتا ہے۔

جو لوگ تم میں ایمان لائے اور جن لوگوں نے علم حق حاصل کیا سو اللہ تعالیٰ ان کے مدارج کو ترقی دیتا ہے اور ارتفاع بخشتا ہے۔ (۵۸ : ۱۲)

یہی مدارج ہیں جو اولیاء اللہ اور اصحاب النار کے ذہاب الی اللہ کی مختلف منزلیں ہیں۔ ایمان باللہ اور محبتِ الٰہی اس ارتقائے روحانی کی اصل ہے اور ارتقائے انسانی کے معنی یہ ہیں کہ اللہ پہ ایمان و ایقان ترقی کرے اور اللہ کی ولایت و دوستی اپنے اونچے مرتبوں اور مقاموں تک بلند ہو جائے۔

کلماتِ طیبہ وصالحہ اللہ ہی کی طرف بلند ہوتے ہیں اور عمل صالح کرنے

والوں کو ارتقاء بخشتا ہے (۳۵: ۱۱)

اس آیت کریمہ میں دو چیزیں بیان کی ہیں "کلم الطیب" اور "عمل صالح" پس انسانیت کی تکمیل و ارتقاء کی بنیاد بھی یہی دو چیزیں ہیں۔

"کلم الطیب" سے مقصود ایمان باللہ ہے اور "عمل صالح" سے مقصود انسان کے وہ تمام کام ہیں جو صحت و اصلاح اور عدل و حقیقت کے مطابق ہوں۔ فرمایا کہ ایمان باللہ صعود کرتا ہے اور بلند ہوتا ہے اور عمل صالح کو خدا اونچے درجوں تک لے جاتا ہے۔

یہی ارتقائے روحانی ہے۔ جس کو قرآن نے "نعمت" اور "انعام" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اور اپنے "فاتحۃ الکتاب" [۱] میں (کہ تمام قرآن اسی متن کی شرح ہے) مومنوں کو یہ دعا سکھلائی ہے۔

خدایا! ہمیں صراط مستقیم پہ چلا وہ صراطِ مستقیم جو ان لوگوں کی راہ ہے جن پہ تو نے انعام کیا۔

تو نے انعام کیا، یعنی جن اولیائے اللہ کو مقام الہٰیہ و منازلِ ربانیہ میں ارتقاء و صعود کی تو نے توفیق دی۔ دوسری جگہ ان لوگوں کی نسبت صاف صاف تصریح کر دی ہے اور ارتقاء روحانی کے چار درجے بتلا دیئے ہیں۔

وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَاُولٰئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ
اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ
وَالشُّهَدَاءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰئِكَ
رَفِيْقًا

پس یہ ارتقاء عمل صالح کے درجے سے شروع ہوتا ہے اور مقام نبوت کے فیضان پر ختم ہوتا

---

[۱] فاتحۃ الکتاب (سورۃ الحمد)
"ام الکتاب" سورہ الحمد کی تفسیر مولانا ابو الکلام آزاد کے قلم سے مکتبۂ احباب سے حاصل کریں:۔

ہے۔

"اولیاء اللہ" جس قدر اپنے اعمال حسنہ اور تزکیۂ نفس و اتقا میں ترقی کرتے ہیں اتنا ہی مقام نبوت کے انوار و تجلیات سے بہرہ اندوز ہوتے جاتے ہیں۔

صحیح بخاری کی حدیث ولی میں اسی طرف اشارہ ہے۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کو اسی ارتقا کے مرتبہ "محدث" کی خبر دی گئی۔ تصریحات کتاب و سنت اس بارے میں بے شمار ہیں۔

---

# بعض احادیث موضوعہ

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تصنیف "احیاء العلوم" کی بعض مشہور حدیثوں کے متعلق جو۔ محمدؐ علی صاحب پیش امام بہاؤ نگر نے دریافت کیا تھا۔ کہ ان کی حیثیت کیا ہے۔

احادیث کی صحت و عدم صحت کا معاملہ بہت نازک اور محتاج علم و نظر ہے۔ جب تک اس فن عظیم و مقدس سے واقفیت نہ ہو اور تمام علوم متعلقۂ حدیث پر نظر نہ ہو نیز تمام کتب معتبرۂ قوم و طبقات محدثین و روات پیش نظر ہو۔ تصریحات ائمۂ فن و طریق تخریج و نقد و روایت کی پوری پوری من الباب الی المحراب خبر نہ ہو اُس وقت تک کچھ پتہ نہیں چلتا۔ محض چند کتب حدیث کا سامنے رکھ لینا اس بارے میں مفید نہیں۔

آج کل بڑی مصیبت یہ ہے کہ علم و جہل میں کچھ تمیز نہیں رہی، ہر واعظ محدث اور ہر خواندہ محقق ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ علوم میں اس کثرت سے موضوع و بے اصل حدیثیں مشہور ہو گئی ہیں۔ کہ اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو "الموضوعات" لکھنی پڑے۔ یہ ایک بڑی آفت ہے اور قوم کی ضلالت

دینی کا بہت بڑا سبب قوی۔ پھر اس سے بھی بڑھ کر آفت یہ ہے کہ ہر عربی کا جملہ جو کسی واعظ کی زبان سے نکل جاتے اور اس نے کتبِ مواعظ وقصص میں پڑھ لیا ہو اس درجہ اصح الحدیث اور کالوحی والقرآن سمجھا جاتا ہے کہ اگر ان کو بے اصل کہئے تو لوگ جنگ وجدل کے لئے آستینیں چڑھا لیتے ہیں۔

## قصّاص وواعظین

یہ قصاص و وعاظ کئی صدیوں سے مسلمانوں کے لئے سب سے بڑی مصیبت ہیں اور موجودہ عہدِ جہل نے اس مصیبت کو اور زیادہ عام و شدید کر دیا ہے۔ نہ تو انہیں قرآن کی خبر ہے نہ حدیث و آثار کی ان کتابیں پڑھی ہیں اور نہ علم وفن کی صورت دیکھی ہے صرف چند قصے اور اشعار یاد کر لئے ہیں جو یا تو اپنے بزرگوں سے سنتے آئے ہیں یا کسی وعظ کی کتاب میں دیکھ لئے ہیں۔

واعظ کی اصلی قوت دماغ کی جگہ ان کے گلے میں ہوتی ہے ایک مطرب ومغنّی کی طرح گانا شروع کر دیتے ہیں اور پھر عربی کا ہر غلط سلط جملہ جو ان کی زبان سے نکل سکتا ہے بے تکلف اور بے خوف حدیث کے لقب سے بیان کر دیا جاتا ہے۔ غریب سننے والے جو موسیقی کے قدرتی تاثر سے پہلے ہی مرعوب ہو چکے ہیں شوق اور عقیدت سے سنتے ہیں اور ان کی تمام خرافات کو حدیثِ رسول یقین کرتے ہیں۔ نعوذ باللہ من شر الجہل والفساد۔

آج اصلی مصیبت یہی ہے کہ قرآن وحدیث ہی اسلام کی تعلیم کا اصلی سرچشمہ ہیں اور انہیں کی صحیح و حقیقی تعلیمات حاصل کرنے کا عوام بیچاروں کے پاس کوئی وسیلہ نہیں۔ واعظین جاہلین اور قصّاص وجاہلین نے ہر طرف سے ان کا محاصرہ کر لیا ہے — علمارِ حق اول تو قلیل ہیں پھر جتنے بھی ہیں اصلاح عوام کی اصلی تدابیر سے بے پرواہیں۔ ع کار از دو اگذشتہ وافسوس نہ کردہ کس۔

آپ نے حجت الاسلام امام غزالیؒ کی احیاء العلوم والدین کا ذکر کیا ہے اور ان احادیث کی نسبت خاص طور پر پوچھا ہے جو بکثرت اس میں درج کی گئی ہیں۔

احیاء العلوم ایک ایسی کتاب جلیل و عظیم ہے کہ اگر تاریخ اسلام کی تمام تصانیف سے صرف اعلیٰ ترین کتابوں کی ایک بہت ہی منتخب فہرست بنائی جائے تو بلا شبہ احیاء العلوم ان سب میں ایک خاص ممتاز کتاب ہو گی۔

تاہم یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر عالم و مصنف کی حیثیت علمی کا ایک خاص دائرہ ہوتا ہے اور اس سے باہر اس کی وہ حیثیت باقی نہیں رہتی۔ امام مالکؒ محدث تھے اور فقیہ۔ لیکن مورخ نہ تھے پس تاریخ میں ان کا قول بمقابلہ مورخ کے ارجح نہ ہو گا۔ اسی طرح ابن خلدون بہت بڑا مورخ ہے۔ لیکن اگر حدیث و فقہ میں اس کی سند دی جائے تو اسے کوئی بھی تسلیم نہ کرے گا ابن خلدون نے "مقدمہ" میں لکھدیا ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کو صرف سترہ حدیثیں یاد تھیں۔ مگر آپ اسے تسلیم نہیں کر سکتے۔

ہر فن اپنی بحث و نظر کے لیے ایک خاص جماعت رکھتا ہے اور اس کے خاص خاص اصول ہیں۔ فن تاریخ کی بحث ہو تو مورخین کی سند لایئے ادب کے مسائل ہوں تو ائمہ ادب کی طرف رجوع کیجئے یہ نہ کیجئے کہ بحث تو فقہ کی ہو اور معتبر سمجھیں آپ "کسائی" اور "سیبویہ" کو کیونکہ وہ فن نحو میں امام تھے۔

اکثر لوگ اس نکتہ کو بھول جاتے ہیں اور سخت ٹھوکر کھاتے ہیں ——— امام غزالیؒ فلسفہ و کلام کے ماہر منقول و معقول میں تطبیق دینے والے، تصوف و سلوک کے سب سے بڑے اور سب سے بہتر و معتبر ترجمان اور علم اسرار الدین کے بہترین ذخیرے کے جامع ہیں مگر محدث نہیں ہیں محدثین و ارباب نقد نے صاف صاف کہدیا ہے کہ احیاء العلوم میں اکثر حدیثیں ضعیف اور بہت

زیادہ بے اصل روایات ہیں۔ اسی لئے شارحین احیاء نے ان احادیث کی تخریج میں بڑی محنت اٹھائی اور صحیح کو ضعیف سے اور حدیث کو غیر حدیث سے الگ کرنا چاہا ہے

علامہ ابن تیمیہ کا یہ قول "احیاء" کی نسبت مشہور ہے — "امام غزالیؒ کا اکثر بیان احیاء العلوم میں عمدہ اور بہتر ہے الا چار باتیں جو بطور مواد فاسد کے اس میں شامل ہو گئی ہیں۔ فلسفیانہ مطالب، کلامیہ انداز، ترہات صوفیہ اور موضوع حدیثیں!

علامہ موصوف کو مسلمان صوفیوں اور متکلمین کے گروہ سے سخت نفرت تھی اور ان کی غیرت شریعت بعض متصوفین کے ترہات و شطحیات کی سماعت کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی اس لئے انھوں نے ابتدائی تین چیزوں کو بھی احیاء کا مواد فاسد قرار دیا مگر درحقیقت یہ رائے زیادتی سے خالی نہیں البتہ آخری چیز یقیناً قابل ذکر ہے۔ یعنی نقل احادیث میں بے احتیاطی — حضرت امام ہی پر موقوف نہیں عموماً صوفیائے کرام نے نقل احادیث میں بڑی بے احتیاطیاں کی ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان مخالفین کو تشدد و تعصب کا زیادہ موقع مل گیا ہے اور حق یہ ہے کہ محدثین کرام اپنے اس "تشدد" میں حق بجانب ہیں۔

## کتب موضوعات

پس آپ احیاء العلوم وغیرہ پر اس بارے میں اعتماد نہ کریں اور اقلاً بعض کتب موضوعات ضرور پیش نظر رکھیں، حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے حجۃ البالغہ میں طبقات حدیث و محدثین پر جو کچھ لکھا ہے بہت نافع ہے، محدث ابن جوزی، حافظ سیوطی، ملا علی قاری اور امام شوکانی کی کتب موضوعات چھپ گئی ہیں اور ان میں عام زبانوں پر چڑھی ہوئی حدیثوں کا تذکرہ آ گیا ہے صاحب سفر السعادت کے تشدد کی اس بارے میں شکایت کی جاتی ہے مگر حقیقت اس

کے خلاف ہے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی شرح سفر السعادت منگوا لیجئے مع رد کے اس کا خاتمہ نظر سے گذر جائے گا اللہ فائدہ بخشے گا شیخ عبدالرحمن ابن علی شیبانی کی "التمیز" بھی چھپ گئی ہے اور اس میں تمام مشہور حدیثوں کی کامل طریقہ پہ تخریج کی گئی ہے۔ علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی تصنیفات میں بھی اس کا مواد بہت ہے علی الخصوص مجمع الفتاوی اور مجموعہ رسائل جلد اول و دوم میں جو حال میں مصر میں چھپ گئے ہیں۔

امام شوکانی کی موضوعات میں قدما کی تمام کتابوں کو ضبط و اعتدال کے ساتھ جمع کرنے کی کوشش کی ہے اگر اسے آپ دیکھ لیں تو عام و مشہور احادیث کے متعلق اچھی بصیرت حاصل ہو جائے گی۔

## احادیث مسئولہ عنہا

اب میں فرداً فرداً آپ کی تحقیق کردہ احادیث کی نسبت عرض کرتا ہوں

(۱) حُبُّ الدُّنْيَا رَاسُ كُلِّ خَطِيئَةٍ بیہقی نے شعب الایمان میں حسن بصری سے روایت کی ہے۔ ابو نعیم حلیۃ الاولیاء میں اسے حضرت عیسیٰؑ کا قول کہتے ہیں۔ مالک ابن دینار کی طرف بھی منسوب ہے علامہ ابن تیمیہ نے جندب البجلی کا قول کہا ہے۔ بہرحال یہ جملہ معناً تو بالکل صحیح ہے۔ مگر لفظاً حدیث نہیں ہے۔

(۲) "خدا کہتا ہے کہ نہ تو مجھے زمین اٹھا سکی نہ آسمان مگر اپنے مومن بندے کے دل میں سما گیا"

در دل مومن بگنجم اے عجیب — گر مرا جوئی دراں دلہا طلب

معناً یہ جملہ بہت صحیح اور قرآن کریم کی آیت کا بیان ہے لیکن حدیث نہیں ہے۔

(۴۲) گوشت کو چھری سے کاٹ کر کھانے کی ممانعت"۔

بیہقی نے شعب الایمان میں اسے روایت کیا ہے نیز ابوداؤد نے سنن میں لیکن امام شوکانی لکھتے ہیں :

"امام احمد کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے کیونکہ آنحضرت صلعم کا بکری کا گوشت کاٹنا ثابت ہے"۔

اس کے علاوہ اس کی روایت میں ابومعشر ہے اور امام احمد کہتے ہیں "وہ کوئی چیز نہیں

(۴۴) "علم دو ہیں ۔ ایک علم وہ جس سے بدنِ انسانی کا تعلق ہے یعنی فن طب اور ایک وہ شریعتوں اور دینوں کا علم ہے"۔

اس کی بھی کوئی اصلیت نہیں ضعیف سند سے بھی کسی نے روایت نہیں کیا تعجب ہے کہ کیونکر یہ جملہ حدیث "مشہور ہو گیا ۔

(۴۵) "رجب خدا کا مہینہ ہے اور شعبان پیغمبر کا اور رمضان میری امت کا"۔

فضائل ایام و شہور میں موضوعات کا بڑا ذخیرہ ہے ۔ لیکن محققین و ثقات فن نے اسے موضوع قرار دیا ہے ۔ اس کے اسناد میں ابوبکر ابن الحسن النقاش ہے جو "متہم" ہے اور کسائی نامی بھی ایک راوی ہے جو "مجہول" ہے ۔

(۴۶) "صلوٰۃ التسبیح اور اس کے فضائل" اس سے مقصود ایک خاص نماز نفل ہے جو چار رکعتوں میں ختم ہوتی ہے ہر رکعت میں فاتحہ اور سورت کے بعد سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر پندرہ پندرہ مرتبہ پڑھتے ہیں ۔ پھر رکوع اور قومہ اور دونوں سجدوں میں بھی دس دس مرتبہ یہی کلمات پڑھے جاتے ہیں اس طرح ہر رکعت میں ۷۵ مرتبہ کلمۂ تسبیح پڑھا جاتا ہے ۔

اس نماز کے متعلق متعدد طرق سے حدیث مروی ہے سب سے زیادہ مشہور وہ

طریقے ہیں۔ ایک حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے دوسرا ابی رافع کی روایت سے۔ پہلی روایت کو ابو داؤد، ابن ماجہ اور حاکم نے درج کیا ہے دوسری ترمذی اور ابن ماجہ میں ہے۔ دار قطنی نے بھی حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔

لیکن اس حدیث کے متعلق محققین فن میں اختلاف ہے۔ محدث ابن جوزی نے موضوعات میں شمار کیا ہے۔ حافظ ابن حجر اس کا رد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابن عباس والی روایت معضبوط اور "شرط حسن" پر ہے۔ نیز ابن حارث نے اسے اسناد لا باس بہ سے روایت کیا ہے اور فضل ابن عباس ابن عمر، علی ابن ابی طالب، جعفر ابن ابی طالب، ام سلمہ ان سب سے روایتیں موجود ہیں۔ اس حالت میں ابن جوزی کا موضوع کہنا کس قدر زیادتی کی بات ہے۔

علاوہ حافظ ابن حجر کے ابن مندہ، خطیب، ابن الصلاح، اور نووی نے بھی اسے "صحیح" یا "حسن" قرار دیا ہے۔ اور اس کی "تصویب" کی ہے۔ تاہم ایک بڑی جماعت محدثین کی اسے ضعیف بھی کہتی ہے اور موضوع کہنے والوں میں ابن جوزی کے علاوہ عقیلی بھی ہیں — حتیٰ کہ حافظ سیوطی اللآلی میں لکھتے ہیں۔

"اور حق یہ ہے کہ اس حدیث کے تمام طریقے صحیح ہیں۔ ابن عباس والی حدیث البتہ شرط حسن کے قریب پہنچتی ہے مگر اس میں بھی یہ کمی ہے کہ "شاذ" ہے کیونکہ کمال درجہ اپنے بیان میں "فرد" ہے اور اس کا "تابع" اور "شاہد" کوئی نہیں جو درجہ معتبر رکھتا ہو۔ نیز یہ بات بھی ہے کہ جس نماز کی اس میں ترکیب بتلائی گئی ہے اس کی صورت باقی نمازوں سے مختلف ہے۔"

حافظ موصوف کا قول اس حدیث کے لئے سب سے بہتر اور معتدل "قول فیصل" ہے اسی سے آپ رائے قائم کرلیں۔ رہا صلوٰۃ التسبیح کا حکم اور فضائل تو وہ بہرحال ایک نفل نماز ہے اور اس

طریق تسبیح سے عبادت کرنا کسی دوسرے نص کا معارض بھی نہیں۔

(۷) "حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَانِ" یہ ایک اچھا اور صحیح جملہ ہے مگر اسے حدیث کہنا بالکل کذب وافترا ہے کسی غیر معروف سند سے بھی مروی نہیں!

(۸) "عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ" بالکل بے اصل ہے، حافظ ابن حجر نے صاف لکھدیا ہے کہ لَا اَصْلَ لَهٗ۔ البتہ اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ کو احمد، ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔

# حدیث اختلاف امتی رحمۃ

(مولینا علی احمد صاحب سندھی نے "فاتحۃ البلاغ" کے سلسلے میں گذارشیں آنجناب
مزید کرتے ہوئے لکھا تھا:

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ نمبر اول کے آخری صفحہ میں جہاں جناب نے "لتسون صفوفکم" پر بحث کی ہے وہاں تعجب وانکار کے لہجہ میں یہ بھی فرمایا ہے کہ آنحضرت ؐ تو نماز کی صف میں ہمارے قدموں کا اختلاف بھی پسند نہیں کرتے اور ہمارا یہ حال ہے کہ ہم سرے سے نماز کی جماعتوں ہی میں اختلاف کرتے ہیں اور پھر اس اختلاف کو اپنے لئے "رحمت" شمار کرتے ہیں۔

لیکن نہیں معلوم جناب نے اختلافِ امت کو رحمت قرار دینا کیونکر قابلِ اعتراض قرار دیا۔ جب کہ سمجھنے والوں کی یہ اپنی سمجھ ہی نہیں ہے بلکہ مشہور حدیث خود سرور کائنات کی موجب ہے کہ "اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَۃٌ" پس گو اختلاف کا اس حدیث میں اور مطلب ہو مگر لفظ تو اختلاف

کا آیا ہے اور جناب کا انکار و تعجب اس حدیث تک پہنچ جاتا ہے۔

ازراہِ لطف اس کی نسبت تشریح فرمائیے کیونکہ حضرت امام شعرانی نے "میزان" میں اس حدیث کا مصداق "اختلاف ائمۂ اربعہ" کو قرار دیا ہے۔ یہ مضمون اسی استفسار کا جواب ہے۔

بلاشبہ آپ کا یہ خیال درست ہے کہ خاتمہ کی عبارتِ منقولہ کا انکار و تعجب اس حدیث کے سوال تک منتہی ہوتا ہے لیکن نفس حدیث تک نہیں بلکہ حدیث کے اس مطلب تک جو عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے اور عموماً فتنۂ اختلاف و تحزب و تمذہب کے مباحث میں اس سے استدلال کیا جاتا ہے۔

فقیر کا اس جملہ سے مقصد صرف یہ تھا کہ جس وجود اقدس کو (بعض فداہ) امت کا تقدیم و تاخیر قدم میں اختلاف گوارا نہ تھا اس کی امت عقائد و عبادات میں مجسم اختلاف و شقاق بن گئی ہے اور پھر کہتی ہے کہ یہ رحمت ہے۔ اگر یہ رحمتِ الٰہی ہے تو بقول جاحظ کے عذابِ الٰہی یقیناً اتفاق و اتحاد ہوگا۔

رہا اس حدیث کی صحت و عدم صحت کا سوال تو اگر میں آپ کے اور عامۃ الناس کے پیش کردہ الفاظ ہی پر اڑ جاؤں تو بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ ؎

قصہ کوتہ گشت ورنہ دردِ سر بسیار بود

مگر اس عاجز کا مقصود ہمیشہ تحقیق و کشفِ حق رہتا ہے نہ کہ مکابرہ و مجادلہ پس واضح ہو کہ جن الفاظ کے ساتھ آپ نے اس حدیث کو لکھا ہے اگر اس سے قطع نظر کر لیا جائے اور صرف نفس اختلاف کو پیش نظر رکھا جائے تو بلاشبہ اختلافِ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نہ کہ اختلافِ امت کے متعلق، یہ اختلاف الفاظ ایک روایت صحیح ملتی

نے ورع کی ہے اور چاہئے کہ تمام طرق و مسانید پر نظر ڈالی جائے۔

حافظ سخاوی نے مقاصد میں اس کی تمام روایتیں جمع کر دی ہیں اور دیگر طرق کا حال بعض متاخرین کی کتابوں سے معلوم ہو جاتا ہے۔ میں ان تمام طرق کو پہلے جمع کرتا ہوں۔

(۱) بیہقی نے مدخل میں روایت کیا ہے کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کتاب اللہ پر عمل کرو اس کے ترک کے لئے کسی کا عذر مسموع نہیں اگر کتاب اللہ میں کسی معاملہ کو نہ پاؤ تو میری سنت پر عمل کرو۔ اگر میری سنت نہ پاؤ تو میرے اصحاب کے اقوال کو ڈھونڈھو میرے اصحاب ایسے ہیں جیسے آسمان میں ستارے ان سے جو کچھ لوگے اس میں ہدایت ہوگی اور اختلاف میرے اصحاب کا تمہارے لئے رحمت ہے۔

(۲) طبرانی اور دیلمی نے اپنی معجم و مسند میں بھی اسی طریق سے روایت کیا ہے اور انہیں الفاظ سے!

(۳) نصر مقدسی نے کتاب الحجت میں مرفوعاً اس روایت کو نقل کیا ہے اور زرکشی نے اس کا ذکر کیا ہے مگر اسناد نہیں لکھی ہیں۔

(۴) اسی طرح عراقی نے آدم ابن ایاس کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن لکھا ہے کہ "مرسل اور ضعیف ہے ان کی روایت کے الفاظ یہ ہیں" اِخْتِلَافُ اَصْحَابِیْ رَحْمَةٌ لِاُمَّتِیْ "

(۵) بیہقی نے رسالہ اشعریہ میں بھی درج کیا ہے مگر بغیر اسناد!

(۶) بیہقی نے مدخل میں قاسم ابن محمدؒ کا قول بروایت سفیان عن افلح بن حمید نقل کیا ہے کہ

" اختلاف اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ لعباد اللہ "

(۷) قتادہ کہتے ہیں کہ عمر ابن عبدالعزیزؒ کہا کرتے تھے۔

"اگر آنحضرت کے اصحاب میں اختلاف نہ ہوتا تو امت کے لئے آسانی اور رخصت کی وسعت نہ ہوتی"۔

یہاں تک تو ہم نے حافظ سخاوی کے المقاصد سے نقل کیا ہے لیکن طبقات ابن سعد میں بھی قاسم ابن محمدؒ کا وہ قول موجود ہے جو بیہقی نے مدخل میں نقل کیا ہے کہ "اختلاف اصحاب رسول اللہ رحمت للناس"

ابن حجر مکی نے بھی الدر المنتشرہ میں اس کے مختلف طرق کو جمع کرنا چاہا ہے مگر ان میں جو قابل ذکر تھے وہ سب اوپر آگئے

اب آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان تمام مخارج مندرجہ صور میں ایک صدا بھی ایسی نہیں ہے جس سے اس روایت کو کچھ بھی تقویت مل سکے اور جس سے حسب اصول فن دو قوم ثابت ہو سکے کہ یہ حدیث قابل احتجاج را اسناد ہے۔

اس حدیث کے تمام مخارج پر نظر ڈالئے دفعہ ۲ سے لے کر ۷ تک جس قدر مخارج ہیں اُن میں ایک حوالہ بھی ایسا نہیں ہے جس سے کوئی توثیق و سند حاصل کی جا سکے۔

طبرانی اور دیلمی کا حوالہ کوئی نئی سند نہیں ہے وہی روایت ہے جو بیہقی نے مدخل میں درج کی ہے۔ نصر مقدسی کے متعلق زرکشی، حافظ سخاوی اور ابن حجر مکی سب کہتے ہیں کہ مرفوعاً روایت کی ہے مگر ساتھ ہی تصریح کرتے ہیں کہ اسناد معلوم نہیں اور جب اسناد معلوم نہیں تو محدثین نے فیصلہ کر دیا ہے کہ ایک منٹ کے لئے بھی قابل قبول نہیں، حافظ عراقی نے بہ تغیر الفاظ اسی روایت کو لکھا ہے مگر اسناد اس کے بھی معلوم نہیں حافظ سخاوی کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک مرسل و ضعیف ہے لیکن اگر اسناد بتائی ہوتی تو معلوم کیا جاتا کہ ارسال میں بھی اس کا کیا حال ہے اور ضعف کے کیا کیا اسباب ہیں بیہقی نے ایک اور رسالے

میں بھی اسی روایت کو درج کیا ہے مگر حافظ سخاوی کی زبانی آپ سن چکے ہیں کہ بغیر اسناد! پس وہ بھی کمزور ہی ہے اور مفید سند نہیں۔

حدیث کے مخارج تو بس اسی قدر ہیں اب اس کے بعد صحابہؓ و تابعین کے اقوال آتے ہیں۔

بیہقی نے مدخل میں قاسم بن محمدؒ کا قول نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابؓ کا اختلاف بندگانِ خدا کے لئے رحمت ہے۔ لیکن یہ قاسم ابن محمدؒ کا قول ہے وہ اسے اوپر "رفع" نہیں دیتے۔

اسی طرح قتادہ کہتے ہیں عمر ابن عبدالعزیزؒ کہا کرتے تھے "اگر صحابہؓ اپنے اجتہاد و استخراج مسائل یا تنوع طریق و عمل میں مختلف نہ ہوتے تو امت کے لیے "رخصت" اور وسعت و سہولت نہ ہوتی"۔

اول تو یہ چیز ہی دوسری ہے اختلاف امتی یا اختلافِ صحابی کے عموم سے اسے کیا تعلق پھر جو کچھ بھی ہے عمر ابن عبدالعزیزؒ کا قول ہے

آخر طبقات ابن سعد کا ذکر آیا ہے۔ لیکن وہ بھی کوئی جدید سند نہیں قاسم ابن محمدؒ کا وہی قول ہے جو بیہقی نے مدخل میں نقل کیا ہے۔

اب صرف وہ ایک ہی روایت رہ گئی جو دیلمی نے مسند الفردوس میں، طبرانی نے معجم میں، اور بیہقی نے مدخل میں درج کی ہے۔ اس کے سوا اور کوئی اسناد ہمارے سامنے نہیں ہیں

لیکن اس کا یہ حال ہے کہ روایت حضرت ابن عباسؓ کی ہے جن سے ضحاک نے اور ضحاک سے جویبر نے روایت کی ارباب فن ونظر کو معلوم ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت بذریعہ ضحاک کا کیا حال ہے اور ائمۂ نقد کا کیا فیصلہ ہے۔ یہ ضحاک ابن مزاحم البلخی مشہور مفسر ہیں لیکن

ان کی احادیث کے متعلق ائمۂ حدیث نے اختلاف کیا ہے کہ وہ درخورِ قبول ہیں یا نہیں اگر اس اختلاف سے قطع نظر کر دیا جائے جب بھی یہ امر بالکل واضح طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ان کی ملاقات حضرت عباس رضؓ سے ثابت نہیں۔ اور نہ انہوں نے خود ابن عباسؓ سے کچھ اخذ کیا ہے اس بناء پر ان کی تمام مرویات "منقطع" ہیں اور یہ روایت بھی انہی میں داخل ہے۔

پھر ضحاک کے بعد اس کا راوی جویبر ہے، یہ جویبر وہی جویبر ابن سعید الازدی الخراسانی ہیں جن سے محمدؐ بن عبداللہؒ فلسطینی اور سلام ابن یزید وغیرہ نے فضائل قرآن و نکاح وغیرہ میں بڑا ذخیرہ روایت کیا ہے اور ان کی "مجروحیت" کتبِ قوم میں مشہور رہی ہے۔ ابن معین کہتے ہیں کہ وہ "کچھ نہیں"۔ نسائی اور دارقطنی جیسے ائمۂ فن کا فیصلہ ہے کہ "متروک الحدیث" جوزجانی نے کہا کہ "لا یشتغل" بہ مدراسی نے کشف الاحوال میں ابن جوزی اور سیوطی کا "لفظ" نقل کیا ہے کہ

"متروک بمرہ، وقال فی کتاب المبدء ہالک"

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ دیلمی وغیرہ کی روایت کو اگرچہ "اختلاف امتی رحمۃ" سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ صرف صحابہؓ کے اختلاف سے ہے تاہم اس کی صحت کے لئے بھی ہمارے پاس کوئی سامان نہیں ہے اور بہر سے بہتر مرجع جو اس کا ہو سکتا تھا اس کی اسناد بھی لائقِ احتجاج و اعتماد نہیں چنانچہ اسی بنا پر حافظ سخاوی نے لکھا ہے کہ

"اور ائمۂ فن میں سے ایک جماعتِ کثیرہ نے خیال کیا ہے کہ اس حدیث کی کوئی اصل ہی نہیں"۔

اس کے بعد خطابی کی نسبت لکھا ہے کہ انہوں نے "غریب الحدیث" میں اسے لیا ہے اور جاحظ اور موصلی کے قول کا رد کیا ہے۔

لیکن سوال اس رد و تغلیط کی نسبت نہیں ہے کسی وجہ سے خطابی کی رائے یہی ہوگی۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اصول مقررۂ فن کے مطابق بھی انہوں نے کوئی سند نہیں لکھی یا توثیق و تصدیق کا خارج سے کوئی مزید اثر ڈالا اس کا حال یہ ہے کہ خود حافظ سخاوی ہی اس کے برعکس لکھتے ہیں۔

کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

آپ پر واضح ہو کہ فن کا معاملہ نہایت نازک ہے اور اعتماد شخصی اور حسن ظن معتقدانہ یہاں کوئی چیز نہیں۔ متاخرین عموماً اس اعتماد کی بنا پر روایتیں قبول کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب علمار نے لکھا ہے گو انہوں نے سند نہیں لکھی، مگر ضرور کوئی نہ کوئی سند ان کے پاس ہوگی یہ بات محض حسن ظن کے لئے تو اچھی چیز ہے لیکن اگر فن میں اس سے کام لیا جائے گا۔ تو پھر کوئی فن فن باقی نہ رہے گا۔

فن حدیث کے اصول ہیں قواعد ہیں، جرح و نقد ہے، ائمۂ فن کی تصریحات ہیں، روایت ہے، درایت ہے اور محدثین کرام رحمہم اللہ نے بالاتفاق ہمیں بتلا دیا ہے کہ جس حدیث کی سند نہ بتلائی جائے بلا تامل اسے رد کر دو۔ پھر ہم ان بزرگوں کے اصولوں پر عامل ہوں یا ان کی جمع و گرد واری پر؟ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ محدثین کی احتیاط کا یہ حال ہے کہ وہ بغیر سند اور حوالۂ مخرج، نقلِ حدیث تک کو جائز نہیں رکھتے۔

حافظ ابن الصلاح کے مقدمہ کو دیکھئے کہ نوع اول کے آخر میں کیا لکھتے ہیں۔ علامہ نووی کی شرح مسلم کی تصریحات پر نظر ڈالیے کہ انہوں نے نقلِ روایت کے لئے کیا شرائط بیان کئے ہیں۔

انھیں چیزوں کے لیے طبقۂ محدثین متوسطین نے اصطلاح "الوجادہ" وضع کی اور

اس کی آٹھ قسمیں قرار دیں جن کی رعایت کے بغیر نقل حدیث جائز نہیں۔ السماع، والقراۃ والاجازہ، والمناولہ، والمکاتبہ واعلام الشیخ، والاوصیۃ بالاکتاب!

اس کے مقابلے میں آج کل کی حالت دیکھیے کہ اگر تصوف و مواعظ کی کسی کتاب میں کوئی روایت نظر سے گذر گئی تو بغیر علم اسناد و مخارج کے ہر صاحب عمامہ حق رکھتا ہے کہ بلاتامل استدلال و احتجاج کرے اور پورے اطمینان سے کہدے کہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

## معنی اختلاف صحابہؓ

آیئے اس سے قطع ہی کرلیں کہ اصل روایت کا کیا حال ہے اس کو دیکھیں کہ جن علما نے اس روایت پہ اعتماد کیا ہے وہ اختلاف سے کونسا اختلاف مراد لیتے ہیں۔ مختلف مذہبوں جماعتوں عقیدوں اور صورہا اشکال عبادات و اعمال کا اختلاف یا اور کوئی اختلاف۔

یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا کہ الفاظ مشہورہ "اختلاف امتی رحمۃ" کی کوئی اصلیت نہیں ملتی۔ البتہ اختلافِ صحابہؓ کے رحمت ہونے کے متعلق ایک سند بیان کی گئی ہے۔ پس دیکھنا یہ ہے کہ بصورت صحتِ روایت صحابہؓ کے اختلاف سے بھی کون سا اختلاف مراد ہے۔

کیا وہ اختلاف جس نے کئی دن تک حضرت عثمانؓ کے مکان کا محاصرہ کیا غذا اور پانی بند کیا اور بالآخران کی مظلومانہ شہادت کا باعث ہوا۔ کیا وہ اختلاف جس کی مختلف دو جماعتیں مدینہ اور مکہ سے نکلیں اور جس کا نام تاریخ نے "جنگ جمل" رکھا ہے اگر یہ نہیں تو کیا وہ اختلاف جس کی تلواریں "صفین" میں بے نیام ہوئیں اور جس کی بدولت صدہا صحابہ کرامؓ مقتول و شہید ہوئے آپ یقیناً کہیں گے کہ نہیں، یہ نہیں وہ اختلاف جو موجب جدال و قتال ہونے کے عوض سبب

رحمت و فیضان ہوا ۔ چنانچہ جن علمائے نے اس روایت پر اعتماد کیا ہے ان میں سے بھی بعض نے صاف صاف تصریح کردی ہے کہ اختلاف سے مراد مذاہب و جماعت و فرقہ بندی کا اختلاف نہیں ہے بلکہ فہم و تدبر مسائل، اجتہاد و طرزِ اجتہاد، استنباط و طریقِ استنباط مسالک مختلفہ علم و عمل، اور سلوک و مجاہدات دینیہ کا اختلاف مراد ہے یا اور کوئی اسی طرح کا اختلاف جو امت کے لئے ایک نظیر اور اسوۂ حسنہ کے لحاظ سے نیز نتائج و اتباع کے لحاظ سے رحمت تھا

اصل یہ ہے کہ روایت میں جس طرح "اختلاف" کا لفظ آیا ہے اور جس ترتیب سے آیا ہے وہ خود بتلا رہا ہے کہ اختلاف سے مقصود کیا ہے ۔

روایت کا موضوع یہ ہے کہ امت کے لئے عمل و اتباع کے اصول مخارج کیا کیا ہیں ۔ فرمایا کہ سب سے پہلے کتاب اللہ ہے ۔ قرآن حکیم میں جو کچھ تمہیں دیدیا گیا ہے کسی حال میں اس سے اغماض و غفلت نہیں کرنا چاہیے ۔ لیکن اگر ایسے معاملات پیش آجائیں کہ ان کی تفصیل و جزئیات سے قرآن حکیم خاموش ہو تو سنت کی طرف متوجہ ہو اور دیکھو کہ حاملِ قرآن کا اسوۂ حسنہ کیا کہتا ہے اگر یہ بھی خاموش ہو تو پھر عہد نبوت کے صحبت یافتہ اور تیار کردہ جماعت کے اجتہاد اور قضایا ہیں ان کو دیکھو کہ کیا روشنی بخشتے ہیں ۔ لیکن چونکہ فہم و استنباطِ مسائل و تعلیمات میں ہر دماغ ایک خاص حالت رکھتا ہے اس لئے ضرور ہے کہ صحابہؓ کے اجتہادات میں بھی اختلاف ہو اور ایک ہی مسئلہ کے متعلق ممکن ہے بعض صحابہؓ مختلف رائیں رکھتے ہوں پس فرمایا کہ ان کے اس اختلافِ اجتہاد اور طریقِ فہم و استنباط سے مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسی کے اندر حقیقت موجبہ کو تلاش کرنا چاہیے یہ اختلاف اجتہاد طبیعی ہے اور یہ کوئی مصیبت نہیں "رحمت" ہے اگر فہم و اجتہاد میں اختلاف نہ ہوتا تو دنیا کی عقلی و دماغی ترقی رک جاتی ۔

چنانچہ یہ بالکل بیان واقعہ ہے ہر شخص جانتا ہے کہ فہم و استنباطِ مسائل و طرق استدلال

اجتہاد میں صحابہؓ کرام مختلف تھے مگر چونکہ جماعت بندی اور تمذہب و تحزب نہ تھا الی اللہ و الی الرسول کے آگے سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں اور ہر شخص اپنی رائے و قیاس کو کتاب و سنت پر عرض کرتا تھا اس لئے ان کا اختلاف یقیناً رحمت تھا جس سے شریعت کے حقائق ابھرے اور اس کا ہر گوشہ نمایاں ہوا ان کا اختلاف وہ ایک اختلاف نہ تھا جو دراصل ایک عذاب الٰہی ہے، اور جس کی نسبت امتِ مرحومہ کی وصیت کی گئی تھی کہ

لاتکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاءھم البینات اولئک لھم عذاب عظیم

حضرت ابن عباسؓ تمتع بالعمرہ الی الحج کے قائل تھے بعض دیگر صحابہؓ کو اس سے اختلاف تھا جب عروہ نے ان سے کہا کہ افراد حج افضل ہے تو انہوں نے کہا تَمَتَّعَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عروہ نے کہا وَلٰکِنَّ اَبُوْبَکْرٍ وَعُمَرُ لَمْ یَفْعَلَا اس پر حضرت ابن عباسؓ نے غضبناک ہو کر اور "فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَاِلَی الرَّسُوْلِ سے معمور فرمایا

"ممکن ہے کہ تم پر آسمان سے سنگ باری ہو میں کہتا ہوں کہ کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور اس پر تم حجت لاتے ہو کہ کہا ابوبکرؓ و عمرؓ نے!

چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم ۔۔۔ نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

اسی واقعہ سے اندازہ کر لیجئے کہ فردوہ الی اللہ والی الرسول کا کیا جاہ و جلال صحابہؓ کی نظروں میں تھا اور جب حالت یہ تھی تو ظاہر ہے کہ ان کا اختلاف فہم و اجتہاد کیوں نہ موجبِ رحمت ہوتا۔

صحابہؓ کے اندر سماع موتیٰ میں اختلاف تھا لیلۃ الاسراء کے متعلق اختلاف تھا۔ تیمم جنابت کے متعلق اختلاف تھا، وجوب غسل از اکسال کے متعلق حضرت عائشہؓ کا فتویٰ اور تھا اور حضرت علیؓ، عثمانؓ، طلحہؓ، ابو ایوبؓ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم اجمعین کا فتویٰ دوسرا تھا لیکن ان میں کوئی اختلاف بھی فتنۂ تحزب و تشیع تک منجر نہ ہوا۔ یہی معنی اختلاف اصحابی رحمۃ

کے ہیں اور فی الحقیقت یہ اختلاف رحمتِ الٰہی تھا۔

## اختلاف صحابہؓ اور قرآن

حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے عزائم و رخص کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ مقصود اختلافِ افکار نہیں بلکہ اختلافِ اعمال ہے۔

حضرات صحابہؓ کرام کو ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے عمل صالح اور طلب مصالح میں وہ تمام مختلف طریقے اختیار کئے جن کا ہر امتِ عادلہ و صالحہ کے اندر ہونا ضروری ہے سب ایک ہی راہ جہد و طلب کے عامل نہ تھے۔

ایک جماعت تھی جس نے تفقہ فی الدین کی طرف زیادہ توجہ کی اور علوم نبویہ کی حامل و محافظ ہوئی۔ ایک جماعت تھی جس نے زیادہ وقت جہاد و قتال فی سبیل اللہ میں صرف کیا اور دشمنانِ حق سے شریعت کو محفوظ کیا۔ ایک گروہ تھا جس نے طلبِ معاش صالح اور تجارت و کسبِ حلال پر زیادہ وقت صرف کیا اور اس طرح ان کی تاجرانہ زندگی بھی اشاعتِ حق و تبلیغ احکام و تائید و نصرت دین کا ذریعہ بنی غور کیجئے کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں کس طرح ٹھیک ٹھیک قرآن کریم سے ماخوذ ہے خود اللہ تعالیٰ نے سورۂ مزمل کے آخر میں صحابہ کرامؓ کے مجموعی اعمالِ مقدسہ و طیبہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔

بیشک تمہارا پروردگار تمہاری ہر حالت کی خبر رکھتا ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو سب اس کے سامنے ہے وہ جانتا ہے کہ تم راتوں کو تقریباً دو تہائی رات تک یا آدھی رات اور ایک پہر تک ذوقِ عبادت میں مستغرق کھڑے رہتے ہو اور تمہارے اصحاب میں سے بھی ایک جماعت اس عالم

میں تمہارے ساتھ ہوتی ہے اللہ نے رات اور دن کی تقسیم اوقات
کی ایک تقدیر کر دی ہے اور وہی ان کا اندازہ فرما ہے اس کو یہ بھی
معلوم ہے کہ تم ان اوقاتِ عبادت کو نباہ نہیں سکتے۔ پس اس نے
تم پر سے اس قدر شدید عبادت اٹھا دی۔ یہ ضروری نہیں کہ تم
آدھی آدھی رات اور تین تین پہر تک خداوند کے حضور میں کھڑے
رہو۔ یوں کرو کہ جس قدر بھی آسانی کے ساتھ رات کو نوافل میں قرآن
پڑھ سکو پڑھ لیا کرو۔ خدا کو معلوم ہے کہ تم میں بعض عبادت گذار ایسے
ضعیف الجسم ہیں کہ اگر آدھی آدھی رات تک اس طرح عبادت کریں
گے تو بیمار ہو جائیں گے۔ اور خدا کا عبادت سے یہ مقصود نہیں وہ
جانتا ہے کہ کچھ لوگ ان میں ایسے ہوں گے جو تجارت اور کسبِ رزق
نیز حصولِ فوائد و نعائم کی تلاش میں سفر کریں گے اور یہ کیسے ہو سکتا
ہے کہ سفر کی حالت میں ایسی شدید عبادت کو بھی جاری رکھیں۔ نیز
وہ خبر دار ہے کہ ان میں بعض لوگ حق و صداقت کے لئے دشمنانِ اسلام
سے لڑتے ہیں ان کے شب و روز زیادہ تر اسی میں بسر ہوں گے پس تم
چاہیئے کہ راتوں کو وقت کی قید اٹھا دو جس قدر آسانی سے ہو سکے
قرآن کو نماز میں پڑھو اور صلوٰۃ الٰہی کو قائم کرو۔ زکوٰۃ ادا کرو اپنے
مال و دولت کو خدا کی راہ میں لٹاؤ۔ یہ گویا اللہ کو قرض حسنہ دینا ہے،
جس کے بدلے اس کے خزانے سے دونوں جہانوں میں پاؤ گے (۲۰:۷۳)

اللہ اللہ وہ کیا لوگ تھے جن کے اعمال کی یہ تصویر و تقسیم تھی اور وہ کیسی پاک

روحیں تھیں جن کی جاں نثاریوں اور عبادت گذاریوں کا حال ایک عاشقانہ محبت و شفقت کے لہجہ میں خود خدائے تعالیٰ نے فرمایا اور ان کے ذکر باقی کو صفحات کلام اللہ نے ہمیشہ کے لئے ثبت کر دیا۔

بہرحال ان آیات کریمہ میں ضمناً قرآن حکیم نے خود ہی بتلا دیا ہے کہ صحابہ کرام کی راہ عمل مختلف تھی بعض فضل الٰہی کی تلاش میں سیر و سیاحت کرتے تھے اور بعض جہاد فی سبیل اللہ کی راہ میں نکلتے تھے۔ پھر کیوں آپ اس روایت میں لفظ "اختلاف" کا یہی مطلب نہ قرار دیں کہ ان کا طریق کار حسب اصول تقسیم عمل مختلف تھا اور یہ اختلاف قطعاً رحمت ہے اور ایسی رحمت عظیم کہ اگر نہ ہو تو دنیا کے عمران و تمدن کی بنیادیں ہل جائیں گی۔

اس سے بھی دو قدم اور آگے بڑھئے اور دیکھئے کہ عزائم و رجحان کے لحاظ سے بھی فی الحقیقت صحابہ کرام کی راہیں مختلف تھیں۔ حضرت ابوذر زہد و نسک میں منہمک تھے حضرت عثمان بن مظعون اور حضرت عبداللہ ابن عمر پر استغراق عبادت و ترک لذائذ دنیوی کا غلبہ تھا حضرت ابی ابن کعب ابن مسعود ابن عباس حفظ و درس علوم پر زیادہ وقت صرف کرتے تھے۔ اور حضرت عثمان ابن عفان نے کسب و تجارت پر اوروں سے زیادہ توجہ کی۔

پس اگر صحابہ میں یہ اختلاف نہ ہوتا اور سب کے سب مثل حضرت ابوذرؓ اور ابن مظعون کے زہد و ترک لذائذ میں مستغرق ہو جاتے تو نتیجہ یہ نکلتا کہ ان کا نمونہ امت مسلمہ میں آگے چل کر وہ غلو اور حرج پیدا کر دیتا جو اہل کتاب کے "رہبان" میں پیدا ہوا اور جس کو اسلام نے دور کیا ورھبانیۃ ابتدعوھا

لیکن اگر سب کے سب امیر معاویہ اور عمرو بن العاص کے سیاست اور محبت نعیم و زینت و ریاست میں منہمک ہو جاتے تو تمام امت محض مادیت و جمعیت ہی میں غرق ہو جاتی

اور روحانی لذتوں کا کوئی کھوکا نہ رہتا یہ جو کچھ عرض کیا گیا یقین کیجئے کہ قرآن حکیم ہی کی بخشی ہوئی روشنی ہے اللہ اپنی راہ یہی ہے کہ ہر روشنی جو آنکھ دیکھے اس کا اکتساب نور اسی آفتاب ہدایت سے کیا جائے خود یہی زیر بحث روایت بتلاتی ہے کہ سب سے پہلے کتاب اللہ سے اخذ وفیضان کرو اور اس لئے ہر روایت کو بھی سب سے پہلے کتاب اللہ پر عرض کرنا چاہیئے اختلاف کی نوعیت کے متعلق ایک اور آیت آخر سورۂ توبہ کی تلاوت کیجئے۔

سارے مسلمان تو اس کام کے لئے ہو کر نہیں نکل سکتے پس کیوں نہ ایسا ہو کہ ہر جماعت میں سے ایک گروہ اس غرض سے نکلے کہ دین کے علم و احکام کو حاصل کرے اور دین کا مبلغ و داعی بن کر اپنی قوم میں واپس جائے اور باطل پرستی کے نتائج سے اس کو ڈرائے (۹ ! ۱۲۴)

پس یہی اختلاف صحابہؓ کے مختلف گروہوں اور کاموں میں تھا جو امت کے لئے رحمت ہے جس سے اب ہم محروم ہیں۔

# حکمِ تعظیم و احترام اسمی آنحضرت صلعم

ایک صاحب عبدالمجید خان نے حیدر آباد سے لکھا تھا۔

جناب نے جلال نوری بک کے حالات لکھتے ہوئے ارقام فرمایا تھا۔

"محمد ابن عبد اللہ (صلعم) نے اپنی عمر کے ۶۳ برس چار مہینے کے بعد بھی آغوشِ الٰہی میں رہا"۔

اس پر مولوی نواب علی صاحب ایم اے نے اعتراض کیا کہ اس طرح لکھنا ادب و تعظیم کے خلاف ہے آپ نے اُن کا خط چھاپ کر اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔"

لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اصلی تعظیم اور ادب دل سے ہے یا چند رسمی الفاظ سے! عیسائی بائبل کو ہم لوگوں کی طرح جزدان میں نہیں رکھتے مگر سچی تعظیم کرتے ہیں اللہ باوجودیکہ حضرت مسیحؑ کو نبوت سے بھی بلند درجہ

دیتے ہیں۔ مگر ہمیشہ بے تامل صرف "مسیح" لکھتے ہیں علاوہ بریں بعض موقعوں پر اختصار کی ضرورت ہوتی ہے اور بعض مقاموں پر اس اہتمام کی وجہ سے نفسِ عبارت قائم نہیں رہتا)

اب محض اس عبارت کے ٹکڑے کی بحث نہ رہی بلکہ آپ نے ایک اصولی مسئلہ چھیڑ دیا افسوس ہے کہ فقیر آپ کے خیال سے کسی طرح متفق نہیں ہو سکتا۔ بیشک سچا ادب و احترام وہی ہے جو دل سے ہو نہ کہ زبان سے مگر صرف اسی پر موقوف نہیں۔ انسان کا کوئی خیال اور اعتقاد ایسا نہیں ہے جس کا گھر دل کی جگہ حلق میں ہو۔ اعتقاد چیز ہی ایسی ہے جو دل اور دماغ دونوں سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ دل کے اعتقاد کا ترجمان کون ہے۔ کیونکر معلوم ہو کہ یہ دل ابوذر غفاریؓ کا ہے۔ اور یہ دل ابوجہل شقی کا؟ جواب صاف ہے کہ صرف اعمال اور زبان کا اعتراف کہ "نحن نحکم بالظواہر"۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر دنیا میں سیاہ و سفید کی تمیز ہی اٹھ جائے۔

قانون کو دیکھیے کہ وہ نیت اور ارادے کو اُن کی پوری جگہ دینے سے انکار نہیں کرتا لیکن ساتھ ہی اگر آپ عدالت میں جا کر مجسٹریٹ کو "یوآنر" کی جگہ محض تم کہہ کر خطاب کیجئے گا تو گو آپ کتنا ہی کہیں کہ تعظیم کی جگہ دل ہے لیکن امید نہیں کہ وہ آپ کو دفعہ ۲۲۸ سے بری کر دے۔ مذہب بھی ایک روحانی قانون ہے۔ اس نے خود بھی "انما الاعمال بالنیات" کا اصول قائم کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اعمال ظاہری و لسانی کو بھی اہمیت دیتا ہے اور ہم نے یہ نہایت سچی تعریف عقائد میں اسلام کی تسلیم کر لی ہے کہ اقرار باللسان و تصدیق بالجنان وعمل بالارکان۔

آپ کہتے ہیں کہ تعظیم کی اصلی جگہ دل میں ہے میں کہتا ہوں کہ چونکہ دل ہے اسی لئے

آج کل تعلیم یافتہ اشخاص کی زبان اور عمل تعظیم سے خالی ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ جو نام دل کو محبوب و محترم ہو وہ زبان پر گذرے اور محبت و احترام سے خالی ہو۔ اگر آپ کسی کو چاہتے ہیں تو سمجھ سکیں گے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں ؎

قسم بنام تو خوردن دلیل غیرت نیست بخاک پاک تو آں ہم کمال بے ادبیست

آج کے ارباب تحریر و تقریر کو اکثر دیکھتا ہوں کہ انھوں نے بقول آپ کے آنحضرت صلعم کے اسم سامی کے تعظیمی الفاظ کی طوالت سے گھبرا کر بانی اسلامؑ کی ایک اصطلاح تصنیف کر لی ہے۔ وہ بلا تامل اپنی تحریر و تقریر میں یہ لفظ بولتے اور لکھتے ہیں اور اس طرح ٹھیک ٹھیک ان کی زبان ان کے دلی الحاد کی ترجمانی کرتی ہے اگر یہ سچ ہے کہ ان کے دل میں آنحضرت صلعم کی تعظیم ہے تو ان کو بار بار یہ اسم محبوب و مطلوب درود و صلواۃ کے ساتھ لینا تھا۔ کہ محبوب کی یاد کی جتنی تقریبیں نکل آئیں عین مقصود عشق ہے۔ ایک جلیل القدر محدث سے جب پوچھا گیا کہ آپ کو علم حدیث سے اس درجہ شوق کیوں ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ اس لئے کہ اس میں بار بار قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جملہ آتا ہے اور اس طرح اس اسم گرامی کے ذکر اور اس پر درود و صلواۃ عرض کرنے کی توفیق اور تقریب ہاتھ آجاتی ہے۔

یہ نہ سمجھئے گا کہ محض اعتقاد قلبی اور جوش و تعظیم احترام اسلامی اس اعتقاد کا ذریعہ ہے۔ نہیں بلکہ فی الحقیقت آنحضرتؐ کی یہ تعظیم اسمی بھی ایسے نصوص قطعیہ پر مبنی ہے جس سے کوئی قائل قرآن انکار نہیں کر سکتا۔

بنی تمیم کا جب ایک وفد مدینہ میں آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکان میں تشریف رکھتے تھے نادانوں نے دروازے سے آپ کا اسم گرامی لے لے کر پکارنا شروع کر دیا یا محمدؐ اخرج الینا۔ اللہ تعالیٰ کو آپ کی اتنی گستاخی بھی گوارا نہ ہوئی ارشاد ہوا۔

اے پیغمبر جو لوگ تم کو مکان کے باہر سے نام لے لے کر پکارتے ہیں ان میں اکثر ایسے ہیں جن کو مطلق عقل اور تمیز نہیں بہتر تھا کہ وہ صبر کرتے اور جب تم باہر نکل آتے تو وہ مل لیتے۔

ایک اور آیت میں فرمایا:۔

اے مسلمانو! جب آنحضرت صلعم کے حضور میں عرض حال کرو تو اپنی آواز کو ان کی آواز سے زیادہ بلند کر کے گفتگو نہ کرو اور نہ بہت زور سے بات چیت کرو جیسا کہ تم آپس میں کیا کرتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ اس گستاخی کے سبب سے تمہارے اعمال صالح ضائع جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔

خدا تعالیٰ کو یہ بھی گوارا نہیں کہ آپ کی جناب میں کوئی اونچی آواز سے گفتگو کرے چہ جائیکہ تعظیم و تکریم کے بغیر نام لیا جائے، قرآن کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہو کہ خدا تعالیٰ نے پہلے خود آپ کے اس امتیازی شانِ تعظیمی کا ہر جگہ نمونہ قائم کیا ہے۔ جس قدر انبیائے اولوالعزم سے تخاطب قرآن میں موجود ہے۔ ہر جگہ آپ پائیں گے کہ ان کا اصلی نام اور علم لے کر انہیں پکارا گیا ہے۔ مگر آپ کا احترام خداوند تعالیٰ کو اس درجہ ملحوظ ہے کہ تمام قرآن میں جہاں کہیں پکارا ہے تو صدائے تعظیم و تکریم سے اور یا پھر صدائے محبت و عشق سے ؎

بہتر از زندگی قامتِ موزوں نازم — یک قبا نیست کہ شائستہ اندام تو نیست

اللہ اللہ جس شہر کی خاک آپ کے قدموں سے مس ہو حق اللہ تعالیٰ کو وہ بھی اس درجہ محبوب ہے کہ اس کی قسم کھاتا ہے۔

"اے پیغمبر! ہم شہر مکہ کی قسم کھاتے ہیں اور اس لئے کہ تم اس میں مقیم ہو۔"

حقیقت یہ ہے کہ دلی اعتقاد ایک بیج ہے جو بغیر محبت کی زمین کے بار آور نہیں ہوتا اور محبت کے لیئے احترام و تعظیم ناگزیر ہے۔

محدثین نے اس مسئلہ پر بہت بحث کی ہے کہ مومن کے لیئے اللہ کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی اتباع احکام کی طرح اجباری ہے یا اختیاری، کیونکہ محبت اختیاری شئے نہیں اور اصل مقصود احکام اسلام کی پیروی ہے۔ لیکن غور کیجئے تو اس سوال کی گنجائش ہی نہیں۔ محبت کے اجباری و اختیاری ہونے کا سوال تو جب پیدا ہو جب محبت اور ایمان دو چیزیں ہوں حالانکہ ایمان تو از سرتا پا محبت ہے اور وہ ایمان ایمان نہیں جو محبت سے خالی ہو۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ

اگر آنحضرت صلعم کا اتباع محبت و محبوبیت الٰہی کے لیئے شرط ہے تو محبت بدرجہ اولیٰ شرط ہے۔

تم میں کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے آگے محبوب تر نہ ہوں اُس کے ماں باپ سے اس کی اولاد سے اور اتنا ہی نہیں بلکہ تمام انسانوں سے (صحیحین)

ایک مرتبہ جب حضرت عمرؓ نے آپ سے کہا " آپ محبوب تر ہیں مجھ کو تمام چیزوں سے البتہ اپنی جان سے زیادہ نہیں" تو آپؐ نے فرمایا " قسم خدا کی کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک مجھ کو اپنے نفس سے بھی زیادہ محبوب نہ رکھے"۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ " اب دیکھتا ہوں تو آپؐ اپنی جان سے بھی زیادہ مجھے محبوب ہیں" تب آپؐ نے فرمایا " اب اے عمرؓ تیرا ایمان کامل ہو گیا۔

تو حضرت اپنا اعتقاد تو یہ ہے ' انصاف کیجئے کہ میں کہاں ہوں اور آج کل زمانہ کہاں

ہے لوگ جس شئی کو ایمان کی اقلیم کہتے ہیں میں تو اس کو اس وجود محبوب و مطلوب کے ایک ذرۂ محبت کے اندر دیکھتا ہوں اسی سے تعظیم اسمی و رسمی جو کچھ آپ کو مقصود ہو قرار دے لیجئے۔

ترا نوالہ و ما دم ز خوان "لیطعمنی" — ترا پیالہ مدام از شراب "یسقینی"

مرا تو قبلۂ دینی، ازاں سبب گفتم — بروماں کہ "لکم دینکم ولی دینی"

لیکن یہ عالم دوسرا ہے اور ان باتوں سے ذوق لینے کے لیے آج کل کی آب و ہوا موافق نہیں کس سے کہا جائے اور کس سے سنا جائے۔

جن دلوں میں خدا کے اعتقاد کو جگہ نہ ملی وہاں اس کے رسول اور کتاب کی عزت کو کون پوچھتا ہے۔ جن سے منصب رسالت اور وجودِ وحی کے اعتقاد کی امید نہیں اُن سے رسول کی عزت کی کس نادان کو توقع ہے۔ دل کی تعظیم کا نام نہ لیجئے کہ جب دل خالی ہوتا ہے تو زبان کو بھی کچھ نہیں لگتا۔ یہ عیسائیوں کی نظیر و اتباع و اتباع و تقلید کے لئے خیر سے ایک وسیع میدان آپ حضرات کے سامنے پہلے سے موجود ہے اور الحمد للہ کہ اس کا کوئی گوشہ اس اتباع کی برکت سے خالی نہیں اتنے ہی پر قناعت کیجئے اور نئے مسائل وضع نہ کیجئے۔ آپ کے ائمۂ ہدیٰ یعنی مجتہدین فرنگ جیسی کچھ مسیحی مذہب اور بائبل کی وقعت کرتے ہیں اس کا حال ہمیں معلوم ہے آپ کی طرح ان کا بھی دل اور زبان دونوں خالی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کو جو مذہب ملا اس سے یقیناً ان کی تشنگی بجھ نہیں سکتی تھی لیکن آپ جس چشمہ کے کنارے رہ کر تشنہ ہیں اس کے بعد کوئی نہیں جو پیاس بجھا سکے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ
وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

# مسئلہ تسمیہ طٰہٰ و یٰسین

ایک صاحب نے مولوی رحیم بخش صاحب آروی سے فتویٰ طلب کیا تھا کہ اگر کسی کا نام طٰہٰ اور یٰسین رکھ دیا جائے تو کیا وہ جائز ہوگا۔ مولوی صاحب نے جواب دیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ طٰہٰ اور یٰسین نام رکھنا ناجائز ہے بلکہ جس شخص کا یہ نام ہو اس کے پیچھے نماز بھی درست نہیں بعدہٗ مولانا آزاد سے رجوع کیا۔ آپ نے اصل صورت مسئلہ ان لفظوں میں سمجھائی

○

ناموں میں ان کے معانی کی رعایت ہونا عقلاً واضح و بین اور احادیث صحیحہ سے ثابت و معلوم ہے۔ اگر ناموں میں معانی ملحوظ نہیں تو عبدالمسیح اور عبدالعزیٰ کیوں ناجائز ہوئے اور کیوں بدلے گئے۔

کسی کتاب کا ہم نام رکھتے ہیں تو کتاب کے موضوع و مقصد کو ملحوظ رکھتے ہیں پھر یا للعجب اگر انسان کے نام میں جس سے وہ مدت العمر پکارا جائے گا۔ اور جو ہمیشہ کے

لئے اس کا علم و خطاب ہوگا معنی صحیح و مفہومات مستحسنہ کی رعایت محفوظ نہ رکھی جائے۔

احادیث اس بارے میں بے شمار ہیں اور کتب محدثین میں یہ بحث بہ تفصیل موجود ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنی ایک لڑکی کا نام عاصیہ رکھا تھا۔ آنحضرت نے بدل کر "جمیلہ" رکھا حضرت علیؓ نے اپنے صاحبزادے کا نام حرب رکھا۔ عرب میں یہ نام بکثرت رکھا جاتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا "حسنؓ" رکھو جب دوسرے صاحبزادے تولد ہوئے تو حضرت علیؓ نے پھر وہی "حرب" تجویز کیا آپ نے پھر بدل دیا اور "حسینؓ" رکھا۔ تیسرے صاحبزادے کا نام بھی حضرت علیؓ نے یہی رکھا تھا اور پھر آنحضرتؐ نے ان کا نام بدل کر "محسن" کر دیا۔ حضرت سعید ابن مسیب کہتے ہیں کہ میرے جد امجد جب آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے نام پوچھا۔ عرض کیا "حزن" فرمایا بل انت سہل۔

مجھے اس وقت فرصت بالکل نہیں ہے اور کتابوں کو نہیں دیکھ سکتا لیکن یاد پڑتا ہے کہ ابوداؤد میں بروایت ابو وہب ہے کہ فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاء کرام کے نام رکھا کرو اور سب سے زیادہ پیارا نام اللہ کے نزدیک "عبداللہ" اور "عبدالرحمٰن" ہے۔

ان تمام تصریحات و واقعات سے ثابت ہوا کہ (۱) شرع نے ناموں کے معانی و مطالب کی رعایت کی ہے جیسا کہ از روئے عقل صحیح بھی ہونی چاہیئے۔ نام سب سے پہلی چیز ہے جو مسمیٰ کو نمایاں کرتی ہے اور اس کی رعایتِ معانی صحیحہ و مستحبہ کا اثر مسمیٰ کی شخصیت و وجود پر لازمی ہے (۲) مسلمانوں کے ناموں کے لئے ضروری ہے کہ تمام غیر شرعی نسبتوں سے پاک ہو۔ (۳) مومن و مسلم ہستی وہ اشرف و اعلیٰ ہستی ہے جس کو خدا نے "خیر البریہ" قرار دیا ہے، تمام کرۂ ارضی میں اس سے اشرف و اعلیٰ کوئی وجود نہیں پس ان کے نام بھی ایسے ہونے چاہیئں جو بلحاظ اپنے مطالب و معانی کے اشرف و اعلیٰ ہوں اور انسانیت

وایمان کو واضح کرنے والے ہوں (۴) آنحضرتؐ نے ہمیشہ ایسے ناموں کو بدل دیا جن کے معانی اخلاقِ فاضلہ و خصائص حسنہ کے خلاف تھے کیونکہ یہ شرف انسانی و اسلامی کے خلاف ہے لیکن آج کل ہزارہا مسلمان جہالت سے ایسے نام اپنے بچوں کے رکھتے ہیں جو الفاظ کے لحاظ سے کریہہ الصوت اور معانی کے لحاظ سے ارذل و اسفل ہیں۔

مثلاً دیڑی، چھکوڑی، الشبراتی، اچھٹن، بدھن وغیرہ وغیرہ من الخرافات — تو یہ سب شرعاً بالکل ناجائز ہیں۔ اللہ اپنے وجود مومن مسلم کو جو اللہ کے آگے زمین و آسمان کی تمام کائنات سے افضل و برتر ہے ذلیل و خوار کرنا ہے۔ علماء کا فرض ہے کہ ایسے ناموں کو حکماً بدل دیں۔

(۵) فرمایا کہ انبیاء کرام کے نام رکھو کیونکہ انبیاء کرام کے نام بہت اجمل و احسن ہیں ان کے ہم اسم ہو کر ان کے اعمالِ جلیلہ و اسوۂ حسنہ کی پیروی کا شوق ہوگا ؎

فتشبہوا ان لم تکونوا مثلہم　　　ان التشبہ بالکرام کرام ؏

میں نے جب ابوداؤد میں یہ الفاظ پڑھے تھے اَحَبُّ الْاَسْمَاءِ اِلَی اللّٰہِ عَبْدُ اللّٰہِ تو کہہ نہیں سکتا کہ قلب و جگر کا کیا حال ہوا تھا۔ آہ ایسا کیوں نہیں ہے کہ جگر پھٹ جاتے اور کیوں دلوں کے ٹکڑے منہ سے نہیں نکل پڑتے۔ اللہ اللہ اس کو تو ناموں میں بھی وہی نام پسند ہے جس میں اس کی غلامی کی نسبت ہو اور ہمیں اپنے کاموں میں وہ کام پسند جو دوسروں کی غلامی کی لعنت سے مخذول و ملعون ہوں۔

آپ کہیں گے کہ مبحث کیا ہے اور کہہ کیا رہا ہوں، ہاں یہ سچ ہے۔ مگر کیا کروں کوئی بحث ہو مگر دل کے اصلی زخم کو نہیں بھلا سکتا اور جب ٹیس اور تپک ہو تو ہر صحبت میں آہ نکل ہی آتی ہے۔ رہا آپ کا دوسرا سوال کہ لیٰسین اور طٰہٰ نام رکھا جائے تو مولٰینا رحیم

بخش صاحب نے جو جواب دیا ہے صحیح ہے اور اولیٰ یہی ہے کہ ان سے احتراز کیا جائے کیونکہ ان کے معانی یقینی طور پر محقق نہیں اور اس لیے حضرت امام مالک کی نہی قابلِ قبول و مدلل!

البتہ مولوی صاحب کا یہ تشدد کہ جس شخص کا نام طٰہٰ و یٰسین ہو اس کے پیچھے نماز درست نہیں بالکل غلط اور یکسر قابل رد و انکار ہے، صحتِ امامت کے شرائط مجھ کو معلوم ہیں اور اُن پر تسمیہ طٰہٰ سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ معلوم نہیں اصلی حالات کیا ہیں اور کیا امور مفتی کے سامنے پیش کیے گئے۔

---

# نمازِ قصر بحالتِ امن و راحت

ایک مستند اور بزرگ عالم نے نماز قصر کے متعلق فرمایا کہ ریل کے سفر میں جائز نہیں۔ کیونکہ قصر کا حکم اس وقت ہوا تھا جبکہ خوف و جنگ اور شدائد و تکالیف کے ساتھ سفر ہوتا تھا اس کی نسبت احقر نے جناب سے دریافت کیا تھا۔ آپ نے ارقام فرمایا کہ احادیث صحیحہ سے قصر کرنا ہر حال میں ثابت ہے چنانچہ میں نے اُن سے بیان کیا۔ لیکن اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ احادیث میں تو اختلاف ہے۔ حضرت عثمانؓ و حضرت عائشہؓ کی نسبت ثابت ہے کہ وہ قصر نہیں کرتے تھے اتنے بڑے جلیل القدر اصحاب نے جب قصر نہیں کیا تو پھر کیونکر سنت ہو سکتا ہے۔ میں نے آپ کا حوالہ دیا تو انہوں نے کہا کہ انھیں حدیث کی کچھ خبر نہیں

اب احقر و نیز یہاں کے مسلمان حیران ہیں کہ کیا کریں۔

احقر العباد احمد علی

(۱) قرآن کریم میں سفر اور خوف کے وقت نماز کے قصر کرنے کا حکم سورۂ نساء میں بہ تصریح موجود ہے اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر اور خوف دونوں حالتوں میں نماز گھٹا کر یعنی قصر کر کے پڑھنا چاہئے سفر کی تصریح اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ میں موجود ہے۔ لیکن چونکہ اس کے بعد حالت خوف و جنگ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس لئے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں سفر سے مقصود خاص وہی سفر ہوگا۔ جو جہاد و قتال کفار کی غرض سے کیا جائے۔ اس آیت سے ضمناً یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جنگ حالت میں دو رکعتیں پڑھنی چاہییں۔ کیونکہ فرمایا، ایک جماعت جب سجدہ کر چکے تو ہٹ جائے اور دوسری جماعت آ کر پڑھے ایک سجدے سے مقصود ایک رکعت ہی ہوگا — نماز کا جب حکم ہوا تو صرف دو رکعتیں ہی فرض ہوئی تھیں ہجرت کے بعد چار رکعت قرار دی گئیں۔ پس چونکہ اصل نماز کی دو رکعت تھی اور اصل کسی حالت میں بھی ساقط نہیں ہوسکتی اس لئے جنگ اور خوف کے وقت میں بھی وہ قائم رہی چنانچہ عروہ بن زبیر کی روایت سے حضرت عائشہ رضہ کا قول مشہور ہے

معلوم ہوتا ہے کہ جن بزرگ نے آپ سے نمازِ قصر کی بابت کہا ہے ان کی نظر صرف اس آیت ہی کی طرف ہے اور بلاشبہ یہ درست ہے کہ قصر کا حکم جنگ اور خوف ہی کی وجہ سے ہوا کیونکہ لڑائی کے عالم میں زیادہ عرصہ تک نماز میں مصروف رہنا ہوشیاری اور حفاظت کے خلاف تھا لیکن جو نتیجہ انھوں نے اس سے نکالا ہے وہ کسی طرح صحیح نہیں!

(۲) بلاشبہ اس آیت میں جنگ اور خوف کی حالت کا ذکر اور حکم ہے۔ لیکن یہ بھی بالکل یقینی اور قطعی طور پر احادیث صحیحہ و آثار سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ سفر کی حالت میں نماز قصر پڑھی گو وہ سفر امن کا اور بغیر جنگ ہی کا ہو۔ اسی طرح خلفاء اربعہ کی نسبت بھی ثابت ہے کہ انھوں نے ہمیشہ اور ہر طرح کے سفر میں قصر کیا اور یہ

امر اس درجہ حدِ تواتر و شہرت تک پہنچا ہوا ہے اور صدرِ اول اور عہدِ صحابہ کا تعامل اس درجہ متیقن ہے کہ اس سے انکار کرنا کسی طرح ممکن نہیں اور جس شخص نے ایک نظر بھی کتبِ حدیث پر ڈالی ہے وہ اس کی کبھی جرأت نہیں کر سکتا کہ اس کے خلاف کہے۔

یہ صحاح ستہ کے ابواب صلوٰۃ میرے سامنے ہیں اور اس کے شواہد کثیرہ سے لبریز ہیں۔ پھر قولِ جمہور بھی اسی کا موئد ہے اور تمام ائمہ و فقہاء کا بھی یہی مذہب ہے میں کتنی حدیثیں نقل کروں گا۔ اور ایک صریح و مسلم بات کے لئے دلائل تلاش کرنے سے کیا فائدہ؟ حضرت انس ہی کی روایت اس بارے میں کافی ہے اگر وہ حدیث ہی کے طالب ہیں۔

ہم آنحضرت صلعم کے ساتھ مکہ سے مدینہ روانہ ہوئے وہ برابر دو دو رکعت نماز پڑھتے رہے یہاں تک کہ مکہ میں قیام کر کے پھر مدینہ واپس پہنچ گئے۔ یحیٰ ابن اسحٰق

راوی نے پوچھا کہ مکہ میں کچھ قیام بھی کیا تھا کہا ہاں ایک عشرہ!

صرف صحیحین ہی کو اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ خلفاء اربعہ اور تمام اجل صحابہ کا ہمیشہ عمل اسی پر رہا۔

# حکمت بقاء حکم قصر مع فوت علت

(۳) البتہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ جب قصر کا حکم ایک خاص علت کی وجہ یعنی جنگ و خوف کے سبب ہوا تھا تو پھر دفعہ علت کے بعد کیوں قائم رہا۔

آپ کے سوال میں اسی پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ آج اس کی نسبت شبہ پیدا ہو خود اسی عہد مقدس میں یہ شبہ پیدا ہوا اور اس کا جواب بھی دیا گیا۔

یعلی ابن امیہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا قرآن میں تو یہ ہے کہ اگر تمہیں کافروں کی طرف سے خوف ہو تو کچھ مضائقہ نہیں اگر تم نماز کو قصر کر لو۔ اس سے معلوم ہوا کہ حکم صرف بے امنی اور خوف کی وجہ سے ہے لیکن اب تو امن ہو گیا ہے۔ اب کیوں قصر کیا جاتا ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جس طرح تمہیں اس آیت کی بنا پر تعجب ہوا ہے مجھے بھی ہوا تھا چنانچہ میں نے آنحضرت صلعم سے دریافت کیا انھوں نے فرمایا کہ یہ خدا کا تم پر صدقہ ہے اس کے بخشے ہوتے صدقے کو قبول کرو۔

یہ حدیث میں نے صحیح مسلم سے نقل کی ہے۔ لیکن نسائیؒ نے بھی اسے بہ اختلاف روات ما بعد لیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ تمام احکام میں آسانی اور سہولت محفوظ رکھی گئی ہے۔ "الدین یسراً" شریعت حقہ کی بڑی پہچان ہے۔ خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی کمزوری پر جب رحم فرماتا ہے تو پھر اسے واپس نہیں لیتا۔

اس حدیث کا مطلب یہی ہے کہ گو حکم جنگ اور خوف کی بنا پر ہوا تھا لیکن جب خدا نے آسانی فرما دی تو یہ اس کی بخشش ہے اور خدا کی بخشش کو کون ہے جو رد کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔

انسان کے لئے سچا قانون وہی ہے جو اس کے ضعف اس کی مجبوریوں اور اس کی طبعی احتیاجات و داعیات کا پورا پورا لحاظ کرے۔

(۴) نماز قصر کے متعلق صحابہ کرام کے اس عام اجماع سے صرف حضرت عثمانؓ اور حضرت عائشہ رضؓ مختلف پائے جاتے ہیں اور بوجہ ناواقفیت و عدم نظر کے بزرگ موصوف نے اس سے احتجاج کیا ہے اور اس اختلاف کی حقیقت انہیں معلوم نہیں۔ اس اختلاف میں بھی پہلا

اختلاف محض جزئی ہے۔

حضرت عثمانؓ کو حالتِ سفر میں قصر سے اختلاف نہ تھا وہ بھی اسی طرح قصر کرتے تھے کہ جس طرح حضرات شیخینؓ کرتے رہے اور نیز یہ کہ وہ آخر تک اسی پر قائم رہے البتہ اپنی خلافت کے دوسرے سال انہیں ایک جزئی اختلاف اس مسئلہ میں پیدا ہوا اور وہ بھی قصر کے ایک خاص موقع اور سفر کی ایک مخصوص صورت کی نسبت! آنحضرت صلعم کا طرز عمل دیگر اجلۂ صحابہؓ کے سامنے یہ تھا کہ وہ منیٰ میں بھی مثل دیگر مواقع سفر کے قصر پڑھا کرتے تھے حضرت عثمانؓ بھی اپنی خلافت کے ابتدائی عہد میں ایسا ہی کرتے رہے۔ مگر دوسرے سال انہوں نے اختلاف کیا اور منیٰ میں پوری نماز پڑھی۔ جیسا کہ صحیحین میں عبداللہ ابن عمرؓ اور عبدالرحمٰن بن یزید وغیرہ سے مروی ہے۔ پس حضرت عثمان کا جو اختلاف ہے وہ عام مسئلہ قصر پر کچھ مؤثر نہیں صرف قصر الصلوٰۃ بمنیٰ کی نسبت انہوں نے رائے بدل دی تھی اور اس کی ایک تاویل کر لی تھی جس کی تفصیل کتب شہرۂ فقہ وحدیث میں موجود ہے۔ ہمارے لئے اس قدر کافی ہے کہ منا میں بھی آنحضرت صلعم اور شیخین کا قصر ثابت ہے نیز اجلۂ صحابہؓ مثل ابن مسعودؓ اور ابن عمر بھی اسی پر عامل تھے پس صرف ایک حضرت عثمانؓ کا اجتہاد اس بارے میں کیا مؤثر ہو سکتا ہے۔

(۵) البتہ حضرت عائشہؓ کا اختلاف اس معاملہ میں بہت مضطرب اور عجیب ہے ایک طرف تو خود ان کا قول اوپر گذر چکا ہے دوسری طرف یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ قصر کی قائل نہ تھیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جن کا اجتہاد اور بصیرت وعلم تمام صحابہؓ میں امتیاز خاص رکھتا تھا سخت تعجب ہے کہ اس صاف اور صریح مسئلہ میں بغیر کسی سبب قوی کے ایسا مضطرب عمل رکھیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ حضرت عائشہؓ کو بھی مثل حضرت عثمانؓ کے صرف منیٰ ہی کے قصر میں اختلاف ہوگا۔ عام طور پر نفس قصر سے اختلاف نہ فرماتی ہوں گی اس کی تائید مسلم کی ایک مشہور حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

زہری سے عروہ ابن زبیر نے حضرت عائشہؓ کا یہ مشہور قول جب نقل کیا کہ "سفر میں دو رکعت نماز قرار پائی" تو زہری نے سوال کیا۔

زہری کہتے ہیں کہ میں نے یہ سن کر عروہ سے کہا کہ پھر عائشہؓ کو کیا ہو گیا تھا کہ وہ سفر میں پوری پڑھتی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ عائشہؓ نے بھی اس کی تاویل کر لی تھی جیسی کہ عثمان نے کی تھی۔

عروہؓ کے قول میں حضرت عائشہؓ کی تاویل کو حضرت عثمان کی تاویل سے تشبیہ دی ہے یہ تشبیہ نفس تاویل میں بھی ہو سکتی ہے کہ جس طرح حضرت عثمانؓ نے "قصر الصلوٰۃ بمنیٰ" میں تاویل کی تھی ویسی ہی حضرت عائشہؓ نے نفس مسئلہ قصر میں بھی کی اور اسی طرح مسئلہ قصر میں بھی ہو سکتی ہے۔ کہ جس طرح حضرت عثمانؓ نے تاویل کر کے منیٰ میں قصر ترک کر دیا تھا اسی طرح حضرت عائشہؓ نے بھی منا کے قصر کی تاویل کر لی۔

(۴) اگر اس حدیث میں عروہ کے قول کا آخری مطلب سمجھا جائے تو نفسِ قصر کے متعلق حضرت عائشہؓ کا اختلاف باقی نہیں رہتا۔ اس صورت میں ایک اور حدیث سامنے آئے گی جو امام شافعیؒ نے روایت کی ہے لیکن اس حدیث کی صحت بالکل مشتبہ ہے۔ ابراہیم بن محمدؒ اور طلحہ بن عمر اس کے دونوں راوی باالاتفاق محدثین ضعیف الروایت ہیں اور ان دونوں کا ایک روایت میں جمع ہو جانا اس کی تضعیف کے لئے کافی سے بھی زیادہ ہے جیسا کہ اربابِ فن پر مخفی نہیں۔ بہر حال حضرت عائشہؓ کا اختلاف اگر صریح و عمومی صورت میں متحقق بھی ہو جائے

جب بھی تمام اجلہ صحابہؓ اور احادیث مشہورہ و معروف نبویہ کے مقابلہ میں صرف ان کا اختلاف کیونکر مقبول ہو سکتا ہے جب خود ان کا قول بھی موجود ہے اور خود ان کے بھانجہ (عروہ) نے جو اس بارے اعلم الناس ہیں صاف کہدیا ہے کہ وہ کسی تاویل کی بناء پر ایسا کرتی تھیں نہ کہ کسی "سنت" کی بناء پر!

اگر حضرت عائشہؓ کے پاس کوئی دلیل سنت ہوتی تو عروہ اس سے کیونکر بیخبر رہتے؟!

فتأمل وتدبر

## حکم نماز قصر

(۸) اس بارے میں اختلاف ہے کہ حالتِ سفر میں قصر کرنا کس حکم میں داخل کیا جائے اور اگر پوری چار رکعت کوئی پڑھ لے تو اس کا کیا حکم ہے آیا وہ حرام ہوگا یا یہ کہ اس کا ترک اولیٰ ہے۔

امام شافعیؒ کا مذہب ان کے ایک قول کے بموجب یہ ہے کہ قصر جائز ہے مگر اتمام افضل ہے۔ لیکن اس سے زیادہ معتبر و مسلم قول ان کا وہ ہے جس میں قصر کو افضل بتایا گیا ہے۔ امام مالکؒ سے بھی دو مختلف قول منقول ہیں ایک میں قصر و اتمام دونوں کو یکساں بتلایا ہے ایک میں قصر کے وجوب کے قائل ہیں۔ امام سحنون کی روایت وجوب ہی کی تائید کرتی ہے۔ امام احمدؒ بھی ایک قول میں قصر کو افضل اور دوسرے میں اتمام کو مکروہ بتلاتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ قصر کے وجوب کے قائل ہیں۔ یعلی بن امیہ کی حدیث میں آنحضرت صلعم نے مثل "امر" کے فرمایا کہ قبول کرلو اس لئے احناف کہتے ہیں کہ وجوب ثابت ہو گیا لیکن "فاقبلوا" کو اس طرح کا امر نفی قرار دینا جس کو وجوب کے لئے مستلزم قرار دیا گیا ہے ضروری

اور قطعی نہیں۔

سب سے زیادہ اصح اور اوسط مسلک یہی ہے کہ قصر سنت ہے اور اتمام مکروہ۔ائمہ مذاہب کے مختلف اقوال میں سے ایک ایک قول سب کا بالاتفاق اسی کی تائید کرتا ہے۔حضرت امام ابوحنیفہؒ باوجود وجوب کے فرماتے ہیں کہ قصر کی نیت واجب نہیں تو وجوب قطعی تو نہ ہوا۔

## ریل میں نماز

الحاصل آج کل کے سفر میں بھی قطعاً نماز قصر کا حکم باقی و قائم ہے اور حالت خوف و شدائد کا نہ ہونا اس پر کچھ مؤثر نہیں ہو سکتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اونٹ کی پیٹھ پر جب نماز ثابت ہے تو ریل کے اندر کیوں جائز نہ ہوگی۔

# حکمِ رضاع و محرماتِ رضاعت

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص کی لڑکی اور اس کی حقیقی بہن کا لڑکا ہے یہ تو ظاہر ہے کہ ان کا نکاح جائز ہے مگر بات یہ آپڑی ہے کہ اس شخص کی وہی بہن جس کا لڑکا ہے مر گئی اور وہ بچہ دودھ پر تھا۔ پرورش کے لئے ایک ایسی عورت کو سونپا گیا جس کی عمر ساٹھ برس سے متجاوز اور ۱۹ سال سے بیوہ تھی۔ یہ عورت لڑکی والے اور اس کی بہن لڑکے والے کی بھی والدہ ہے بچہ کو دودھ مختلف عورتیں پلاتی رہیں اب نکاح ہونے کی بات سن کر اس انیس سال کی بیوہ عورت نے ظاہر کیا ہے کہ یہ بچہ میرے پستان چوسا کرتا تھا۔ دودھ تو نہیں آتا تھا مگر پانی نکلتا تھا۔

اور یہ بھی ہے کہ وہی بیوہ عورت جو لڑکی اور لڑکے کے ماں باپ کی والدہ ہے یہ پیوند نہیں چاہتی۔ دوسری جگہ کے لئے اس کا اصرار اور ان کا انکار۔ (مولوی حکیم غلام غوث خانپور)

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ حکم رضاعت سے شارعؑ کا مقصود کیا ہے۔ کتاب و سنت کی تصریحات بینہ سے ہم اس اصل تک پہنچ چکے ہیں کہ شریعت کا کوئی حکم مصلحت و حکمت سے خالی نہیں اور ضرور ہے کہ ہر حکم اپنے اپنے بیانات میں اس کی مصلحت و حکمت کی طرف بھی اشارہ کر دے یہ دوسری بات ہے کہ بعض اوقات اپنے قصور فہم و نارسائی فکر سے ہم علل و حکم کو نہ سمجھ سکیں۔

قرآن حکیم نے ان عورتوں کو جن کا دودھ بچوں نے پیا ہو مثل ماؤں کے قرار دیا ہے وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ اور آنحضرتؐ نے فرمایا نسب کے متعلق جو رشتے حرام ہیں دودھ کے رشتے سے بھی اللہ نے حرام کر دیئے۔ اب غور کیجئے کہ اس حرمت کی علت کیا ہے۔ سو فکر صحیح بتلاتی ہے کہ اولاد اور ماں کے تعلق میں سب سے زیادہ نمایاں چیز پیدائش کے بعد رضاعت ہی ہے۔

بچہ جب دنیا میں آتا ہے تو اس کی غذا کے لئے دنیا کی تمام پیداوار و حاصلات یک قلم بیکار ہوتی ہیں۔ صرف ایک ہی غذا ہوتی ہے جو اس کے کام آ سکتی ہے اور جس کو حاصل کر کے وہ دنیا میں کامل انسانی جسم و شکل اختیار کرتا یہ غذا دودھ ہے اور فطرت الٰہی نے قبل اس کے کہ وہ دنیا میں آئے ماں کے جسم کے اندر ہی اس کا انتظام کر دیا ہے:۔

یہی شیر اس کی زندگی کا ... وسیلہ اور اس کے بقاء وجود کا ذریعہ وحید ہے اسی غذا سے اس کا جسم بنتا۔ گوشت بڑھتا۔ خون صالح پیدا ہوتا ہے اور ہڈیوں کے اجزا نشوو نما پاتے ہیں

موجودہ زمانے میں بڑے بڑے ڈاکٹروں نے تحقیق و اختبار کے بعد تسلیم کر لیا ہے کہ بچہ کی صحیح و صالح غذا ماں کا دودھ ہے۔ جو لوگ حیوانات کے دودھ سے بچہ کو پالتے ہیں۔ وہ

اس کی ابتدائی زندگی میں اس کو صحت و توانائی سے محروم کر دیتے ہیں۔

پس دودھ کا تغذیہ ماں اور اولاد کے تعلق کا سب سے زیادہ بنیادی مظہر ہے اس بنا پر اگر ایک عورت نے کسی دوسرے کے بچے کو بھی دودھ پلا دیا اور پرورش کیا۔ تو وہ ٹھیک ٹھیک مثل اس کی حقیقی ماں کے ہو گئی جس طرح ماں کا دودھ اس کے جسم کے اجزا کی تولید و نمو کا ذریعہ تھا۔ اسی طرح اس کے دودھ سے اس کے ہیکل جسم کا ایک ایک ذرہ بنا اور ہڈیوں کے اجزا تک میں پیوست ہو گیا۔

یہ امومت یعنی ماں ہونے کا ایک صحیح اور طبعی اشتراک ہے اور اس لئے ضروری ہے کہ جو حقوق حقیقی ماں کے ہوں وہی حقوق امومتِ رضاعت یعنی دودھ پلانے والی کے بھی قرار دیئے جائیں اور جو اثرات ان حقوق سے مرتب ہوتے ہیں وہ سب کے سب اس حالت میں بھی مرتب ہوں۔

ایک اور دقیق نکتہ بھی اس بارے میں پیش نظر رہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں ایک تو "خالقیت" ہے اور ایک "ربوبیت"۔ مجازی طور پر والدین بھی بچہ کے لئے خلقت اور ربوبیت دونوں کا واسطہ ہوتے ہیں۔ پس اگر امومتِ حقیقی کو مجازی خالقیت حاصل ہے تو امومتِ رضاعت کو مجازاً "ربوبیت"! ربوبیت کے معنی پرورش اور حسبِ احتیاج و وقت ضروریات پورا کرنا ہے

لہٰذا شارع نے دودھ پلانے والی امومت کو بھی امومتِ حقیقی کے لقب سے موسوم کیا اور ان کا شمار بھی "اُمہات" میں ہوا۔

چنانچہ تاریخ اسلام کے ایک عظیم الشان شخص ملہم و مجدد حضرت حجت الاسلام شاہ ولی اللہ رحمہ لکھتے ہیں ــــ

"محرماتِ شرعیہ میں سے رضاعت بھی ہے اور اس کی علت یہ ہے کہ جس عورت

نے دودھ پلایا تو وہ حقیقی ماں کے مشابہ ہو گئی۔ اس بنا پر کہ اس کا دودھ بچے کے اختلاط جسم کے اجتماع اور صورت جسم کے قیام اور نشو ونما پانے کا مثل ماں کے ذریعہ ہوا۔ حقیقی ماں کے شکم میں اس کے جسم کی خلقت کا اجتماع و انضمام ہوا تھا اور دودھ پلانے والی نے اس کی پہلی نمود میں غذا دے کر اس کی خلقت وجسم کو نشو ونما بخشی۔ پس یہ اس کی دوسری ماں ہوئی بعد حقیقی ماں کے اور اس لئے اس کی اولاد بھائی بہن ہوئے بعد ہم بطن بھائی بہنوں کے۔"

اس علت ومصلحت کے معلوم کرنے کے بعد حسب ذیل امور سامنے آتے ہیں۔

(۱) حکم رضاعت میں اصل وہی ہے جو اس لفظ سے ظاہر ہوتا ہے یعنی دودھ کا پینا۔ پس بے شبہ رضاعت کی ہر وہ حالت جس میں یہ اصل نہ ہو رضاعت میں داخل نہیں۔

(۲) بچہ کی ابتدائی رضاعت کا وہ حصہ جس میں اس کی غذا دودھ ہوتی ہے اسی حصہ عمر سے یہ متعلق ہو گا کیونکہ مقصود اصلی تغذیہ شیر وتربیت مولود ہے۔

(۳) چونکہ اصل حرمت تغذیہ شیر ہے اس لئے حکم رضاعت کے نفاذ کے لئے ایک کم سے کم مقدار بھی ہونی چاہیئے۔ لیکن یہ مقدار ایسی ہی ہونی چاہیے جیسے علت نہی وحرمت یعنی نشو ونما جسم و تولید خون وتشکیل ہیکل بینہ حاصل ہو۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے جیسا کہ فرمایا ہے۔

"چونکہ رضاعت کا سبب حرمت ہونا اس علت پر مبنی ہے کہ مولود کے جسم و وجود کے نشو ونما کا ذریعہ مرضعہ کا دودھ ہوتا ہے اس لئے ضرور ہوا کہ رضاعت میں دو چیزیں بطور اصل کے دیکھی جائیں اول اتنی مقدار میں

رضاعت کا ہونا جس سے یہ صورت پیدا ہو، دوسرے رضاع انسان کے اول عہد میں موجب کہ دودھ اس کی غذا ہوتی ہے اور اسی سے اس کا جسم و ہیکل نشو و نما پاتا ہے ۔

## احادیث رضاعت

اب آپ احادیث صحیحۂ باب پر نظر ڈالیے اور غور کیجیے کہ سطور مندرجہ صدر محض عقلی استنباط و تعلیل ہی نہیں ہیں بلکہ احادیث صحیحہ سے ٹھیک ٹھیک یہی امور بطور اصول کے معلوم ہوتے ہیں ۔

سب سے پہلے حضرت عائشہؓ کی حدیث مسلم وغیرہ سامنے آتی ہے کہ "ایک دو مرتبہ بچہ کا پستان چوسنا حرمت رضاعت کا موجب نہیں ہو سکتا" اسی طرح حدیث ام الفضل مندرجہ مسلم میں ہے اور اسی طرح احمدؒ و نسائیؒ اور ترمذی کی روایات کا حاصل یہ ہے کہ "بچہ کے ایک دو بار منہ لگا دینے اور دودھ پی لینے سے حرمت نہیں ہوتی" ۔

"رضعہ" سے مقصود رضاع کا ایک مرتبہ ہونا۔ بچہ نے جب پستان منہ میں لیا اور بغیر کسی کے چھڑائے چھوڑ کے دوبارہ پینا چاہا تو یہ ایک "رضعہ" ہے ۔

"مصہ" کے معنی ہیں کسی چیز کو تھوڑا سا لینا یا تھوڑا سا پینا!

"ملیچ" بچہ کا ہونٹوں میں پستان لینا اور دودھ پینا! پس ان الفاظِ احادیث سے واضح ہو گیا کہ ایک دو رضعہ و مصہ و ملیچ سے حرمت نہیں ہوتی ۔

چنانچہ صحابہؓ میں حضرت علیؓ حضرت عائشہؓ حضرت ابن مسعودؓ ابن زبیرؓ کا یہی مذہب تھا کہ خمس رضعات معلومات سے کم میں حرمت نہیں ہوتی ۔ حضرت امام شافعیؒ و امام احمدؒ وغیرہم بھی اسی طرف گئے

ہیں۔ لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام مالک نے قلت وکثرت اور تعداد ومقدار کو اس بارے میں اہمیت نہ دی اور بہ سبب اہمیت حکم تحریم رضاع ہر حال میں حرمت کو ضروری قرار دیا سو بقول صاحب حجۃ اللہ یہ ایک طرح کی مزید احتیاط ہے مگر احادیث وروایات وہی ہیں جو اوپر درج کر دی گئی۔

اس کے علاوہ ابوداؤد کی ایک اور روایت مرفوع ہے۔ لیکن اس کے اسناد میں ابوموسیٰ الہلالی اور ان کے والد دو مجہول شخص ہیں۔ امام بیہقی کی ایک روایت سے خود ابوموسیٰ کی مجہولیت تو دور ہو جاتی ہے مگر ان کے والد کی مجہولیت باقی رہتی ہے۔ تاہم بصورت "صالحیت احتجاج" یہ روایت بھی سابق روایات کی مؤید ہے یعنی۔ دودھ کا اس قدر پینا جس سے مولود کے جسم وہیکل میں نشو ونما ہو سکے۔

خود شارع نے اس کی آخری مقدار "خمس رضعات معلومات" قرار دیدی ہے۔ پس دودھ پینے کے زمانے اور "حولین" میں جب کبھی خمس رضعات معلومات ہو تو یہ وہ رضاعت ہو گی جس کو شارع نے "ما فتق الامعاء فی الثدی" "ای فی ضمن الثدی" قرار دیا ہے اور یہی وہ مقدار ہے جو شارع کے نزدیک "ما انشر العظم وانبت اللحم" ہے۔

## صورتِ مسئولہ

اب آپ کے سوال کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ آپ نے ایک تو مخصوص صورت حال پیش کی ہے ساتھ ہی نفس مسئلہ رضاعت کے متعلق بھی تشریح چاہی ہے۔ اصل مسئلہ کے لئے تو غالباً سطور مندرجۂ صدر کافی ہوں گی۔ رہی صورتِ مسئولہ تو ضمناً اس کا بھی جواب ہو گیا۔

روایاتِ مندرجۂ صدر سے ثابت ہو گیا کہ وجہ حرمت تغذیہ شیر ہے پس اگر کوئی عورت

بہلانے کے لئے بچّے کے منہ کو اپنی چھاتی سے لگادے اور وہ بغیر دودھ کے محض چوستا رہے تو اس سے ہرگز ہرگز حکم تحریم رضاعت ثابت نہیں ہو سکتا۔

صورتِ مسئولہ میں عورت کا یہ کہنا کہ پانی نکلتا تھا محض لغو و بے اثر ہے جب عورت عرصہ سے بیوہ ہو چکی تھی بلکہ "سن یاس" تک پہنچ چکی تھی تو دودھ کا وجود ہی باقی نہ رہا اور چونکہ وجہ حرمت دودھ کا پینا ہے اس لئے حرمت بھی باقی نہ رہی۔

جن ائمہ کرام رحمہم اللہ نے حرمت میں قلت و کثرت اور مقدار و عدد کو تسلیم نہیں کیا ہے اُن کے نزدیک بھی دودھ کا وجود بہر حال ضروری ہے۔

چنانچہ گیارہویں صدی کے مجدد و مصلح امام المتاخرین علامہ شوکانی نے اس مسئلہ کو حسب ذیل جامع... لفظوں میں لکھا ہے "رضاعت کا حکم پانچ مرتبہ دودھ پینے سے ثابت ہوگا ایسی حالت میں کہ دودھ کا وجود یقینی ہو اور پھر رضاعت سے بھی وہ تمام رشتے حرام ہو جائیں گے جو نسب سے ہوتے ہیں"۔

سبحان اللہ کیا جامع و مانع الفاظ ہیں اور کس طرح چند لفظوں کے اندر باب الرضاع کے تمام مباحث مبہمہ و طویلہ کو ختم کر دیا ہے۔

حضرت علامہ شوکانی کے یہی خصائص و فضائل و آیات باہرۂ حکمتِ یمانیہ ہیں جن کو دیکھ کر اربابِ حق و صفا و پرستارانِ کعبہ کتاب و سنت کی روح بے اختیار جوشِ تحسین و آفرین سے معمور ہو جاتی ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ اس بارے میں صرف ایک عورت کا قول معتبر نہیں، تو یہ امر البتہ بحث طلب! اور صحیح بخاری وغیرہ میں حدیث عقبہ بن الحرث اور واقعۂ امتِ سوداء موجود! اور مذہب حضرت عثمانؓ و ابن عباسؓ و زہری الحسن و اسحٰق الاوزاعی و احمد ابن حنبل و مالک

رحمہم اللہ معلوم!

لیکن آپ کی پیش کردہ صورت کو اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ مجرد مرضعہ کی شہادت معتبر ہو یا نہ ہو یہاں تو سرے سے حالتِ رضاعت ہی مفقود ہے۔

کوشش کیجیے کہ یہ جاہلانہ خیال دور ہو جائے اور جو رشتہ شرعاً جائز ہے اس کو شریعت پر افترا کر کے اور اس کی نسبت غیر صحیح سے ناجائز فائدہ اٹھا کر نہ روکا جا سکے کہ یہ ایک خدمت دینی ہوگی اور آپ کا اجر اللہ کے ہاں تیار رہے۔

# لڑکیوں کا ترکہ

شیخ بدرالدین صاحب نے گوجرانوالہ سے لکھا تھا کہ پنجاب میں بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے تمام احکام شرع تو قبول کر لیے ہیں مگر قدیمی ہندوانہ رسم و رواج کے اثر سے لڑکیوں کو ترکہ دینا منظور نہیں کرتے۔

پنجاب کی خصوصیت نہیں بمبئی میں بھی جس قدر کچھی میمن اور اسماعیلی خوجے ہیں ان میں اب تک ہندو شریعت کا یہ اثر باقی ہے، وہ لڑکیوں کو شادی کے وقت جہیز دیتے ہیں باقی ترکہ میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔

o

فی الحقیقت یہ ایک کھلا یقینیہ کفر اور صریح انکار شریعتِ اسلامیہ ہے۔ شریعت عبادت ہے، ان تمام احکام کلی و جزئی اور اصولی و فروعی سے جو قرآنِ مجید میں بیان کیے گئے اور جن کو محمد الرسول اللہ نے بہ دعویٰ وحی پیش کیا پس احکام قرآنی کے کسی ایک جزء کا انکار بھی اس کے کل کا انکار ہے اور ہرگز اس شخص کو اپنے تئیں مسلمان کہنے کا حق نہیں جو احکام قرآنی میں سے کسی جزئی یا فروعی حکم کا بھی منکر ہو۔

لڑکیوں کا ترکہ بہ نصِ صریح قرآنی ثابت ہے لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ۔
اور جو شخص یا قوم اس سے منکر ہے اس کا وہی حکم ہے جو حضرت ابوبکرؓ کی آغازِ خلافت میں منکرینِ زکوٰۃ کا تھا۔

اُن کی مثال ان منافقین کی سی ہے جو کہتے ہیں کہ

شریعت کے احکام میں سے چند باتوں کو مان لیں گے اور چند باتوں سے انکار کر دیں گے۔ اے پیغمبر یہ چاہتے ہیں کہ اس طرح اسلام اور کفر کے درمیان کوئی تیسری راہ اختیار کریں (۱۵ : ۴)

آپ کے ملک کے مسلمانوں کا اور علی الخصوص مسلمانوں کا فرض ہے کہ جس قدر بھی ان کی اصلاح اور اس حکم شریعت کے احیاء میں ہو سکے اس سے دریغ نہ کریں۔ ابتداءً وسائلِ حسنہ عمل میں لائیں باز نہ آئیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ اگر مصلحتاً سختی اور درشتی سے بھی کام لیں اور ان کے ساتھ کھانا پینا اور شادی غمی کی شرکت بالکل بند کر دیں۔ آج کل کے زمانے میں احیاء شریعت کیلئے سب سے بڑی ضرورت اسی شئی کی ہے اور اَلْحُبُّ فِي اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ اعظم بنیاد ایمان سے ہے یاد رکھنا چاہئے کہ موجودہ دور اسلام کے لئے انتہا درجہ کا غربت کا دور ہے۔ اس وقت ہزار نمازوں اور روزوں سے بڑھ کر عبادت یہ ہے کہ شریعت کی کوئی ایک مٹی ہوئی نشانی زندہ کر دی جائے۔ فی الحقیقت یہ کم از جہاد فی سبیل اللہ نہیں!

زہے نصیب اس بلند طالع کے جس کو احیاء شریعت کی توفیق بارگاہ الٰہی سے مرحمت فرمائی جائے۔

---

# طریقِ تذکرۂ خواتین

ح رالف بیگم صاحبہ حیدرآباد دکن نے لکھا تھا

"مسلمان عورتیں اپنے نام کو خط و کتابت اور اخبارات وغیرہ میں کیونکر لکھیں؟ انگریزی قاعدہ "مس" اور "مسز" کا ہے اور بعض لوگ "بیگم" کے لفظ سے یہ کام لیتے ہیں۔

عورتوں کا نام ظاہر کرنا ہم مسلمانوں میں معیوب سمجھا جاتا ہے اب معلوم نہیں کہ یہ خالی رسم ہے یا شرعی حکم!

جس کا جواب یہ ہے۔

آپ کا سوال عظیم الشان ہے، یہ چھوٹی باتیں نہیں ہیں کسی شائستہ اور ترقی یافتہ قوم کے لئے ضروری ہے کہ ان تمام جزئیاتِ معاشرت اور آداب و رسوم میں اپنی ایک خاص تہذیب رکھتی ہو۔

انگریزی طریقہ یہ ہے کہ لڑکی اپنے باپ کے نام کی نسبت سے مشہور ہوتی ہے اور عورت

شوہر کے۔ یعنی عیسائیوں کے یہاں عورتوں کے اصلی نام کا کوئی وجود نہیں صرف شوہر یا امیدوار ازدواج اصلی نام لے کر پکارتا ہے کہ یہ ایک رسم محبت ہے۔ یہ حالت گو بظاہر ایک خوشنما تہذیب معلوم ہوتی ہے مگر فی الحقیقت دنیا کے بدترین دور جہل و ظلمت کے بقیہ آثار میں سے ہے اور آج کل کے مقلدین یورپ اور فرنگی مآبوں کو اس کی خبر نہیں؟

یورپ میں ایک نہایت سخت دور اس جہالت کی تاریکی کا رہ چکا ہے جو مسیحی مذہب کے مطلع ظلمت سے نکل کر پھیلی تھی اور جس کو تاریخ میں "مڈل ایجز" سے یاد کیا جاتا ہے۔

توراۃ میں ہے کہ عورت کا وجود آدم کے گناہ کا پھل ہے اور مسیح نے اس کی تصدیق کی ہے پس یورپ نے اپنے مسیحی دور میں عورتوں کو ایسی اشد شدید غلامی کی حالت میں رکھا اور اس جنس اشرف و اقدس کی اس درجہ عملاً و اعتقاداً تحقیر کی گذشتہ دنیا کے تمام معاصی و جرائم اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ اور اس کے تذکرے سے انسانیت کے جسم پر لرزہ آ جاتا ہے۔

مسیحی مذہب نے عورت کے وجود کو مثل مرد کے ایک مستقل وجود تسلیم کرنے سے انکار کر دیا پادریوں کا عقیدہ یہ تھا۔ کہ عورت کے جسم میں سرے سے وہ روح ہی نہیں ہے جو مردوں کے اندر سے اثبات شرف و عظمت انسانیت کرتی ہے اس کو حق نہیں کہ اپنے نام سے خرید و فروخت کرے۔ قانون اس کے وجود شخصی کو تسلیم نہیں کرتا وہ کوئی جائداد اپنے نام سے الگ نہیں رکھ سکتی اور نہ کوئی مالی معاملہ شوہر کی موجودگی میں اپنے نام سے کر سکتی ہے

گذشتہ تین چار صدیوں کے اندر یورپ میں تمدنی و اجتماعی انقلاب ہوا اور مسیحی مذہب کی غلامی کی لعنت سے علم و مدنیت نے نجات دلائی تو عورت کی حالت اور حقوق پر بھی توجہ ہوئی رفتہ رفتہ اس کے احترام و شرف کا اعتقاد راسخ ہو گیا۔ تاہم اس کی غلامی کے بہت سے طوق ابھی باقی ہیں یہ دوسری بات ہے کہ حسین و جمیل گردنوں میں انہیں سنہری زیور

بنا کر خوشنما کر دیا گیا ہو کہ یہاں آ کر ہر چیز خوشنما بن جاتی ہے ؎

یک قبا نیست کہ شائستہ اندام تو نیست

ازانجملہ اس محترم جنس کی غلامی کا ایک نفرت انگیز بقیہ یہ ہے کہ باایں ہمہ ادعائے حریتِ نسواں، وتسویۂ حقوق جنسین، عورت کو سوسائٹی یہ حق دینے سے انکار کرتی ہے کہ اپنا نام ظاہر کرے اسے حق تسمیہ و اعلان ذاتی حاصل نہیں ہے۔ عورت مرد کی موجودگی میں خود لاشئی اور کالعدم ہے اس کی جانب سے بھی شوہر ہی اثبات وجود کرتا ہے جیسا کہ انگریز حکام کے ایڈرس وغیرہ کے موقع پر دیکھا جاتا ہے کہ وہ جواب میں اپنی بیوی کی طرف سے بھی اظہار خیالات کرتے ہیں۔

تعجب ہے کہ "سفریجیٹ" عورتیں اس مسئلہ پر کیوں متوجہ نہیں، لیکن حال میں مس ایڈرکن نے اپنے مطالبات میں حرارت کے ساتھ اس رسم تسمیہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

آج کل کے "متفرنجین مارقین" جو یورپ کی ہر رسم و وضع کی کورانہ تقلید کو اپنا اجتہادی دین و مذہب سمجھتے ہیں اور ہندوستان بلکہ تمام مشرق کو اس کی قدیمی وحشت و جہالت سے نجات دلانے کے تمسخر انگیز وہم میں بدبختانہ مبتلا ہیں۔ لفظ "آزادی" کے رسم الخط سے تو واقف ہو گئے ہیں۔ مگر ابھی اس کی حقیقت کا سمجھنا ان کے لئے باقی ہے۔ یہ نادان سمجھتے ہیں کہ اعتقادات و اعمال میں انگریزی سوسائٹی کے چند مصطلحات کا رٹ لینا اور چند رسوم و اوضاع کو نہایت جد و جہد سے ہر موقع پر اپنی بیرونی زندگی سے نمایاں کرتے رہنا ہی مدنی و معاشرتی ترقی کی معراج ہے حالانکہ ان فقراء علم و تمدن کے پاس ٹائی جس قدر خوش رنگ اور کالر جس درجہ چمکیلا ہے افسوس کہ اس قدر فکرِ راسخ نہیں۔ وہ جن کی تقلید کو اجتہاد سمجھتے ہیں خود ان کو بھی سمجھنے کی انہیں تمیز نہیں، انھوں نے یورپ کو دیکھا ہے مگر پڑھا نہیں اور پڑھنے کے

لئے دماغ چاہیے۔ جو اپنے گھر میں سوچتا ہو نہ کہ وہ آنکھیں جو لندن کی شاہراہوں کی رونق میں گم ہو گئی ہوں۔

یہی کورانہ و تقلیدانہ تقلید کا نتیجہ ہے کہ لوگوں نے نہایت ذوق و تفاخر سے مس اور مسز کی ترکیب بھی شروع کر دی ہے اور جو لوگ اس طبقہ میں زیادہ مشرق دوست ہیں وہ اپنے قومی اسباب و رسوم کے تحفظ کا یوں ثبوت دیتے ہیں کہ مسز کا ترجمہ بیگم کے لفظ سے کرتے ہیں اور اس کو بغیر اضافت یہ ترکیب ہندی استعمال کرتے ہیں۔ مگر اصل یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر کورانہ تقلید کی کوئی مثال نہیں ہو سکتی اور مجھے "مسز" کی ترکیب سے زیادہ بیگم کی ترکیب پر ہنسی آتی ہے

مگر آپ میری رائے پوچھتی ہیں تو میری رائے تو اسلامی تعلیم کے ماتحت ہے اور بس خواہ کوئی بات ہو۔ میں سب سے پہلے اسلام ہی کا منہ دیکھتا ہوں۔ بہت سے لوگ اس پر ہنستے ہیں مگر میرا ایک ماتم بھی ان کی حالت پہ غیر مختتم ہے۔

یورپ عورتوں کو ان کے حقوق اب تک نہ دے سکا اسلام دنیا میں آیا تاکہ ہر طرح کی انسانی غلامیوں کو مٹائے اور ایک بہت بڑی غلامی عورتوں کی غلامی بھی تھی بس اس نے عورتوں کو ان کی کھوئی ہوئی عزت واپس دلائی۔ ان کے وجود کو ایک مستقل وجود تسلیم کیا اور مرد اور عورت کے حقوق مساوی قرار دیئے۔ مسلم عورت اپنی ملکیت اور اپنی جائداد خاص اپنے نام سے رکھ سکتی ہے اور خود ہر طرح کا قانونی معاملہ کر سکتی ہے وہ یورپ کی عورت کی طرح نہ باپ کے نام میں مدغم ہے اور نہ شوہر کے۔ اس کی الگ اپنی شخصیت ہے۔

پس کوئی ضرورت نہیں کہ ہم یورپ کے اس بقیہ وحشت اثر جہالت اور اس یادگار تعبد نسوانی کی تقلید کریں یہ مسیحیت کی بخشی ہوئی لعنت ہے مگر اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ عورتوں کے ساتھ ایسا غلامانہ سلوک جائز رکھے ہر مسلمان عورت کو دکھا دی اصلی

نام ظاہر کرنا چاہیئے جو پیدائش کے وقت اس کا رکھا گیا اور جس نام سے اس نے جلسۂ نکاح میں اپنے شوہر کی رفاقت دائمی کا اقرار کیا۔

اگر ہر زندہ انسان کا یہ حق طبعی ہے کہ اس کو اس کا اصلی نام دیا جائے تو کون سی وجہ ہے کہ عورت اس سے محروم رہے۔ یورپ جو راستوں اور تفریح گاہوں میں عورت کو بکمال عزت واحترام اپنے بازو کا سہارا دے کر اس کی خود غرضانہ پرستش کرتا ہے، عقل و فکر کے عالم میں کیوں اس کی غلامی کا حامی ہے؟ عورت مثل مرد کے ایک مستقل وجود ہے اور مثل مرد کے انسانیت کا نصف ثانی!

وہ مرد کے ساتھ رفاقت مدنی کا اقرار کرتی ہے اور اس کے دل کے معاوضہ میں اپنا دل دیتی ہے پس اس کے گھر میں اگر اس کے وجود کی شریک ضرور ہو جاتی ہے پر اپنے وجود سے محروم نہیں ہوتی!!

وہ تعلیم جو "فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا" ہے۔ اس طبعی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں چاہتی البتہ جو آپ نے ظاہر فرمایا شاید خلاف شرع ہے تو یہ اس لحاظ سے تو ضرور صحیح ہے کہ بدقسمتی سے آج کل مسلمانوں کی شریعت رسم و رواج ہی کا نام ہے ورنہ شریعت فطریہ اسلامیہ نے تو کوئی حکم اس کی نسبت نہیں دیا ہے۔

ہمارے سامنے حضرت ختم المرسلین صلعم کی ازدواج مقدسہ اور اہلبیت نبوت کا اسوۂ حسنہ ہے جبکہ ہم حضرت خدیجہؓ۔ حضرت عائشہؓ۔ حضرت زینبؓ حضرت فاطمہؓ وغیرہا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نام لے سکتے ہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ وہ کون صاحب غیرت مسلمان ہے جو اپنی بیوی یا لڑکی کے نام کے اعلان سے شرماتا ہے۔

رہا اسلام میں عورتوں کے حقوق کی عظمت کا مسئلہ تو احادیث صحیحہ اور اعمال نبوت و

صحابہ کرام کے علاوہ خود نصوصِ قرآنیہ اس بارے میں بکثرت وارد ہیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ سورۃ البقرہ میں احکام صدق بیان کرتے ہوئے ایک ہی جامع و مانع جملے میں قرآن حکیم نے اس بحث کا خاتمہ کر دیا۔

اور جس طرح مردوں کا حق عورتوں پر ہے اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں ہاں مردوں کو قیام معالج معیشت کی فوقیت ضرور ہے

(۲ ! ۲۲۸)

یہ آیت فی الحقیقت ایک کلمۂ جلیل عظیم ہے جس نے بدفعتاً واحدتاً عورتوں کو وہ تمام حقوقِ معاشرت و مدنیت دلا دیئے جن سے دنیا کے جہل و ظلمت نے انہیں محروم کر دیا تھا نیز صاف صاف بتلا دیا کہ دونوں کے حقوق بالکل مساوی ہیں باستثناء اس طبعی فوقیت کے جو اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ کے لحاظ سے مردوں کو حاصل ہے۔

اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے ایک عجیب لطیفہ ذہن میں آیا کہ آج کل کے تعلیم یافتہ نوجوان عورتوں کی آزادی کے بہت حامی ہیں اور کہتے ہیں کہ ہندوستانیوں نے عورتوں کو غلام بنا رکھا ہے۔

لیکن یہ آزادی کا مطالبہ بھی محض یورپ کے بعض سطحی مناظر کی نقالی کا شوق اور اس کی ہر بات کی غلامانہ تقلید کا ولولہ ہے مثال میں اسی مسئلہ کو لیجئے کہ اسلام کے پاس ان لوگوں کے آزادانہ مذاق کی یہ چیز موجود ہے اور پھر بھی یورپ کی تقلید پر افتخارانہ فریفتہ ہوتے ہیں اور عورتوں کو خود ان کے اصلی نام تک سے نہیں ظاہر ہونے دیتے اور مس اور مسز کی ترکیب پر نازاں ہیں۔ حالانکہ اس سے بڑھ کر عورتوں کے عدمِ استقلال و حریت یعنی غلامی کی کوئی مثال نہیں ہو سکتی۔

چونکہ یہ لوگ محض مقلد ہیں اس لئے روشنی کو بھی ظلمتِ تقلید میں نہیں دیکھ سکتے ۔

قرآن کریم اسی تقلید کو کفر کا مبداء بتلاتا ہے ۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝

میرے پاس ایک لمبی چوڑی فہرست ان تعلیم یافتہ لوگوں کی موجود ہے جو باوجود ادعائے روشن خیالی و منور الفکری و باہمہ لوازمہ تہذیب جدید و مدنیتِ فرنگ اپنی زندگی کے اندر عورتوں کی غلامی و مملوکیت کے ایسے آثار مظلمہ و محزنہ رکھتے ہیں کہ انسانیت کے لئے ماتمِ کبریٰ اور اسلام کے لئے ننگ و عار ہے ۔۔۔ اور کیا آپ اس بدبخت بیرسٹر سے واقف نہیں ہیں جس نے باایں ہمہ مقالہ نگاری و صحافی و طنطنہ سفر فرنگ و نخوتِ لیڈری و رہنمائی اپنی مظلوم بیوی اور بچوں کو طعمۂ ہلاکت بننے کے لئے چھوڑ دیا اور خود ایک متمول بیوی کی دولت حاصل کرکے پیوستہ معمولِ خمور و علی الدوام مشغوف بہ تعلیل و عشق کاری ہے ۔

پھر وہ حرالفکر، منورالخیال، تعلیم یافتہ، مدنیت پرست، آزاد عمل، ماتم گدازِ مظلومیت نسانیت اور ناصر حقوقِ نسوانیہ فرقہ کہاں ہے جو ہندوستان کی عورتوں کو ظلم و جبر سے نجات دلانے کے لئے مبعوث ہوا ہے اور کہاں ہے وہ نئی مہذب اور آزاد سوسائٹی جو قدامت پرست طبقہ کے مظالم سے نفور، مغربی خواتین کی جلوہ آرائیوں پر متحسر، اور اسیر و تقیید اور حجاب نسواں پر ہمیشہ مرثیہ خواں ہے ۔

یہ کیا ہے کہ عورتوں کے حقوق پر ایک ہنگامۂ لسان و قلم برپا ہے اصلاح اصلاح ترقی ترقی، اور عمل عمل سب کی زبانوں پر ہے تاہم جو گرفتارِ جہل و غفلت ہیں ان کی سرشاری جہالت بدستور ہے جو مبتلائے فسق و فجور ہیں ان کی جسارت بجرأت علیٰ حالہا اور جو مبتلائے بدعملی و ترکِ اخلاق حسنہ ہیں ان کی حالت بد سے بدتر ہے ۔

کیا یہ اسی کا نتیجہ نہیں ہے کہ ہم میں دباؤ اور طاقت ناپید ہے اور کوئی قوت ایسی نہیں رہی جو ہمیں قول و عمل کی تطبیق پر مجبور کرے ــــ یہ دباؤ اور طاقت آج یورپ میں اجتماعی اور معاشرتی صورت میں ہے یعنی "سوسائٹی" اور اس کے آداب و رسوم (ایٹی کیٹ) ایک ایسی طاقت رکھتے ہیں کہ ہر شخص خواہ کیسا ہی جری و نڈر ہو لیکن اگر سوسائٹی میں کوئی ادنیٰ بھی جگہ رکھتا ہے تو اس کے تحفظ کے لئے مجبور ہے کہ اپنے ظواہر اعمال میں کوئی بات ایسی نہ ہونے دے جس کی بنا پر اپنی جگہ ضائع کر دے۔ مسلمانوں میں بھی یہی چیز زیادہ قوت و اثر کے ساتھ کار فرما تھی البتہ اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہر انسانی اثر و عمل کو رشتۂ الٰہی سے وابستہ کر دیتا ہے یہی قوت ہے جس کو لسان شرع نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لفظ سے تعبیر کیا ہے یعنی ہر مسلمان اس کے لئے مجبور تھا کہ اعمال صحیحہ و حسنہ اختیار کرے اور اگر نہ کرے تو مسلمانوں کی سوسائٹی میں کسی عزت و وقار کے حاصل کرنے کا مستحق نہیں ہوتا تھا۔ یہ ایک احتساب عمومی کی قوت تھی جو ہر فرد کو دوسرے فرد کے لئے ایک قوتِ محتسبہ بنا دیتی تھی

یہی ہے کہ توفیق الٰہی نے اصل منزلِ حقیقت دکھلا دی اور اس ایک ہی سرچشمہ مقصود تک پہنچا دیا جس سے اصلاح و فلاح ملت کی ہر شاخ کی تشنگی دور ہو سکتی ہے۔

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ تعلیم کے لئے کوشش کرو۔ میں اس کا وعظ نہیں کہتا کہ محاسن اخلاق حاصل کرو۔ میری دعوت یہ نہیں ہے کہ پالٹکس میں ترقی کرو۔ اور یقیناً میں نے کبھی یہ بحث نہ کی کہ عورتوں کو ان کے طبعی اور عقل و شرع کے بخشے ہوئے حقوق واپس کر دو کیونکہ یہ میری وہ چھوٹی موٹی منزلیں ہیں جن کو الحمد للہ میلوں اور کوسوں پیچھے چھوڑ آیا ہوں میری دعوت اب صرف ایک ہی ہے۔ یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور یقین کیجئے کہ کوئی بھی ایسی شئی نہیں ہے جو آپ لوگوں کے پیش نظر ہو اور اس میں نہ ہو البتہ اس میں جو کچھ

ہے وہ دوسری صداؤں کو میسر نہیں۔

یک چراغست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں　　　ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

برادرانِ ہنود معاف فرمائیں اگر میں کہوں کہ اسلام ہندوستان میں آکر اور تمام مقامات سے بہت زیادہ مسخ ہوا۔

عربی سادگی اور عجمی تکلف و تصنع ان دونوں عنصروں سے پہلے ہی مرکب ہو چکا تھا۔ اس پر ہندوستان کی بت پرستی اور اقوام وقبیلہ کے رسم ورواج کے اضافہ نے ایک ایسی صورت بنادی کہ آج اصلاح اعمال وجزئیات اعمال کا کام ہندوستان میں اور تمام ممالک اسلامیہ سے زیادہ تر مشکل ہو گیا ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے اندر بھی ہندوستان کے رسم ورواج کا کوئی نہ کوئی عظیم الشان بت چھپا ہوا ہے۔

عورتوں کے ناموں کے مخفی رکھنے کا خیال بھی ایک ایسی ہی رسم ہے بہتر ہے کہ اس سے جلد کنارہ کشی کی جائے۔

ابھی ہندوستانی رسم ورواج کے بت سے نجات نہیں ملی تھی کہ تقلید فرنگ کا ایک نیا بتکدہ آباد کیا گیا، ارباب توحید کو چاہئے کہ دونوں کی پرستش سے رہائی حاصل کریں۔

ہم کعبہ وہم بتکدہ سنگِ رہ ما بود
رفتیم وصنم بر سرِ محراب شکستیم

---

# جلسہ اسلامی میں طوائفوں کی شرکت

فضل الدین صاحب حالی بدایونی نے کانپور کے جلسۂ تہنیت بسلسلۂ واقعۂ مسجد میں طوائفوں کی شرکت گانے بجانے اور بعض علماء اسلام کے معترض نہ ہونے پر "نکتۂ" لکھا تھا اور دریافت کیا تھا کہ ایسی باتیں از روئے اسلام جائز ہیں۔

○

(۱) جس جلسہ میں رنڈیاں بلائی جائیں وہ میرے اعتقاد میں اسلامی روایات کا زندہ کرنا ایک طرف سرے سے اسلامی جلسہ ہی نہیں۔ آپ کہاں ہیں اور مجھ سے کیا سوال کر رہے ہیں؟

رہا کانپور کا معاملہ تو آپ نے کئی چیزوں کو ملا دیا ہے۔ مجھے جو حالات معلوم ہوئے ہیں وہ یہ ہیں کہ ۳۰ اکتوبر کو ایک تو گارڈن پارٹی تھی جو سہ پہر کو ہوئی اس میں سب لوگ شریک تھے اس کے بعد شب کو ڈنر ہوا اس میں راجہ صاحب اور مولینا عبدالباری نہ تھے۔

رات کو میلاد شریف ہوا۔

جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے ان تینوں صحبتوں کی فضا اس فرقہ کی رونق فرمائی سے محروم تھی اس کے علاوہ ایک اور صحبت بھی ہوئی جو پبلک حیثیت نہیں بلکہ شخصی طور پر کسی نے منعقد کی تھی اور مسٹر مظہر الحق کو مدعو کیا تھا نہیں معلوم یہ اسی دن ہوئی یا دوسرے دن اس کی نسبت پہلے اخبارات سے اور بعد کو بعض اشخاص سے معلوم ہوا کہ اس میں شہر کی کچھ مشہور طوائفیں بھی آئیں اور لوگوں نے مسٹر مظہر الحق سے کہا کہ وہ بھی چندہ پیش کرنا چاہتی ہیں۔ مسٹر مظہر الحق نے منظور کیا وہیں انھوں نے گایا بھی ہوگا۔

آپ کو مناسب نہ تھا کہ اس جرأت سے مولینا عبد الباری صاحب کو اس میں شریک قرار دیتے اور بنائے فاسد پر اعتراض فاسد کرتے۔ مومن کی شان یہ ہونا چاہئے کہ جس قدر اعلان حق اور امر بالمعروف میں نڈر اور شدید واشد ہے اتنا ہی سوء ظن کرنے میں محتاط اور غیر عاجل بھی ہو آپ نے ایک مسلمان کو اس کی غیبت میں متہم کیا اور اس کام کو اس کی طرف نسبت دی جس سے وہ بری ہے۔

ہاں اگر واقعی یہ سچ ہوتا کہ وہ آپ کے الفاظ میں "گا بجا کر محظوظ کرنے والیوں سے" محظوظ ہوتے تو پھر مجبور ہوتے کہ ہر اس شدید سے شدید سختی کو جو ان سے پرسش و احتساب میں کی جاتی گوارا کرتے اور جواب دیتے کہ کیوں ایسی صحبت میں شریک ہوئے۔ بہر حال جن جلسوں کا آپ ذکر کر رہے ہیں جہاں تک مجھے معلوم ہے ان میں تو قوم کے دیگر طبقات کے قائم مقام موجود تھے فقط اس طائفہ مجلس آرا کے قائم مقام نہ تھے۔

وہ آتے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں

لیکن میں تو بظاہر بھی اس جلسہ کو "اسلامی روایات" کا نذر کرنے والا جلسہ قرار نہیں دے سکتا میری جو رائے ہے وہ میری عدم شرکت نیز ۱۹ ذی الحجہ کی اشاعت کے نوٹ

سے آپ پر واضح ہو گئی ہوگی جو حکیم عبد القوی صاحب کی مراسلت کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

اسلامی روایات وغیرہ کی ترکیبیں آج کل لوگ بکثرت بولتے ہیں اور یہ معمولی جملے ہو گئے ہیں جن سے ہر موقع پر انشار پرداز ی اور عبارت آرائی کا کام لیا جاتا ہے گو اصلیت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

آج کل ہر جلسہ عظیم الشان ہے ہر صحبت دلربا اور مسلمانوں کا ہر اجتماع اسلامی روایات کو زندہ کرنے والا۔ اس عہد میں زاغ و بلبل کو ایک ہی قفس کی تیلیاں نصیب ہوتی ہیں۔

صدائے بلبل اگر نیست صوتِ زاغ شنو

ایک صحبت عیش و نشاط تھی جو بعض مصالح خاص سے کی گئی جو لوگ شاید کئی ماہ سے آہ و فغاں سنتے سنتے اکتا گئے تھے ہر طرف سے ہجوم کر کے جمع ہوئے کہ اب چند گھڑیاں عیش و سرور میں بھی بسر ہو جائیں۔

بادہ پیش آ کہ اسباب جہاں ایں ہمہ نیست

چلے پھرے کھایا پیا، مولوی آزاد سبحانی سے بھی ملے اور مسٹر ٹائگر سے بھی اس کے بعد سب نے اپنے اپنے گھر کی راہ لی اب معلوم نہیں ان اشغال میں غریب اسلام کی "روایات" کہاں سے آگئیں، اور اس مجمع کے کون سے فضائل و مناقب دقیقہ و مخفیہ ہیں جنھوں نے اسلام کی کسی فراموش شدہ سنت کا احیا کیا ہے —

اسلام کا نام ابھی ایک آڑ لہو و لعب بن گیا ہے جو کچھ جی میں آئے کیجیے مگر رونق سخن و تالیف قلوب کے لئے یہ ضرور کہہ دیا کیجیے کہ اسلامی روایات کی تازگی و تجدید مقصود ہے۔ کیونکہ جو کچھ آپ کرتے ہیں، صرف بیچارے اسلام ہی کے لئے کرتے ہیں ورنہ آپ کو ان ہنگاموں سے کیا تعلق!

ذریخا آبروئے دیگر غالب مسلماں شد!

(۱۲) اس سوال کو میں نہ سمجھا اور جواب سوال کی صورت پر موقوف ہے۔ کانپور میں کوئی مسجد تو بن نہیں رہی ہے جس کی تعمیر کے لئے طوائفوں نے "چندہ" دیا ہو آپ اپنا مقصد صاف صاف ظاہر کریں تو جواب عرض کروں

(۱۳) ہرگز نہیں۔ اسلام ہر ایسے فعل کو جو لغو ولا حاصل ہو اور انسانی محنت اور مال کو بغیر کسی نتیجہ کے ضائع کرے معصیت قرار دیتا ہے پس آتشبازی کا بنانا اور چھوڑنا دونوں ناجائز ہے۔

جلسے منعقد کیجئے مگر "اسلامی جلسہ" کا لقب صرف اسی کو دیجئے جو اپنے اندر کسی اسلامی احکام وتعلیم کا نمونہ رکھتا ہے۔

(۱۴) "قصداً چھپایا ہے" اس کا آپ کو علم ہے مجھے نہیں۔ نہ میں نے زمیندار کے مضامین پڑھے ہیں کہ قیاس سے کام لے سکوں۔ اگر اڈیٹر صاحب زمیندار نے طوائفوں کی نغمہ سرائی کے ذکر کو قصداً نظر انداز کر دیا ہے تو یقیناً یہ دیانت کے خلاف ہے۔

آخر میں اتنا اور کہوں گا کہ آپ نے ان سوالات میں غلط واقعات کو جس وثوق سے لکھا ہے خواہ کیسے ہی فریقانہ غضب وغصہ اور ہیجان کے عالم میں لکھا ہے مسلمانوں کی شان سے بعید ہے۔

# اُردو پریس کی تنظیم

صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ کے اردو پریس کی تنظیم کے متعلق جناب ن۔ح صاحب نے ایک اہم تجویز پیش کی تھی۔

جناب کا جوش کار قابل تعریف ہے مگر میں آپ کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ صوبۂ متحدہ سے کوئی اچھا اخبار نہیں نکلتا۔ لکھنؤ سے "ہندوستانی" ایک سنجیدہ اور پر مواد اخبار نکلتا ہے۔ گورکھپور سے "مشرق" حکیم برہم صاحب نکالتے ہیں جو قیمت کے لحاظ سے ارزاں چھپائی لکھائی کے لحاظ سے نہایت عمدہ اور ہر طرح کے مواد اور معلومات واخبار کا بہت اچھا مجموعہ ہوتا ہے ضخامت اور کثرت اخبار کے لحاظ سے اس صوبہ میں کوئی اخبار اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ "البشیر" اس صوبہ کا قدیم اخبار ہے اور اُس وقت سے کام کر رہا ہے جب کہ اردو پریس ابتدائی حالت میں تھا۔ اردو اخباروں میں شاید وہی اخبار ہے جس نے اپنی کوششوں سے ایک عمدہ ہائی اسکول بورڈنگ سسٹم پر قائم کر دیا ہے الٰہ آباد سے ایک نیا اخبار "مساوات" نامی بھی نکلتا ہے۔

بہر حال اخبارات تو نکل رہے ہیں البتہ روزانہ اخبار کوئی نہیں۔ دفتر مشرق گورکھپور جس نے پریس کے کاموں میں بہت ترقی کی ہے۔ مشرق کو روزانہ کرنے کے لئے کوشش کرے تو بہتر ہوگا۔

۵

آپ کا یہ خیال کہ صوبہ جات متحدہ سے جو اخبار نکل رہے ہیں ان کا عدم وجود برابر ہے ، میرے خیال میں نہایت افسوسناک خیال ہے اختلاف رائے دوسری چیز ہے۔ ہم کو اپنی بصیرت کے مطابق اپنی رائے کو ترجیح دینے یا حق سمجھنے کا پورا حق حاصل ہے مگر دوسروں کی نسبت یہ سمجھ لینے کا کہ ان کا وجود محض بیکار و لاحاصل ہے کسی کو حق نہیں پہنچتا۔

بیشک میں "البشیر" اور "مشرق" وغیرہ کی تعریف کرتا ہوں اسی طرح "مساوات" "قیصر ہند" "مسلم گزٹ" (بار دوم) یہ تمام اخبارات بھی اس صوبہ سے نکل رہے ہیں اور میں نہیں سمجھتا کہ آپ کے پاس اس کے کیا وجوہ ہیں کہ انھیں کلیتہً نظر انداز کر دیں۔ میں تو ان سب میں کچھ نہ کچھ خوبیاں پاتا ہوں۔

رہی پالیسی اور اصول نگارش و آراء تو یہ اپنی اپنی بصیرت ہے جس طرح اندھی قوت سے ایک شئی آپ کو مفید نظر آ رہی ہے بہت ممکن ہے کہ اسی طرح دوسرے کو مضر نظر آتی ہو البتہ اگر آپ کے پاس ایسے وجوہ ہیں جن کی بنا پر آپ نیتوں کو اغراض سے آلودہ پاتے ہیں تو ایسی رائے رکھ سکتے ہیں۔ اردو پریس کی تنظیم بہر حال ضروری ہے اور اس میں پنجاب کو شامل کیجئے

لاہور میں بوجوہ حلقۂ اشاعت رکھنے والے اخبارات بہت سے ہیں "اخبار وطن" لاہور سے اسلامی ممالک کے عام حالات ۔ عربی اخبارات کے اقتباسات اور انگریزی جرائد کے عثمانی و مشرقی مراسلہ نگاروں کے تراجم کثرت سے شائع کرتا ہے۔ روزانہ پیسہ اخبار ایک عام روزانہ اخبار کی حیثیت سے ہر طرح کا مواد بہم پہنچاتا ہے۔ اور تمام روزانہ معاملات پر چھوٹے چھوٹے

نوٹ دیتا ہے ۔

'زمیندار' اپنی خصوصیات معلومہ و شہیرہ کے لحاظ سے پوری شہرت رکھتا ہے اور لوگ اس کے بہت گرویدہ ہیں یہ تینوں اخبار تین مختلف مذاق کی جماعتوں کے لئے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ باہم رقیب ہوں ۔ جس شخص کو جس طرح کے اخبار کی ضرورت ہو خرید ے یہ سب ایک ایسوسی ایشن کے ماتحت ہو سکتے ہیں ۔

وطن اور پیسہ اخبار ملک کو تعلیم دیں اور زمیندار ملک کی شکایتیں گورنمنٹ کے آگے پیش کرے میں سمجھ نہیں سکتا کہ آپ ایسا تعلیم یافتہ اور صاحب اثر بزرگ کیوں علانیہ سعی نہیں کرتا آپ اپنے صوبہ میں کام شروع کر دیں سب سے پہلے موجودہ اخبارات کے مالکوں سے ملیں اور مشورہ کریں ۔ اگر آپ کا مقصد حاصل نہ ہو تو پھر دوسری راہ اختیار کریں ۔

# مسئلۂ الندوہ

مولینا شبلی نعمانی بھی "الہلال" میں "وصاف" "دکشاف" کے نام سے اکثر ظریفانہ مضامین اور نظمیں لکھا کرتے تھے اور ندوہ کے بانی تھے۔

ندوہ میں اسٹرائک ہوئی تو بعض لوگوں کو ان کی روش پر کچھ اعتراضات تھے۔

مولینا ابوالکلام نے اس سلسلے میں کچھ نہیں لکھا جس سے بعض حضرات کو شبہ گذرا کہ اس خاموشی کا سبب ذاتی "تعلقات" ہیں۔

امروہہ سے سید علی متقی صاحب نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا جس پر مولانا نے صفائی پیش کی۔

جناب کے حسن ظن بیرگانہ کا کمال شکریہ اور استدعا دعا رحصول استقامت و توفیق خدمت و اعمال صالحہ! جناب نے اس خط میں ذاتی تعلقات کا ذکر کیا ہے۔ ایک مدت تک ہم اپنے اعمال میں ان چیزوں کے عادی رہے ہیں۔ اس لئے یہ لفظ بکثرت زبانوں

پہ چڑھ گیا ہے اور ہمیشہ سامنے آجاتا ہے اور میں تو اسے سنتے سنتے اب کچھ اکتا سا گیا ہوں۔ یہ ذاتی تعلقات کا لفظ کیا بلا ہے جو ہمیشہ لوگوں کی زبانوں پہ آتا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ ذاتی تعلقات' میں کہتا ہوں کہ جو نفس خبیث و شریہ حق و صداقت کے معاملہ میں ایک منٹ ایک لمحہ ایک عشر لمحہ کے لئے بھی ذاتی تعلقات سے متاثر ہوتا ہے یہی نہیں کہ وہ ایک کمزور معصیت آلود اور مستوجب صد نفرین ہستی ہے بلکہ یہ کہ میرے عقیدے میں وہ مومن و مسلم ہی نہیں۔ اگر ہم مسلمان ہیں تو ہم کو ہمارے خدا نے بتلا دیا ہے۔

اے مسلمانو! استقامت اور مضبوطی کے ساتھ عدل و انصاف پہ قائم رہو اور اللہ کو حاضر و ناظر سمجھ کر گواہی دو۔ گو وہ خود تمہارے یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اگر کوئی مالدار ہے یا فقیر ہے تو اللہ ان کے لئے سب سے بڑھ کر ہے۔ پس تم ان کی خاطر ہوائے نفس کی پیروی نہ کرو کہ مگو حق سے انحراف کرنے اور اگر صاف صاف گواہی نہ دو گے یا گواہی دینے سے پہلو تہی کرو گے تو یاد رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے باخبر ہے (۴ : ۱۳۴)

پھر جس عالم میں خود اپنے نفس کی محبت اور والدین و اقربین کی قدرتی الفت کی نہیں چلتی وہاں یہ ذاتی تعلقات کیا چیز ہیں۔

اصل یہ ہے کہ مدتوں کی نفس پرستی نے ہم لوگوں کے اعمال ہی کو نہیں بلکہ ہمارے جذبات کو بھی پست کر دیا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ کوئی بلندی سمجھ میں آہی نہیں سکتی لیکن میں جناب کو اور جناب کے احباب کو یقین دلاتا ہوں کہ اس دنیا میں میرے لئے صدہا آزمائشیں ہیں مگر

یہ مزعومہ تعلقات کی منزلیں تو میرے لئے کچھ کڑی نہیں ہو سکتیں۔ جو منزلیں کہ آنے والی ہیں۔
اور الحمدللہ کہ جن کا وقت اب دور نہیں سمجھتا ان کے لئے البتہ دعا کیجئے کہ خدا تعالیٰ استقامت
روزی عطا فرمائے۔ باقی رہے باہمی تعلقات و معاملات اور صحبت و ارتباط تو تعجب ہے کہ
لوگوں کو اس کا تصور نہیں شرماتا۔ کیا وہ اس پیمانہ کو ہاتھ میں لے کر ضمناً یہ نہیں بتلا دیتے
کہ خود ان کا ظرف پیمائش بھی اتنا ہی ہے؛

بھائی مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ میں جس دنیا میں ہوں اس کی ابھی آپ لوگوں کو خبر
نہیں، شاید کچھ عرصہ کے بعد حقیقت حال زیادہ روشنی میں آجائے۔

فانتظروا، الی معکم من المنتظرین

(۲) اگر وہ تحریریں اور ان کے الزامات صحیح ہیں تو جیسا کہ لکھ چکا ہوں اس میں کوئی شک
نہیں کہ مولینا نے ایسی سخت کمزوری دکھلائی جس کا مجھے ان کی نسبت کبھی خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا
یقیناً قوم کو حق ہے کہ بصورت صحت اُن سے مواخذہ کرے۔

# قومی صلاح کار

مسلم یونیورسٹی کی بحث کے سلسلے میں ایک صاحب نے ایک گمنام چھٹی لکھ کر مولینا کا "منبع علم" دریافت کیا تھا نیز یہ کہ

(۲) ۸ ر ستمبر کے الہلال میں آپ نے ایک جگہ فرمایا ہے کہ

سال گذشتہ جب مسلم یونیورسٹی کا غلغلہ نہایت بلند آہنگی کے ساتھ برپا تھا، اُس وقت آپ نے پبلک کو اس مہلک غلط فہمی پہ متنبہ کرنا صرف اس لئے مناسب نہیں خیال کیا کہ آپ کی آواز بے اثر رہتی ——— لیکن کیا اس عبارت سے یہ مفہوم نہیں نکلتا کہ جناب والا صرف ہوا کے رُخ پر چلتے ہیں جب تک دیکھا کہ کوئی اپنا ہم آواز نہیں ملتا اس وقت تک احقاق حق امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور اس قسم کے تمام "مشتبہ الحقیقت لیکن مرعوب کن دعاوی پہ وہ مستفا میں مستور رہے لیکن جب یہ نظر آیا کہ پبلک کی تائید کا کچھ سہارا مل جائے گا اس وقت دریا بے اختیار اُبل پڑا امید ہے کہ جناب والا ان سوالات کا جواب جلد مرحمت فرمائیں گے

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی الحب ہے کہ بجائے استعارات اور صلح گوئی
کے واقعات و دلائل پر زیادہ توجہ مبذول رہے ۔ راقم

تیری رسوائی کے خونِ شہدا درپے ہے
دامنِ یار خدا ڈھانپ لے پردہ تیرا

(۱) افسوس کہ آپ عبارت کے محل اور موقع سمجھنے سے بے پروائی کرتے ہیں ، یہاں تو بطور الزامی حجت کے کہا گیا ہے کہ اگر کوئی آواز بلند بھی کی جاتی تو لوگوں کو اس درجہ متوالا کر دیا گیا تھا کہ اس طرح کی صداؤں سے کوئی ہشیاری پیدا نہ ہوتی اور بالفرض میرا وہ قول تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی نہیں معلوم کہ اس سے آپ کے استدلال کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے ۔

کیا اصلاح و ہدایت کو طبائع کی صلاحیت اور مستعدی کے وقت شروع کرنا اور اپنے قرار دادہ مصالح کی وجہ سے حق گوئی کی جگہ باطل پرستی اختیار کرنا دونوں ایک ہیں ؟

یقین کیجئے کہ میں اظہار خیال میں کسی سہارے کا محتاج نہیں اگر تمام ملک و قوم میری رائے کا مخالف ہو ، اور ایک انسان بھی ساتھ نہ دے ، جب بھی توفیق الٰہی کی نصرت بخشیوں سے میں اپنے تئیں ایک مسلح فوج اور ایک پوری قوم سمجھتا ہوں ۔

(۲) میرے مبلغ علم کی بابت سوال ، یہ آپ لوگوں کے مذہب میں "ذاتیات" کی بحث ہے اور جائز نہیں ۔ مگر میرا یہ مذہب نہیں اس لئے جواب دیتا ہوں ۔

آپ پوچھتے ہیں کہ مشرق و مغرب کے کن دار العلوموں میں میں نے ادنیٰ یا اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے ۔

گذارش ہے کہ الحمد للہ کسی میں نہیں البتہ ربُّ المغربین والمشرقین کی درس گاہ سے فیض یاب ہوں ۔ جب سے اس درسگاہِ الٰہی کا دروازہ مجھ پر کھل گیا ہے ، تمام کاغذ کی سندیں

دینے والے انسانی دار العلوموں سے بے نیاز ہو گیا ہوں ؎

رہے کہ خضر داشت ز سر چشمہ دور بود
لب تشنگی ز راہ دگر بردہ ایم ما

فنِ تعلیم و تربیت کے مطالعہ کی بھی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ آپ حضرات نے اس فن کے علم و عمل کے جو نمونے پیش کر دیئے ہیں وہ مطالعہ کے لئے کافی ہیں — میرے پاس تو اسلامی تربیت کی ایک کتاب موجود ہے اور اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتا۔

(۳) آپ میری تحریرات میں جس "افراطِ ضلع جگتی و استعارات" کے شاکی ہیں۔ اس سے غالباً جابجا قرآن مجید کی آیات سے استشہاد اور اس کی تعلیمات مراد ہوں گی۔ ورنہ میرے مذاق تحریر کا تو یہ حال ہے کہ اگر چاہوں بھی تو ضلع جگتی پر قادر نہیں ہو سکتا۔

اور ہاں اگر آئندہ بھی آپ کو اسی طرح شانِ ترفع و نقاب آرائی میں آنا ہو تو اس کا خیال رہے کہ یہ جالی دار نقاب تو میری نظروں کو دھوکا دینے کے لئے کافی نہیں — یہ بھی کوئی نقاب میں نقاب ہے کہ کہیئے تو پیشانی کی چڑھی ہوئی شکنیں ایک ایک کر کے گن دوں — پھر کبھی آیئے تو حریر و کمخواب کا کوئی نقاب ڈال کر آیئے زیب و زینت میں بھی افزائش ہو جائے گی۔ اور پردہ بھی ڈھنکا رہ جائے گا۔